آنکھ مچولی
اس شمارے کے ساتھ سالانہ
منصوبہ بندی کا چارٹ
(Year Planner) اور اس سے
متعلقہ اسٹیکرز بطور تحفہ حاصل کیجئے
اطفال نمبر
جنوری ۱۹۹۱ء

...روزانہ صبح شام ٹھیک سے
برش کرنا ہے!
ORIGINAL MINT
Signal 2
with Fluoride Plus
• WHITENS TEETH • PREVENTS DECAY
Signal
ECONOMY 120 gms.
سگنل 2 دانتوں کی مکمّل حفاظت کے لیئے

بڑے کام کی چیز
یا جیب میں رکھیں
کلپ کریں
برش کریں
انوکھا
ہیئر برش
بالکل فری
FLUORIDE
Sparkle
FREE
FREE
Hair Brush
Sparkle
شاباش اسپارکل
اسپارکل ٹوئن اور اسپارکل کلوو کے لارج اور فیملی پیک میں

LASER DOT

سب دوستوں کے لئے
ایک دوستانہ مشورہ
پیارے دوستو!
آپ کی طرح مجھے بھی سوئیٹس، ٹافیز اور ببل بے حد پسند ہیں، لیکن میں خریدتے وقت بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں اور صرف مے فیئر خریدتی ہوں۔
کیونکہ یہ بہترین اجزا سے صحت کے اصولوں پر تیار ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ مزیدار ہیں۔
آپ سب دوستوں کے لئے 'میرا دوستانہ مشورہ'
ہمیشہ مے فیئر کی سوئیٹس اور ٹافیز کھائیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔
■ مے فیئر سوئیٹس اور ٹافیز ■ مے فیئر ببل ■ مے فیئر مِلکا چیو
■ مے فیئر فروٹا چیو (اورنج اور اسٹرابیری)
Fruta Chew
Fruta Chew
Milka Chew
mayfair
Bubble
Bubble

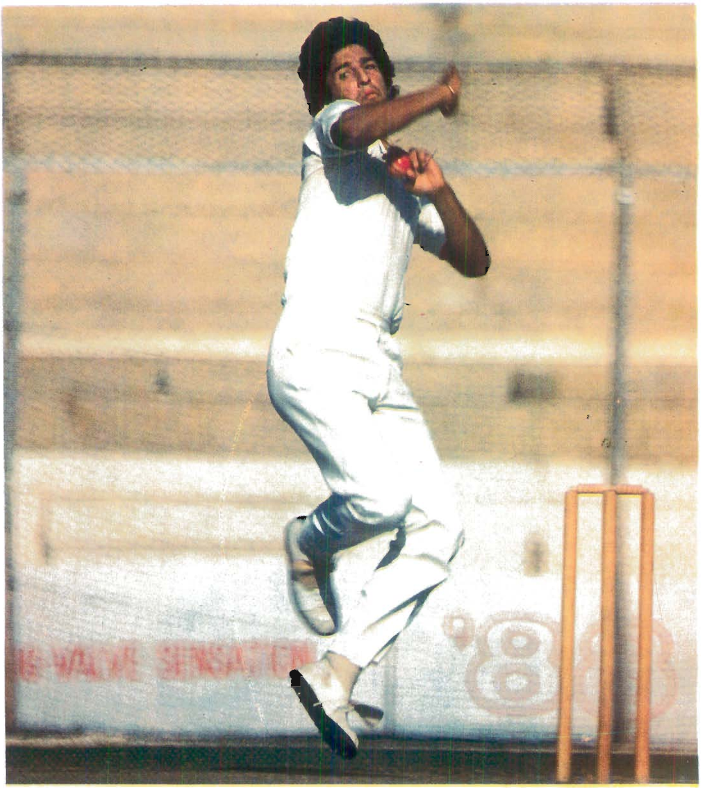

مہارت کی بلندی ۔ پی آئی اے کی جستجو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔
ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں۔ جہاں
وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہو رہے ہوں۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ ۔ لاجواب پرواز

Don't let the pain of cavities change her sunny smile to tears. Teach her, now, about fluoride.

Colgate MFP Flouride.
Your child's unbeatable protection against germs and cavities

Imagine the chalk is your tooth which is dipped in Colgate's first fluoride

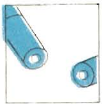

The first fluoride penetrates the tooth enamel to make teeth strong

A piece, covered with 1st fluoride, is dipped in Colgate's 2nd fluoride

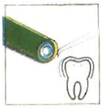

The 2nd fluoride gives extra protection inside and outside

Unbeatable fluoride protection.

The World's Largest Selling Toothpaste

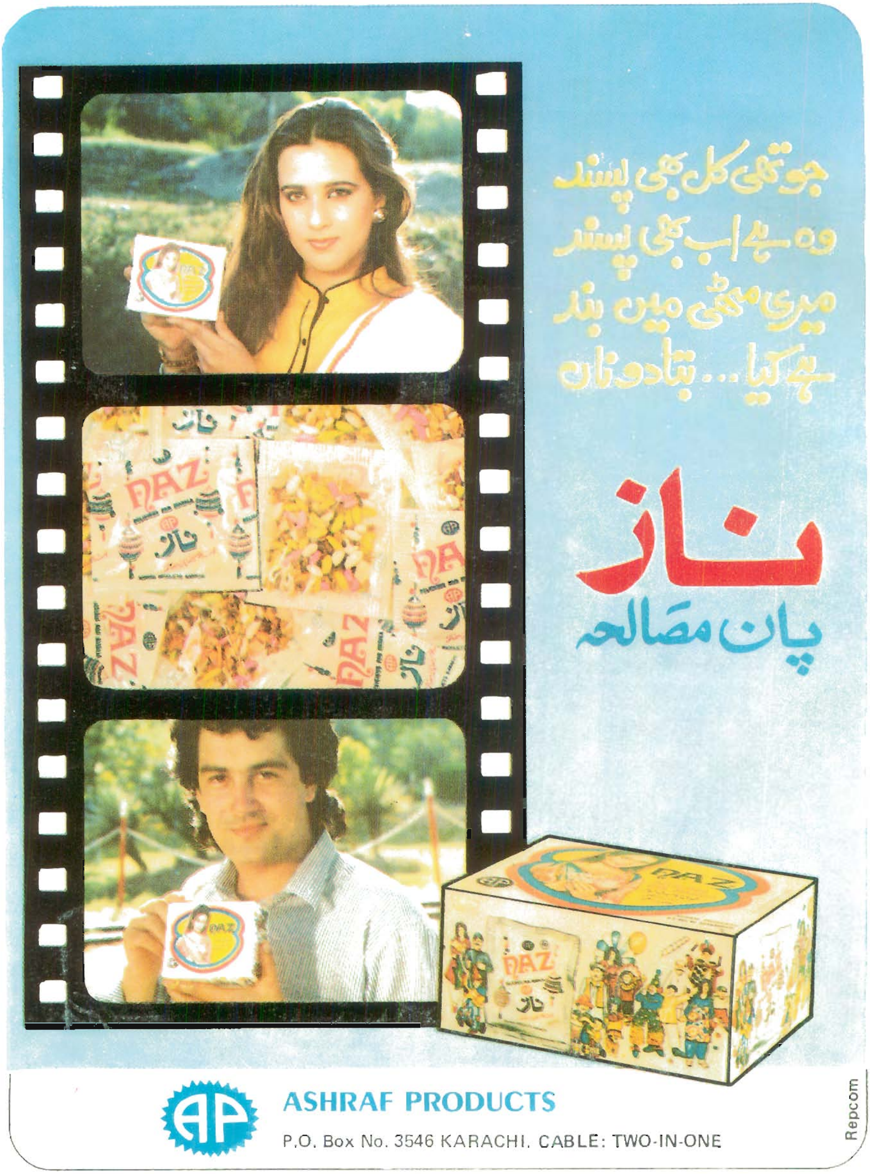

جو تھی کل بھی پسند
وہ ہے اب بھی پسند
میری مٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو ناز
ناز
پان مصالحہ
NAZ
ASHRAF PRODUCTS
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE
Repcom

LASERDOT

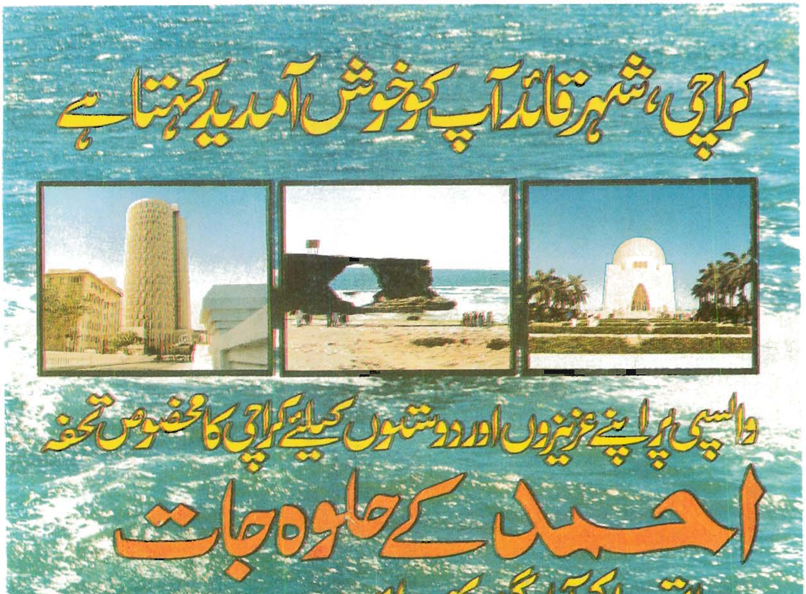

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیے
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
سوہن حلوہ
MANGONICA
MASS

Goldfish
Deluxe Pencil
حقیر
سی
لکیر
حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی
گولڈفِش ڈیلکس پینسل
SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 293451
جہاں چلے، رواں چلے

احمد

خالص دیسی گھی سے تیار کردہ

فریش ویل سویٹس

آپ کے اعلیٰ ذوق کی بھرپور تسکین کیلئے

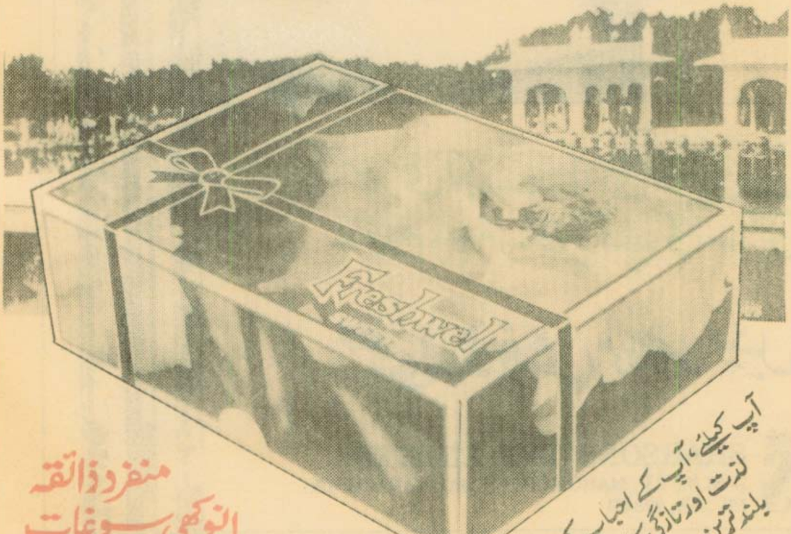

آپ کیلئے، آپ کے احباب کیلئے
لذت اور تازگی کا
بلند ترین معیار

منفرد ذائقہ
انوکھی سوغات
احمد کے حلوہ جات

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت ◎ رُکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی ◎ رُکن آل پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کرنے والا پاکستانی بچوں کا واحد ماہنامہ

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول
تجمل حسین چشتی

مشاورت
مشفق خواجہ   امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی
طاہر مسعود   محمد سلیم مغل

مجلس مشاورت
شاہ نواز فاروقی   ساجد سعید   منیر احمد راشد

اشتہارات
محمد عرفان

سرکولیشن
ریاض احمد

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا

ناشر: ظفر محمود شیخ • طابع: زاہد علی • مطبع: الاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ، کراچی
خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی - گرین گائیڈ اکیڈمی - ۱۱۲-ڈی، نورسس ڈومائٹ، کراچی

قیمت
۱۸ روپے   ۱۲ درہم   ۱۲ ریال

حسن ترتیب

۱۲۔ ڈیئر ایڈیٹر	منتخب خطوں کے جواب
۱۶۔ حضورؐ کا بچپن	سید خورشید عالم
۲۰۔ پہلی غلطی	اخگر انوار اعوان
۲۷۔ بچے اور ان کے حقوق	یونیسف
۳۴۔ غریب طالب علم	شیخ عبدالحمید عابد
۳۶۔ بچے اور بزنس	صباحت شکیل
۳۸۔ اکو	منیر احمد راشد
۴۷۔ موت سے ملاقات	سین سعید
۵۰۔ بہادر بیٹا (نظم)	شاہدہ صدف
۵۲۔ یہ میرے گاؤں کے بچے	نفیس احمد خان
۵۴۔ برف باری اور بچے	حارث شمیم
۵۷۔ ہمیں نظر انداز نہ کیجئے۔	طاہر مسعود
۶۸۔ حضورؐ کی بچوں سے محبت	انتخاب
۷۶۔ یہ بچہ کس کا بچہ ہے (نظم)	سعدیہ چوہدری
۷۸۔ کرنیں	حمید کاشمیری
۸۶۔ یہ دنیا ان کی بھی ہے	شام یوسفی
۹۰۔ نو عمر سائنس دان	محمد صالح ارشاد
۹۲۔ سات دن کی حکومت	شاہنواز فاروقی
۱۰۱۔ ڈنڈا ڈولی	منتخب لطائف
۱۰۵۔ بچوں کے کارنامے	محمد عمران قادر
۱۰۸۔ غلام بچہ	ادارہ
۱۱۰۔ ہدایت	محمد بن ملک
۱۱۴۔ بونگا	منیر احمد راشد
۱۲۰۔ اداس بچی	سلیم مغل
۱۲۸۔ نیم حکیم	محمد پرویز ارائیں
۱۳۷۔ بچوں کی عالمی تنظیم	امتیاز جلیل
۱۳۹۔ خوش نصیب شہزادہ	حارث بن صغیر

۱۴۴۔ مقابلہ	ادارہ
۱۴۶۔ جواں ہمت	فاروق عادل
۱۵۲۔ بچوں کی ہوگئی حکومت (نظم)	شاہنواز فاروقی
۱۵۴۔ ہم لڑکپن کیسے گزاریں	م الف راشد
۱۶۱۔ مستقبل ان بچوں کا	ظفر اللہ ضیاء
۱۶۵۔ بچے مستقبل کی امید	عافیہ سلام
۱۶۷۔ یہ چیزیں بچوں نے ایجاد کیں	سلمیٰ سلیم
۱۶۹۔ تاریک مستقبل کے بے آسرا بچے	محمد صالح ارشاد
۱۷۳۔ عظیم لوگوں کا بچپن	بشریٰ اشفاق
۱۷۷۔ مونیکا سیلس	سید کاشان جعفری
۱۸۳۔ بچوں کا گیت (نظم)	روحی کنجاہی
۱۸۵۔ ذہین بچوں کی حاضر جوابیاں	ابو عثمان شیخوپوری
۱۹۱۔ بچوں کا پہلا رسالہ	طاہر مسعود
۱۹۵۔ عجیب و غریب بچے	شیخ عاکف حمید
۲۰۱۔ مستقبل کی تلاش میں	محمد بشیر جمعہ
۲۰۹۔ ننھا لارڈ میئر	غلام عباس طاہر
۲۱۱۔ نتیجہ	کلیم چغتائی
۲۱۹۔ باکمال بچے	ساجد سعید
۲۲۷۔ قرض	عبد الودود شاہ
۲۳۲۔ تاریخ ساز بچے	شین فاروقی
۲۳۵۔ کھیلوں کے کم سن ہیرو	ضیاء الرحمٰن ضیاء
۲۴۰۔ بچوں کے سوداگر	سلیمان احمد
۲۴۳۔ بچے جنہوں نے کتابیں لکھیں	شین فاروقی
۲۴۶۔ بچوں کا زندہ ادب	جاوید اقبال امیری
۲۵۱۔ کم سن قلمکار	قارئین
۲۶۱۔ روشن مثال	تعارف
۲۶۳۔ کوپن کا صفحہ	ادارہ
۲۶۶۔ امی ابو کا صفحہ	خالد اسماعیل

روشن مستقبل کا تحفہ

اتنا تو آپ بھی جانتے ہیں
کامیابی کا نسخہ وقت کا مفید استعمال ہے۔
لیکن سوال یہ ہے کہ وقت کو مفید طریقے سے کیسے استعمال کیا جائے۔
اس بار آنکھ مچولی نے اپنے ساتھیوں کو ایک ایسا نادر تحفہ دینے کا فیصلہ کیا ہے جس میں اس سوال کا جواب موجود ہے یہ YEAR PLANNER ہے۔

اسے آپ اپنے کمرے میں دیوار پر کسی ایسی جگہ آویزاں کر دیجئے جہاں آپ کی نگاہ مسلسل پڑتی رہے۔ اور پھر اس پر اپنی آئندہ کی مصروفیات درج کر دیجئے تاکہ آپ کی یاد داشت آپ کو کبھی دھوکا نہ دے سکے۔

اسی چارٹ کے ساتھ آپ کو کچھ اسٹیکرز بھی دیئے جا رہے ہیں جنہیں آپ مقررہ تاریخوں پر چپکا کر آئندہ شرمندگی اور افسوس سے بچ سکتے ہیں۔

یاد رکھئے :۔ آپ وقت کو ضائع نہیں کرتے
وقت آپ کو ضائع کرتا رہتا ہے۔

پہلی بات

"اطفال نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے

ہمارا یہ خصوصی شمارہ بچوں کی صحافت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہم نہایت اعتماد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "آنکھ مچولی" اب صرف ایک رسالہ نہیں رہا۔ بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک تحریک بنتا جارہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں۔ اور دوسرے رسالے یہ سب کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ بات اتنی سی ہے کہ یہ رسالہ ہم نے کاروبار کرنے یا منافع کمانے کے لئے نہیں نکالا ہے۔ یہ رسالہ دل کے درد سے مجبور ہو کر جاری کیا گیا ہے۔ وہ درد جو ہمیں اس ملک کے بچوں سے ہے۔ ان کے مستقبل سے ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کے لئے عالمی سال منایا جاتا ہے۔ بچوں کے حوالے سے اعلیٰ ہوٹلوں میں سیمینار کئے جاتے ہیں، جن پر لاکھوں روپے برباد کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان مذاکروں سے بچوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ بلکہ بچوں کے نام پر یہ فائدے بھی بڑے اٹھاتے ہیں۔ بچوں کے عالمی ادارے سالہا سال سے بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کر رہے ہیں۔ لیکن آج بھی دنیا بھر میں لاکھوں اور کروڑوں بچے بھوک اور بیماری سے مر جاتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ بچے انتہائی غربت، ناداری اور بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ گھر ہو یا اسکول، مسجد ہو یا محلّہ ہر جگہ بچوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہوتی ہے۔ بچوں سے بھیک منگوائی جاتی ہے، ان سے مشقت کا کام لیا جاتا ہے، انھیں سزائیں دی جاتی ہیں۔ انھیں گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ انھیں اغوا کر لیا جاتا ہے ...... ان کے کھیلنے کے لئے میدان نہیں ہیں۔ پارکیں نہیں ہیں۔ والدین کے پاس ان کے لئے وقت نہیں ہے۔ انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مسجدوں میں بھی انھیں پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ جو ادارے اور تنظیمیں ان بچوں کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں وہ بلند و بانگ دعووں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز تو کرتے ہیں۔ پھر نہ جانے کہاں گم ہو جاتے ہیں۔ آنکھ مچولی کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ اس کے وسائل بھی محدود ہیں۔ لیکن اعلیٰ مقاصد وسائل سے نہیں عزائم سے حاصل کئے جاتے

ہیں۔

اور آنکھ مچولی کے عزائم بلند ہیں۔

"اطفال نمبر" انہی عزائم کی ایک جھلک ہے۔ اس نمبر میں ہر تحریر بچّوں سے متعلق ہے۔ اور یوں یہ روایت بھی آنکھ مچولی ہی نے ڈالی ہے کہ بچوں کا رسالہ ہوتے ہوئے اسی نے بچوں پر نمبر شائع کیا ہے۔ اور صرف یہی نہیں اسی اطفال نمبر کے حوالے سے ادارہ آنکھ مچولی نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بچوں کی پریس کانفرنس منعقد کرائی جس میں اسکولوں کے دس منتخب بچوں نے ملک بھر کے بچوں کے مسائل پر حکومت اور معاشرے کی توجہ دلائی اور قومی اخبارات نے اس پریس کانفرنس کو اپنے صفحات میں نمایاں جگہ دی۔ بچوں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کے ذہن کی نشوونما کے لئے اس "اطفال نمبر" کے ذریعے اس کے علاوہ جو کچھ کیا جاسکتا تھا اس کی تفصیل آپ اندر کے صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے۔ اور آپ کے تعاون کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ ایک مضبوط بچہ، ایک کمزور بچے سے، ایک خوشحال بچّہ ایک غریب بچّے سے، ایک صحت مند بچہ، ایک معذور بچے سے تعاون کرے۔ کیونکہ بچے خواہ کہیں کے ہوں ان کی ایک ہی برادری اور ایک ہی قبیلہ ہے۔ اور وہ سب بچے ہیں۔ اور انھیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے۔ انھیں اپنی مدد آپ کے اصول پر جینے کا ڈھنگ سیکھنا چاہئے۔

یہی آنکھ مچولی کا پیغام ہے
یہی اطفال نمبر نکالنے کا مقصد ہے۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

سلام

پیش خدمت آپ ؐ کے ہے نونہالوں کا سلام
ہو قبول اے شاہ بطحا خرد سالوں کا سلام

کاش اڑ کر پہنچ جائے گلشن طیبہ کی سمت
ہم بیابانِ محبت کے غزالوں کا سلام

عرشیو پہنچاؤ آقائے مدینہ کے حضور
ہجر ختم المرسلیں میں رونے والوں کا سلام

میرے آقا تک پہنچتے ہوں گے ہے دل کو یقیں
اپنے پیاروں کی درودیں اور جیالوں کا سلام

با کمالوں کا ادب اپنی جگہ ہے اے سلیم
عشق سے بھرپور ہے ہم بے کمالوں کا سلام

محمد سلیم

ڈیئر ایڈیٹر

درخت لگائیے، دنیا بچائیے

آپ کی سگریٹ چھڑاؤ تحریک نہایت کامیابی سے چل رہی ہے۔ میں آپ کے رسالے کے توسط سے ایک اور مہم شروع کرانا چاہتا ہوں۔ جس کی آج کل بہت ضرورت ہے۔ وہ ہے "درخت لگائیے، دنیا بچائیے" آج کل دنیا میں جس تیزی سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ درخت لگائے جائیں۔ کیونکہ ہم جنگلات کاٹ کر دنیا کو تباہی کے راستے پر گامزن کر چکے ہیں۔ میں اپنے ساتھیوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے گھر اور محلے میں زیادہ سے زیادہ درخت لگائیں اور اپنے اسکول میں بھی ہیڈ مسٹریس یا ہیڈ ماسٹر کی اجازت سے اسکول میں بھی مہم شروع کریں اور دنیا کو تباہ ہونے سے بچائیں۔

(اطہر رضا اجنبی...... لیاقت آباد کراچی)

محمد اسماعیل، میانوالی..... شاید آپ نے میری تحریریں شائع نہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے لیکن ہم بھی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اگر آپ نے اس مرتبہ بھی میری تحریروں کو سپرد

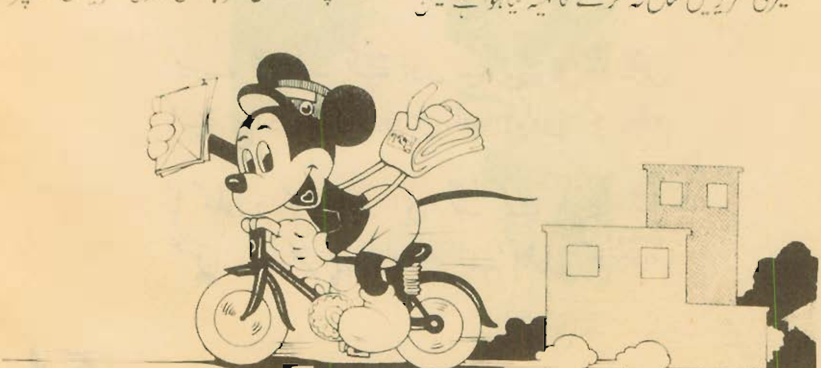

خاک کر دیا تو آئندہ میں..... چلئے خیر۔

○ ..... پہلی بات تو یہ ہے کہ تحریروں کو سپرد خاک نہیں کیا جاتا۔ ردی کی ٹوکری میں ڈالا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر آپ کا ارادہ ایسا ہی مضبوط ہے تو وہ دن دور نہیں جب آپ کی تحریر چھپ جائے گی۔

حافظ جبران احمد، اسکندر آباد..... انکل! مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ اگر آپ میری حوصلہ افزائی کریں تو میں کوئی کہانی ارسال کروں۔

○ ..... بھئی کہانی پڑھنے سے پہلے حوصلہ افزائی کیسے کی جاتی ہے۔ بہتر تو یہ ہو گا کہ آپ اچھی کہانی بھیج کر ہماری حوصلہ افزائی کریں۔

عرفان علی نقوی، ٹھٹھہ..... میں دوسرے رسالوں میں لکھتا رہا ہوں۔ آپ کو دو نظمیں بھیج رہا ہوں امید ہے اسے شائع کریں گے۔

○ ..... عرفان صاحب آپ کی نظمیں معنی کے لحاظ سے تو اچھی ہیں لیکن ان میں وزن نہیں ہے کسی شاعر سے اصلاح لیجئے۔ تبھی آپ شاعر بن سکیں گے۔

فاروق احمد انصاری، منگھوپیر، کراچی..... آنکھ مچولی پہلی مرتبہ اچھا لگا۔ آپکے تمام سلسلے دوسرے رسالوں سے مختلف ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے میں نے آتے ہی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ یہ پل اس وقت گر جائیں گے جب تنقید کی سواری اس پل پر سے گزرے گی۔

○ ..... میرے بھائی! اتنی کمزور پل آپ بناتے ہی کیوں ہیں۔ ویسے ہم تنقیدوں کا برا نہیں مانتے۔ ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

میر حسن، سرگودھا..... آپ نے اب تک اپنے کسی شمارے میں قائداعظم محمد علی جناح کی کوئی تصویر شائع نہیں کی۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس دفعہ سالنامے میں سرورق ہمارے قائد کا ہونا چاہیئے۔

○ ..... بھئی آپ کو اتنی بڑی غلط فہمی کیسے ہو گئی۔ قائداعظمؒ کی تصویریں رسالے میں کئی بار چھپ چکی ہیں ہاں سرورق پر چھاپنے کی فرمائش ضرور پوری ہو گی۔

شیخ محمد شاہد، لاہور..... پچھلے دنوں ہماری ٹیم نے ایک آدمی کو گرفتار کرا دیا تھا جس کے قبضے سے ناجائز اسلحہ بر آمد ہوا تھا۔ وہ ہمارے محلّہ کا آدمی تھا۔ لیکن ہمیں اس وقت بڑی مایوسی ہوئی جب وہ آدمی اگلے ہی دن واپس آ گیا پتا چلا کہ اس کے خلاف پرچہ تک نہیں کٹا۔ میرے ساتھی اتنے مایوس ہو گئے کہ ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ کہتے ہیں اس جدوجہد کا کیا فائدہ جب محافظ ہی بک جائیں۔

○ ..... میرے عزیز! آپ کی ٹیم اتنے بڑے کام

کرنے کی نہیں ہے۔ آپ ایسے نیک کام کریں جس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو۔ سب سے پہلے آپ لوگوں کو اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہئے۔ اور پھر دوسروں کی مدد، محلے کی صفائی، ستھرائی، گھر کے کام کاج وغیرہ۔ انہی باتوں سے آپ لوگوں کو عزت ملے گی اور کوئی مایوسی نہ ہوگی۔

محمد علی، چاہ مورت والا...... رسالے کی لکھائی باریک کر دیں اس سے کم صفحے میں زیادہ مواد سمائے گا۔ اس کے علاوہ رسالے میں پیغام کے نام سے ایک سلسلہ شروع کریں جس میں ایک ساتھی دوسرے ساتھی کو رسالے کے ذریعے پیغام دے سکے۔

○ ...... رسالے کی لکھائی باریک کرنا ساتھیوں کی آنکھوں کی بینائی کے لئے مفید نہیں رہے گا۔ دوسری تجویز دلچسپ ضرور ہے۔ بشرطیکہ پوسٹ آفس والوں کو اعتراض نہ ہو۔

سید یوسف نصراللہ، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی...... میرا خیال ہے کہ آنکھ مچولی کا معیار اب زوال پذیر ہونے لگا ہے اس میں وہ شوخی، مزاح اور تازگی باقی نہیں رہی۔ خدشہ یہ ہے کہ کہیں یہ عام سا پرچہ نہ بن کر رہ جائے۔

○ ...... آپ کی تنقید سر آنکھوں پر، مگر میرے بھائی آپ نے آنکھ مچولی کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے کوئی ٹھوس تجویزیں نہیں دیں۔ جو تجویزیں دیں ویسی چیزیں تو رسالے میں پہلے ہی چھپ رہی ہیں۔ ویسے بقول آپ کے "زوال پذیر" ہونے کے باوجود آنکھ مچولی آج بھی دوسرے پرچوں سے بہت بہتر نہیں ہے؟

اکبر علی ذیشان، کریم آباد، کراچی...... "بلا عنوان" کے عنوان سے کہانیوں کا سلسلہ شروع کریں اور بہترین عنوان تجویز کرنے والے تین ساتھیوں کو انعامات دیں، کوئز سوالات کا سلسلہ شروع کریں۔ مقابلۂ مصوری یا مضمون نگاری میں سے کوئی مقابلہ شروع کریں۔

○ ...... پہلی تجویز پر ایک آدھ مرتبہ عمل ہو سکتا ہے۔ کوئز سوالات کسی نہ کسی انداز میں پہلے ہی ہوتے ہیں۔ مصوری اور مضمون نگاری کے مقابلے بھی ہوتے رہتے ہیں۔

فرح گوہر فاطمہ، سیدہ فاطمہ، لطیف حسن (؟)...... انکل! بڑوں کے تو الیکشن ہوگئے۔ مگر آپ نے ہمارے الیکشن نہیں کرائے کیا آپ بھی اور رسالوں کی طرح ہم بچوں کو بھول گئے۔

○ ...... بھئی آپ لوگوں کے الیکشن پچھلے ہی برس تو ہوئے تھے جس میں ڈوڈو کامیاب ہوئے تھے۔ الیکشن تو پانچ سال کے لئے ہوتے ہیں۔ ڈوڈو نے

آپ لوگوں کے مسائل کے لئے جدوجہد شروع کردی ہے۔ ان کی کامیابی کی دعا کیجئے۔

کم از کم خط شائع کر دیجئے تاکہ اطمینان ہو جائے۔

محمد یونس حسین، ناظم آباد، کراچی...... میں ہر ماہ آپ کو کوئی نہ کوئی تحریر بھیجتا ہوں لیکن آپ اسے شائع ہی نہیں کرتے۔

○ ...... لیجئے آپ کی فرمائش پوری ہوگئی۔ کوئی ایسی تحریر بھیجئے جسے ہم شائع کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

ناقابل اشاعت تحریر، قابل اشاعت خط

میرا نام ناقابل اشاعت تحریر ہے۔ ارے ارے، بھئی حیران پریشان نہ ہوئیے میرا نام واقعی یہ ہے۔ کیا کریں جناب؟ جب اتنی ساری خامیاں ہوں گی تو قابل اشاعت نام کیسے ہو گا؟ اب دیکھئے نا۔ پہلی خامی تو مجھ میں یہ ہے کہ میں ایڈیٹر صاحب کی رشتہ دار نہیں ہوں دوسری یہ کہ میں صفحے کے ایک طرف نہیں لکھی گئی ہوں۔ تیسری میں بے ربط تھی۔ چوتھی خامی صاف ستھری تحریر نہیں تھی یعنی کیڑے مکوڑے بنے ہوئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ تحریر میں نہ سر تھا نہ پیر (بھئی اب تحریروں کے بھی سر پیر ہونے لگے) ارے نہیں یہ تو محاورہ ہے اور لکھنے میں تجربہ بھی تو ہونا چاہئے بقول ایڈیٹر صاحب ہمت نہ ہاریئے یہ تحریر شائع نہ ہوئی تو دوسری سہی۔ اب انہیں (ایڈیٹر کو) کیا معلوم کہ اتنی محنت سے لکھی گئی تحریر کو وہ اتنے مزے سے کہہ دیتے ہیں قابل اشاعت نہیں ہے۔ اب آپ ہی بتائیے۔ جب تحریر اتنی خامیوں سے پر ہوگی تو شائع کیسے ہوگی۔

ارے یہ کیا؟ میں تو قابل اشاعت ہوگئی بوجھئے کیسے؟ چلئے ہم بتاتے ہیں مندرجہ بالا خامیوں کو الٹ دیا گیا ہے یعنی خامیوں کو خوبیوں میں بدل دیا اس لئے اب میرا نام قابل اشاعت تحریر ہے آپ بھی ان خوبیوں کو اپنائیے آزمائش شرط ہے۔

نجمہ فخر

جھڈو تھرپارکر سندھ

پیارے نبی ﷺ کا بچپن

سید خورشید عالم

بچپن کا دور تو ہر شخص گزارتا ہے مگر بڑے لوگوں کا بچپن بھی ان کے بڑے پن کی علامت ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص کے بچپن میں چند باتیں بھی مشترک ہوتی ہیں۔ یعنی معصومیت، بے فکری، شوخی اور شرارت اور کھیل کود۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص بچوں سے بہت پیار کرتا ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ بچے عام طور پر کھیل ہی کھیل میں ایک دوسرے سے لڑ جاتے ہیں۔ شور شرابا بھی کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ضد پر اتر آتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں تو ایک الگ دنیا نظر آتی ہے جس میں عام بچوں کی ضد ہے نہ شرارت۔ نہ حضورؐ سے کوئی ان کے شور شرابے کی شکایت کرتا ہے اور نہ ہی وہ کسی بڑے کی نافرمانی

کرتے ہیں۔ اگر ہم حضورؐ کی سیرت میں بچپن کے دور کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ آپؐ عام بچوں سے بہت مختلف تھے۔ آپؐ اپنے دوسرے ہم عمروں کی نسبت زیادہ ذہین اور معاملہ فہم تھے۔

۴ برس کی عمر میں حضورؐ اپنے رضاعی بھائی عبداللہ اور رضاعی بہن شیما کے ساتھ اکثر بکریاں چرانے جایا کرتے تھے۔ یہ واقعہ بھی ان ہی دنوں میں پیش آیا تھا جب حضورؐ نے کسی بات پر اپنی رضاعی بہن شیما کی پشت پر کاٹ لیا تھا سیرت ابن ہشام میں لکھا ہے کہ

"آپ (شیما) غزوہ حنین میں گرفتار ہو کر آئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں آپ کی رضاعی بہن شیما بنت حلیمہ سعدیہ ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نشانی پوچھی تو عرض کیا کہ آپؐ نے بچپن میں کھیلتے ہوئے میری پشت پر کاٹ لیا تھا۔ اس کا نشان اب تک موجود ہے۔ یہ سن کر حضورؐ پر رقت طاری ہوگئی۔ اپنی چادر بچھا کر اس پر شیما کو بٹھایا اور فرمایا۔ "چاہو تو میرے پاس رہو۔ لیکن شیما نے واپس اپنی قوم کے پاس جانا چاہا۔ حضورؐ نے بہت سا انعام و اکرام دے کر ان کو رخصت کیا۔"

جب حضورؐ اپنی والدۂ ماجدہ حضرت آمنہ کے ساتھ مدینہ گئے تو وہاں اپنے والد کے مکان میں ٹھہرے۔ اس کو دارالنابغہ کہا جاتا ہے۔ اسی مکان میں حضورؐ کے والد کی قبر تھی۔ یہاں حضورؐ ایک ماہ رہے۔ علاقے کے تمام بچے حضورؐ کے ساتھ کھیلنا پسند کرتے تھے کیوں کہ آپؐ کسی سے بھی لڑتے جھگڑتے نہیں تھے۔ آپؐ کی عمر تقریباً چھ برس کی تھی وہیں ایک ماہ کے قیام کے دوران آپؐ بنو نجار کی ایک ہم عمر لڑکی انیسہ کے ساتھ بھی کھیلا کرتے تھے۔ گھر کے سامنے ایک قلعہ تھا جس پر ایک سفید پرندہ آکر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ تمام بچے اسے پتھر مار مار کر پھر اڑنے پر مجبور کر دیتے۔ آپؐ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

چھ برس کی عمر کیا ہوتی ہے۔ اس عمر میں تو بہت کم بچے تیراکی جانتے ہیں۔ مگر اس عمر میں حضورؐ نے بنو نجار کی ایک باؤلی میں تیرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ آپؐ تیراکی سے خوب لطف اٹھاتے تھے۔ آج کے دور میں تو طرح طرح کے کھلونے ہیں جن سے دل بہلایا اور وقت گزارا جا سکتا ہے مگر اس زمانے میں آج کی طرح کھلونے نہیں ہوتے تھے۔ حضورؐ کبھی سنگریزے جمع کر کے اس کا مینار بنا لیتے۔ کبھی میدان میں دوڑتے۔ اور کبھی درختوں اور خصوصاً کھجور کے بلند پیڑوں کو دیکھتے۔ غرض یہ کہ حضورؐ جتنا عرصہ وہاں رہے انہوں نے وہاں کے پرسکون ماحول کا پوری طرح مشاہدہ کیا۔ یہاں سے واپسی میں ابواء کے مقام پر حضرت آمنہ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کا سایہ تو پہلے ہی اٹھ چکا تھا اب ماں کا سہارا بھی ختم ہو گیا۔ حضورؐ اب

اپنے دادا جناب عبدالمطلب کے سایۂ عاطفت میں آ گئے۔

اپنے تمام بیٹوں میں عبدالمطلب کو عبداللہ سب سے زیادہ پیارے بیٹے تھے۔ چنانچہ ان کے بیٹے یعنی اپنے پوتے سے ان کا پیار اور محبت بہت زیادہ ہونا ایک فطری سی بات تھی۔ دادا اپنے پوتے پر بہت زیادہ شفقت فرماتے تھے۔ حضرت عبدالمطلب بہت وجیہہ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ جب وہ خانہ کعبہ کے زیر سایہ اپنی سرداری کی گدی پر بیٹھتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے اور پیار سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے رہتے۔ حالانکہ عبدالمطلب کی گدی پر کسی اور کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ حتیٰ کہ ان کے اپنے بیٹے بھی باپ کے رعب سے ان سے دور بیٹھتے تھے۔ حضورؐ بھی عام طور پر اپنے دادا کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے۔ اور دادا کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ خشک سالی کے موقع پر انہوں نے اپنے اس بے انتہا پیارے پوتے کی خوبیوں کا واسطہ دے کر اللہ سے بارش کے لئے گڑگڑا کر التجا کی تھی۔

آپؐ اپنے دادا کے ساتھ صرف دو برس ہی گزار پائے تھے کہ ایک روز شفیق دادا بھی انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کا حضورؐ کو بہت دکھ ہوا۔ اور آپؐ ان کے جنازے کے ساتھ روتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ اس کے بعد آپؐ اپنے چچا ابو طالب کے ہاں چلے آئے۔ حضورؐ کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی مگر آپ بڑے ہی صابر و شاکر تھے ابھی چچا کے گھر آئے تین چار ہی دن ہوئے تھے کہ ایک روز چچی نے دیکھا کہ تمام بچے کھانے میں مصروف ہیں۔ لیکن عبداللہ کا یتیم لاڈلا خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا ہوا ہے چچی نے پوچھا "بیٹا تم کھانے میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔؟" حضورؐ نے جواب دیا میں اس طرح کی چھینا جھپٹی میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔"

بات یہ تھی کہ ابو طالب کے گھر میں بچوں کے لئے کھانا ایک جگہ رکھ دیا جاتا۔ اور بچے اس پر جھپٹ پڑتے اور جو مل جاتا کھا لیتے۔ سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب چچی نے دوبارہ سوال کیا۔ "بیٹا تم کتنے دنوں سے ایسا کر رہے ہو۔؟" تب حضورؐ نے فرمایا "جب سے اس گھر میں آیا ہوں" چچی بڑی حیران ہوئیں اور پوچھا "بیٹا آخر پیٹ کس طرح بھرتے رہے ہو۔؟" آپؐ نے جواب دیا "چچی جان میں آب زم زم سے پیٹ بھرتا رہا ہوں۔" چنانچہ چچی نے یہ طریقہ اپنایا کہ آپؐ کا کھانا بالکل الگ رکھتیں تاکہ آپؐ کو تکلیف نہ ہونے پائے۔

غرض یہ کہ اگر تمام مسلمان بچے حضور اکرمؐ کے بچپن کو اپنے سامنے آئیڈیل بنالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سب ہی ان سے پیار نہ کریں۔ اور وہ سب کی آنکھ کا تارا نہ بن جائیں۔

کم عمری میں کام بڑے

1 ناتھن برگ چھیالیس دنوں سے زیادہ تک ہر روز مچھلیاں پکڑ کر اپنا ہی قائم کردہ ریکارڈ توڑنے کی کوشش میں ہے۔

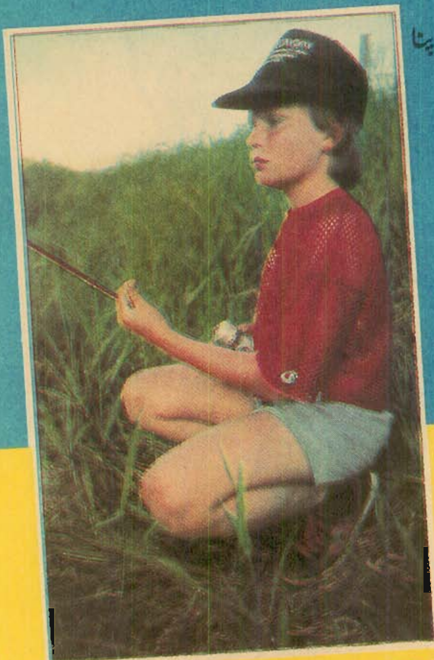

3 فرانس کے گیارہ سالہ ونسنٹ کو خطرناک مچھلیوں والے سمندر میں تنہا کشتی چلانے کا شوق ہے۔ اس کی جرأت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ تنہا انگلش چینل کراس کر چکا ہے۔ اس سفر میں اُسے پانچ گھنٹے لگے۔ اس میدان میں وہ کئی اور کمالات دکھانے کا خواہشمند ہے۔

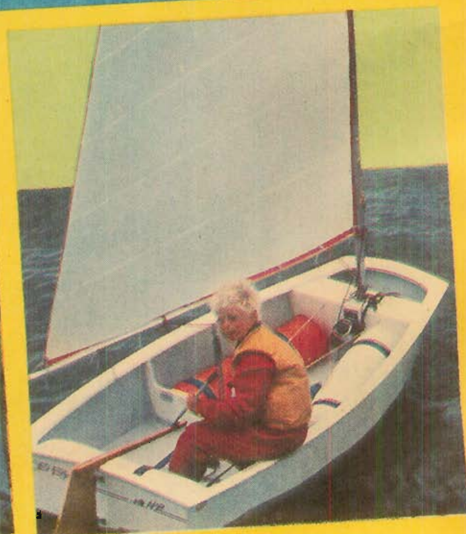

2 گیارہ سالہ جیسکا نے جھاڑیوں پر عمدہ تحقیق کر کے اپنی تحقیق کے نتائج کو ایک بروشر کی صورت میں شائع کیا ہے۔ وہ اس کام میں تیسری کلاس سے مصروف ہے۔

پہلی غلطی

اخگر انوار اعوان

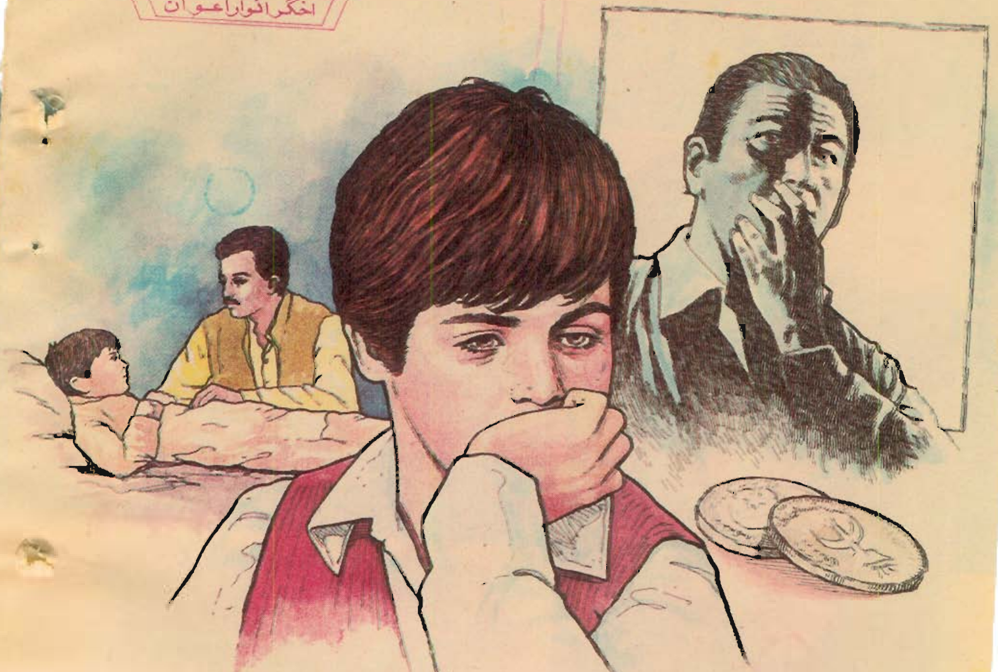

بچے بھی کیا بے نیاز مخلوق ہوتے ہیں۔ بھلا رومی جیسے باصلاحیت، حساس، پیارے اور فرمانبردار بچے کو کیا ہو جاتا ہے کہ بقول اپنی بہنوں کے "وہ ایک دم، جانور، بن جاتا ہے جس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت اسے کنٹرول نہیں کر سکتی۔"

"رومی! ادھر...... ادھر آؤ بیٹا...... فوراً، ...... امی کی آواز نہیں سن رہے ہو؟۔ رومی!" لیکن مجال ہے اس نے کوئی نوٹس لیا ہو۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ اسے امی کی آواز سنائی ہی نہ دی ہو۔ امی کو پکار کے جواب میں ایک ننھی سی مگر بلند ہنسی سنائی دی اور رومی یہ جا وہ جا۔ چھپتے چھپاتے لان میں پہنچے، اس کی لمبی لمبی گھاس میں سے بھاگے، لکڑی کے اسٹول کو دھکا دیکر ایک طرف گرایا، باورچی خانے کے باغیچے کی طرف پہنچے اور وہاں سے چکما دیکر اپنے آپ کو بچاتے ہوئے باغ میں جا پہنچے جہاں درختوں پر جنگلیوں کی طرح اوپر نیچے چھلانگیں لگانے لگے۔ رومی کی یہ شرارتیں روزانہ کا معمول تھیں۔ اس وقت بھی رومی کی والدہ اپنی سہیلی بیگم

ارمان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی سینا پرونا کر رہی تھیں۔ عین اسوقت رومی نے ڈبل روٹی کی پلیٹ کو ذرا زور سے اپنی طرف کھینچا تو وہ اس کی جھولی میں آ رہی۔ قبل اس کے کہ نوکرانی اس کو قابو کرتی پلیٹ نیچے گر کر چکنا چور ہو گئی۔ یہ منظر دیکھ کر بہنیں سہم گئیں اور لگیں چیخنے "امی ادھر آیئے۔ دیکھئے اس نے کیا کیا ہے؟"

"رومی نے بڑی ڈش توڑ دی ہے۔"

"آیئے اور اسے روکیئے۔"

یہ چیخ و پکار سن کر امی تیزی سے وہاں پہنچی تھیں... لیکن انہیں دیر ہو چکی تھی۔ رومی کرسی سے اُچھلا اور کھڑکی سے پھلانگ کر برآمدے میں بھاگ گیا۔ اس کا تعاقب کرنا تو ان کے بس میں نہ تھا۔

"ٹھیک ہے رومی!" وہ چلائیں۔ "مجھے تمہارے لئے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔" لیکن رومی سنی ان سنی کر کے درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔

○ ○ ○

"معاف کیجئے گا بیگم ارمان۔ میں اپنے بچے کے ہاتھوں تنگ ہوں۔" امی نے واپس ڈرائنگ روم میں آ کر معذرت کی۔ "کوئی بات نہیں" بیگم ارمان نے نرم لہجے میں تسلی دی۔ "ایسی چھوٹی چیزیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی ہو گی جسے سنجیدگی سے لیا جائے۔"

"سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اس رومی کے بچے کا کوئی علاج نہیں سوجھتا۔ اس کا مزاج اس طرح کا ہو گیا ہے کہ دنیا کی کسی بھی چیز کا ذرہ بھر اس پر اثر نہیں ہوتا۔" بیگم سرفراز نے سارے واقعہ کی وضاحت کی۔

"میرے بچے شرارت کرتے ہیں تو میں ان کی پٹائی کر دیتی ہوں۔" بیگم ارمان نے کپڑوں کو ٹانکے لگاتے ہوئے کہا۔ بیگم سرفراز نے ایک لمحے کے لئے سوئی میں دھاگہ ڈالنے کا کام روک دیا اور تھوڑی دیر کے بعد بولیں "ہم نے کبھی بچوں کی پٹائی نہیں کی...... اور رومی .... رومی تو ہمارا ایک ہی لڑکا ہے ایسے تو ...."

"یہیں تو ہم غلطی کرتے ہیں۔" بیگم ارمان نے لمبی سانس لی اور بولنا شروع کیا۔ "کہ ہم اولاد کو چھوٹی عمر میں کنٹرول نہیں کرتے۔ یہ بچوں کے لئے بھی نقصان دہ ہے اب آپ ہی دیکھیں۔ رومی کا

اس طرح شرارت کر کے فرار ہونا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے سزا کی ضرورت ہے۔

"اچھا! واقعی۔" بیگم سرفراز نے جو پہلے ہی بیگم ارمان سے بڑی متاثر تھیں، حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ...... اور مجھے اپنی بات کا پورا یقین ہے۔" بیگم ارمان نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "میری عزیز سہیلی! یقین کرو کہ والد کی طرف سے کبھی کبھار بچوں کی پٹائی تمہیں مستقبل میں ان گنت مشکلات سے بچا سکتی ہے۔"

"اچھا! ...... آج جونہی سرفراز صاحب گھر آتے ہیں میں ان سے اس پر بات کرتی ہوں۔" بیگم سرفراز بیگم ارمان کی "دلیل" سے پوری طرح قائل ہو چکی تھیں۔

...... ○ ......

باغ کا گیٹ بند ہونے سے پہلے بچے اوپر سونے کے کمروں میں جا چکے تھے۔ لیکن بیگم سرفراز ابھی تک بیگم ارمان کی تجویز پر غور کر رہی تھیں۔ وہ اپنے نئے "منصوبے" پر عمل کرنے کے سلسلے میں کافی بےتاب تھیں اور شوہر کے آنے کا شدت سے انتظار کر رہی تھیں۔ سرفراز صاحب نے گھنٹی بجائی تو وہ دروازہ کھولنے خود گئیں۔ "سرفراز صاحب، شکر ہے آپ آگئے"۔ وہ تقریباً چیختے ہوئے انداز میں بولیں۔

"کیوں؟ ...... کیا ہو گیا؟" انہوں نے سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کرتے ہوئے پوچھا۔ آج دفتر میں بھی ان کا دن بڑا سخت گزرا تھا۔ راستے کی دھول اور تھکاوٹ کے آثار چہرے سے نمایاں تھے۔ "کیا مصیبت آن پڑی ہے؟"

"اندر آئیں ...... ڈرائنگ روم میں چلیں تو بتاتی ہوں۔" بیگم تیزی میں بول رہی تھیں "میں آپ کو بتا نہیں سکتی رومی کتنا گستاخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آپ کو تو پتہ بھی نہیں ہو گا۔ آپ تو سارا دن دفتر میں بڑے مزے سے گزارتے ہیں لیکن میں یہاں رومی کے ہاتھوں کتنی پریشان ہوتی ہوں یہ میں ہی جانتی ہوں۔ آپ کو پتا ہے اس عمر کے بچے کو کیسا رویہ اپنانا چاہئے۔ وہ خوفناک حد تک بے قابو ہو چکا ہے۔ میرے لئے اس پر کنٹرول ناممکن ہے۔ اور نہ ہی کسی اور کے لئے ایسا کرنا آسان ہے۔ میں نے ہر طریقہ آزما دیکھا لیکن کوئی تدبیر اس پر کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ اب ایک ہی علاج باقی رہ گیا ہے۔" بیگم نے ہانپتی ہوئی آواز میں اپنی بات مکمل کی "کہ آپ اسکی پٹائی کریں"

"لاحول ولاقوۃ۔ کیا دفتر سے گھر اسی مسئلے کا سامنا کرنے کے لئے آیا ہوں۔" سرفراز صاحب

بڑبڑائے۔ "خیر مجھے یہ تو بتاؤ آخر کیوں اسکی پٹائی کر دوں؟...... اس سے پہلے تو ہم نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔ "

"وہ اس لئے کہ آپ کو معلوم ہے اب یہی ایک واحد طریقہ رہ گیا ہے...... بچہ اب میری گرفت میں نہیں ہے............ " الفاظ بیگم سرفراز کا ساتھ نہیں دے دے رہے تھے "ظاہر ہے ہم اس کے لئے کوئی آیا نہیں رکھ سکتے اور نوکرانی پر پہلے ہی کام کا بوجھ بہت ہے۔ یقین کریں سرفراز صاحب رومی کا گستاخانہ رویہ الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ لیکن آپ ہیں کہ سمجھتے ہی نہیں۔ " بیگم سرفراز کا لہجہ تند سے تند ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ سرفراز صاحب سر پکڑ کر کچھ دیر کے لئے خاموش کرسی پر بیٹھ گئے۔

"اچھا تو کس چیز سے اسکی پٹائی کروں؟ " ...... کچھ دیر بعد انہوں نے دوبارہ دریافت کیا۔

"کس چیز سے؟ .... اپنے سلیپر سے بیگم سرفراز نے جواب دیا اور انکے جوتوں کے تسمے کھولنے کے لئے گھٹنوں کے بل جھک گئیں۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ " انہوں نے بیگم کو تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔ "لاؤ مجھے میرا سلیپر دو " سلیپر لے کر وہ اوپر گئے۔ ایک انجانی الجھن تھی جس میں وہ گرفتار تھے۔ آخر انہوں نے رومی کی پٹائی کا ارادہ کر ہی لیا۔ اف خدایا۔ انکی غصہ سے سرخ آنکھوں پر ابھی تک راستے کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ پاؤں من من کے ہو رہے تھے اسی حالت میں دروازے کو دھکا دے کر رومی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ رومی کمرے کے درمیان میں کھڑا تھا اور اس نے سلیپنگ سوٹ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

"ہاں رومی! .... تمہیں معلوم ہے میں اس وقت یہاں کیوں آیا ہوں؟۔ "

رومی نے کوئی جواب نہ دیا

"جواب کیوں نہیں دے رہے؟...... بولو"

"کمر پر سے قمیص اٹھاؤ"

رومی نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ چہرہ خوف کے مارے گہرا گلابی ہو رہا تھا۔

"میں ابو؟"

"ہاں ہاں تم۔ جلدی کرو۔ ادھر آؤ۔ " اور اپنا سلیپر تھام کر رومی کی ننگی پیٹھ پر دو تین سلیپر جڑ دیئے "ایک، دو، تین .... اب تم سیکھ جاؤ گے کہ امی کے ساتھ کیسے پیش آنا چاہئے۔ "

رومی سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"اب جلدی سے اپنے بستر پر جاؤ" ابو نے حکم دیا

ابھی بھی رومی اپنی جگہ سے نہ ہلا بلکہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا "ابو مجھے ابھی دانت صاف کرنا ہیں۔ "

"ہونہہ...... پھر کیا ہوا۔ چلو جلدی کرو" سرفراز کی آواز پھر گونجی۔

اس نے صرف نظر اٹھا کر والد کی طرف دیکھا تھا۔ اگرچہ ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں اس نے نہ تو کوئی آواز نکالی تھی اور نہ آنسو بہایا تھا۔ سب کچھ خاموشی سے برداشت کیا تھا سوائے ایک جملہ کہنے کے کہ "ابو مجھے ابھی دانت صاف کرنا ہیں۔" ہاں یہ جملہ ادا کرتے وقت آواز بھرائی ہوئی تھی۔ لیکن سرفراز صاحب نے جان بوجھ کر اس کے چہرے پر نظر نہ ڈالی۔ بلکہ فوراً واپس مڑے اور بے خیالی میں دروازے کے باہر سے چٹخنی لگا کر سیڑھیاں اترتے ہوئے باغیچے میں نکل گئے۔

○

"اف خدایا! یہ میں نے کیا کیا" وہ باغ میں چلتے ہوئے آڑو کے درخت کے سائے تلے آ گئے تاکہ انکے چہرے کے تاثرات گھر والوں کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ "رومی کی پٹائی! ...... اس معصوم کی سلیپر سے پٹائی! ...... اور کس لئے؟ اس بے چارے کو تو اتنا بھی پتا نہیں کس لئے۔ میرا لعل چیخا بھی نہیں، چلایا بھی نہیں۔ آنسو بھی کوئی نہیں بہایا۔ ایک لفظ ہی تھا جو اس نے اونچی آواز سے بولا اور وہ تھا "ابو! .... الٰہی میں بھی کس قدر سنگدل اور ظالم ہوں۔ مجھے معاف کر دینا، اے اللہ مجھے معاف کر دینا۔" سرفراز صاحب خود ہی بڑبڑاتے چلے گئے۔ چند ماہ پہلے کا واقعہ انہیں یاد آ رہا تھا جب رومی ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا کھیلتا گر گیا تھا اور اسکا گھٹنا ٹوٹ گیا تھا۔ "وہ دلیر اس وقت بھی رویا نہیں، چیخا نہیں۔ واقعی وہ ننھا بہادر ہے۔ آج میں نے غیر ضروری طور پر اس کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے" ۔ اور بہت سے واقعات اور چیزیں ان کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ بے چینی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا

"اب تو کسی نہ کسی طریقے سے بچے کی دلجوئی کرنا ہوگی۔" یہ سوچ کر وہ سیڑھیاں چڑھے اور رومی کے کمرے میں آ گئے۔ وہ پہلو کے بل بستر پر لیٹا تھا۔ نائٹ لیمپ کی روشنی میں اس کی کھلی ہوئی آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اب بھی وہ رونے کی بجائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سرفراز صاحب دبے پاؤں اس کے بستر کے قریب آ کر اس پر جھک گئے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر چیخ چیخ کر رومی سے معافی مانگیں۔ لیکن ظاہر ہے کوئی بھی والد اپنے بچے کے سامنے ایسا نہیں کر

سکتا۔ لیکن دل پسیج چکا تھا۔ چہرے سے پریشانی کو مصنوعی انداز سے دور کرنے کی کوششیں کرتے ہوئے بچے سے مخاطب ہوئے "رومی بیٹے۔ ابھی تک سوئے نہیں؟"

"نہیں ابو جان۔" بچے نے مختصر جواب دے کر دوبارہ خاموشی اختیار کر لی۔ سرفراز صاحب بستر پر بیٹھ کر اس کے اوپر جھکے تو لمبی لمبی پلکوں کے پیچھے سے اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔

"میرے بچے...... کیا تم نے میرے مارنے کو محسوس کیا ہے؟" سرفراز صاحب نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"نہیں ابو جان"...... رومی کا جواب تھا۔

سرفراز صاحب نے ہاتھ بڑھا کر رومی کی ننھی سی اور گرم گرم ہتھیلی اپنے ہاتھ میں لے لی "جو ہوا سو ہوا۔ اب تمہیں اس کے متعلق زیادہ نہیں سوچنا چاہئے۔ میرے ننھے بہادر۔" اپنی کانپتی ہوئی آواز میں وہ بولتے چلے گئے۔ "دیکھو اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ اسے بھلا دو۔ آئندہ انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ ادھر دیکھو۔ سنو۔ بچے!۔ میری طرف دیکھو............"

"جی ابو"...... رومی ابو کی باتیں سن رہا تھا۔

"اب تم صرف ایک کام کرو۔ اٹھو اور بات چیت کو اور اپنے ابو کو مسکرا کر دکھاؤ" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے سرفراز صاحب نے خلاف معمول معذرت خواہانہ مسکراہٹ سے رومی کو ہنسانے کی کوشش کی۔ "تاکہ یہ سب کچھ جو ابھی ہوا تھا بھلا دیا جائے...... ہے نا؟...... کیا خیال ہے تمہارا؟ رومی بیٹے!"

لیکن رومی پہلے کی طرح پڑا رہا یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی گھمبیر مسئلے پر غور و خوض کر رہا ہے۔ بالکل پروفیسروں کی طرح۔ اور اس کا یہ انداز سرفراز صاحب کو بے چین کر رہا تھا۔ وہ اٹھے اور کھڑکی کے پاس گئے۔ باہر باغ میں اندھیرا چھا چکا تھا لیکن آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ اور پتوں کی سرسراہٹ کمرے تک آ رہی تھی۔ جس وقت وہ یہ نظارہ کر رہے تھے ان کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاتھ باہر نکالا تو اس میں دو چمکدار نئی اٹھنیاں تھیں۔ اب وہ واپس رومی کے پاس پہنچے

"اور ہاں...... یہ لو بیٹے...... ان سے کوئی چیز خرید لینا۔" سرفراز صاحب نے اٹھنیاں آہستہ سے تکیے پر رکھتے ہوئے کہا۔

لیکن کیا یہ دو اٹھنیاں...... یا ان جیسی کئی اٹھنیاں...... مل کر بھی آج شام کے واقعے کو اسکے ننھے ذہن سے نکال سکتی تھیں۔

مثلّث در مثلّث

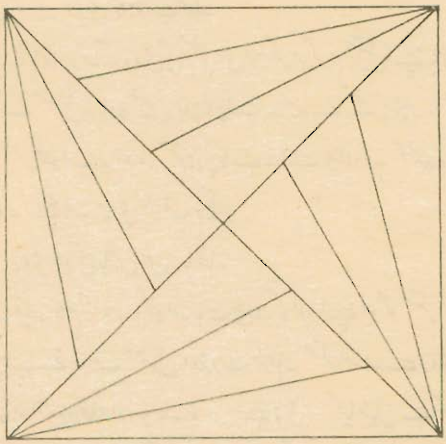

اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ اوپر کے خانے میں بارہ مثلّث ہیں تو آپ غلطی پر ہیں۔ غور کیجئے
اچھی طرح دیکھئے۔ مثلث بڑھتے چلے جائیں گے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کل کتنے مثلّث
ہیں؟

بچے اور ان کے حقوق

یونیسیف

بچوں کے حقوق کا معاہدہ ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے منظور کیا تھا۔ اب اس معاہدہ کی حکومت پاکستان نے بھی اس شرط کے ساتھ منظوری دے دی ہے کہ ان پر اسلامی قوانین اور اقدار کے مطابق ہی عمل کیا جائے گا۔ اس بین الاقوامی معاہدے کی چند خاص خاص باتیں یہ ہیں۔

۱۔ اٹھارہ سال سے کم عمر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو بچہ مانا جائے گا۔

۲۔ بچوں کے ساتھ ان کے یا ان کے والدین اور سرپرست کے رنگ، نسل، عقیدے، مذہب، زبان، ملک، قوم، قبیلے، پیدائش کی جگہ، سیاسی رائے، رتبے، جائیداد یا کسی معذوری کی وجہ سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ بچوں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت عدالتیں، رضاکار ادارے یا سرکاری کارکن بچے کے بہترین مفاد کو ہمیشہ سامنے رکھیں گے۔ اگر ماں باپ، سرپرست یا بچوں کی دیکھ بھال کا کوئی ادارہ بچے کی مناسب دیکھ بھال نہ کرپائے تو حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ بچے کی مناسب دیکھ

بھال کا انتظام کرے۔

۴۔ تمام ملک اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ معاہدے میں درج بچوں کے حقوق پر عملدر آمد کے لئے ضروری قانونی اور انتظامی کارروائی کریں۔

۵۔ ہر ملک بچوں کے ماں باپ، سرپرست اور خاندان کے اس حق، ذمہ داری اور فرض کا احترام کرے گا کہ بچے کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے اس کی مناسب تعلیم و تربیت اور رہنمائی کریں۔

۶۔ دنیا میں زندہ رہنا ہر بچے کا پیدائشی حق ہے پیدا ہونے والے ہر بچے کی جان بچائی جائے اور اس کی اچھے طریقے سے پرورش کی جائے۔

۷۔ پیدائش کے فوراً بعد بچے کا نام رکھا جائے گا۔ اسے شہریت دی جائے گی۔ اور اس کی پیدائش اور نام سرکاری ادارے کے پاس درج کرایا جائے گا۔ یہ جاننا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں ہر بچے کا حق ہے تاکہ وہ ان کی محبت حاصل کر سکے۔ حکومت اس بات کا خاص خیال رکھے گی کہ بچے عام حالات میں اپنے ماں باپ کی شفقت سے محروم نہ رہیں۔

۸۔ حکومت اس بات کی حفاظت کرے گی کہ نام، شہریت اور خاندان کے حوالے سے بچوں کی پہچان قائم رہے اور اگر کسی وجہ سے یہ پہچان ختم ہو جائے تو وہ اسے پھر سے جلد از جلد قائم کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔ کسی وجہ سے گم ہو جانے والے بچوں کو ان کے گھر والوں تک پہنچانا حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

۹۔ حکومت اس بات کا خیال رکھے گی کہ کوئی بچہ اپنے ماں باپ سے ان کی مرضی کے بغیر جدا نہ ہونے پائے۔ اگر کسی وجہ سے قانونی طور پر ایسی جدائی ضروری ہو جائے تو بچے کے بہترین مفاد کو سامنے رکھا جائے گا۔ ماں باپ میں علیحدگی کی صورت میں بچے کا یہ حق ہے کہ اسے دونوں سے ملنے دیا جائے چاہے اس کی رہائش ان میں سے کسی ایک کے پاس ہو۔ اگر ماں باپ بچے کے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں تو بچے کو ان سے الگ کیا جا سکے گا۔

۱۰۔ اگر بچہ اور اس کے ماں باپ دو الگ الگ

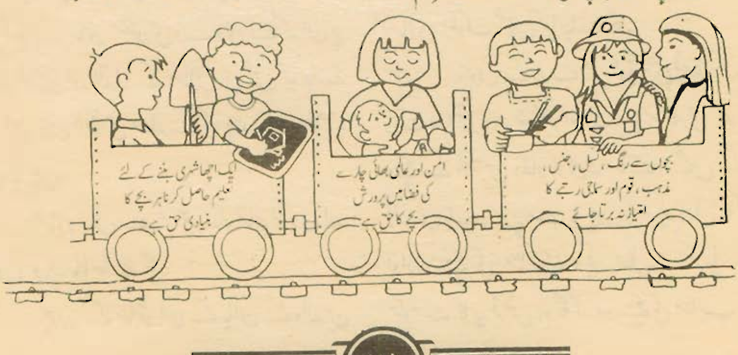

ملکوں میں رہ رہے ہوں تو ان کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کو ملنے کے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک میں آ جاسکیں۔ اور دونوں ملک انسانی بنیادوں پر خاندانوں کو اکٹھا ہونے کی درخواست کرنے والوں یا ان کے خاندان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

۱۱۔ ہر حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ بچوں کو اغوا کرنے یا ان کو زبردستی دوسرے ملکوں میں لے جانے یا رکھنے کی ہر کوشش کو روکے اور ناکام بنائے اور اغوا ہونے والے بچوں کو واپس لایا جائے اس بارے میں دوسرے ملکوں سے بھی ضروری معاہدے کئے جائیں یا موجودہ معاہدوں میں اس بات کا اضافہ کیا جائے۔

۱۲۔ ~~جب~~ بچہ اس قابل ہو جائے کہ وہ اپنی رائے قائم کر سکے تو حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ بچہ اپنے بارے میں اپنی رائے کا پوری آزادی سے اظہار کر سکے اور اس کی عمر کے لحاظ سے بچے کی رائے کو اہمیت بھی دی جائے۔

۱۳۔ ہر بچے کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہوگی۔ وہ اپنی پسند کے مطابق زبانی، لکھ کر یا تصویر کے ذریعے ہر قسم کی معلومات ملک کے اندر یا باہر سے حاصل کر سکے گا اور انہیں دوسروں تک پہنچا سکے گا۔ لیکن اس بارے میں ملک کے قانون، ملک کی سلامتی، عوام کے امن، دوسروں کے حقوق اور اخلاق کا خیال رکھا جائے گا۔

۱۴۔ ہر ملک کے بچوں کو سوچنے سمجھنے بات کہنے اور اس کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہوگی اور اسے ماں باپ کی رہنمائی اور ملک کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق ہو گا۔

۱۵۔ بچوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ دوسروں سے ملیں، کسی انجمن میں شامل ہو جائیں یا خود کوئی انجمن بنائیں اس سلسلے میں یہ خیال رکھنا ہو گا کہ دوسروں کے حق کی خلاف ورزی نہ ہو۔

۱۶۔ کسی بچے کی ذاتی زندگی، اس کے خاندان، گھر یا ذاتی خط و کتابت میں کسی طرح کی غیر قانونی مداخلت نہیں ہونے دی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت اور شہرت پر حملہ ہونے دیا جائے گا۔ ہر بچے کو اس بارے میں قانونی تحفظ حاصل کرنے کا حق ہو گا۔

۱۷۔ حکومت اس بات کا انتظام کرے گی کہ بچوں کو ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار اور رسالوں کے ذریعے دنیا بھر سے ایسی مفید معلومات حاصل ہوتی رہیں جن سے ان کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی تربیت ہو۔ انہیں اپنے ملک کے رسم و رواج اور رہنے سہن کے طریقوں کا علم ہو اور وہ دوسرے ملکوں کے بچوں کو بہتر طور پر جاننے لگیں۔ بچوں کو نقصان دہ معلومات، کتابوں فلموں اور پروگراموں سے بچانے کے لئے حکومت ضروری کارروائی کرے گی۔

۱۸۔ بچوں کی اچھی تربیت اور بہتر دیکھ بھال ماں اور باپ دونوں کی یا سرپرست کی بنیادی ذمہ

داری ہے۔ حکومت ہر طرح سے مدد کرے گی کہ ماں باپ یہ ذمہ داری پوری کر سکیں۔

۱۹۔ حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ بچوں کو ہر قسم کی لاپرواہی اور برے سلوک سے بچائے چاہے یہ غلط سلوک بچے کے ماں باپ، سرپرست یا ان کی دیکھ بھال کرنے والے کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت نہ صرف ایسے برے سلوک کے خاتمے کے لئے کارروائی کرے گی بلکہ برے سلوک کا شکار ہونے والے بچوں کی بحالی کے لئے بھی کام کرے گی۔

۲۰۔ ہر حکومت کا فرض ہو گا کہ وہ ایسے بچوں کی خاص طور پر حفاظت کرے جن کا کوئی گھر بار نہیں رہا۔ حکومت ان کے لئے گھر جیسا ماحول مہیا کرے گی یا ایسے ادارے قائم کرے گی جو ان بچوں کی مناسب دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ ادارے ان بچوں کے رہنے سہنے کے طریقے اور رسم و رواج کے مطابق بنائے جائیں۔

۲۱۔ ان ملکوں میں جہاں بچوں کو گود لینے کا رواج یا اجازت ہے ایسا اسی وقت کیا جا سکے گا جب یہ بات بچے کے بہترین فائدے میں ہو۔ اس بارے میں عدالت سے منظوری لینا ہوگی اور جس بچے کو گود لیا جا رہا ہے اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے ضروری حکم جاری کئے جائیں گے۔

۲۲۔ ہجرت کرنے والے مہاجر بچوں یا پناہ کی درخواست کرنے والے بچوں کی حفاظت کا خاص طور پر انتظام کیا جائے گا۔ حکومت کا فرض ہو گا کہ ایسے بچوں کی حفاظت اور مدد کرنے والے اداروں سے پورا تعاون کرے۔

۲۳۔ معذور بچوں کا یہ حق ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور خاص طریقوں سے دیکھ بھال کی جائے تاکہ وہ ہر طرح سے اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کے قابل ہو جائیں اور کسی پر بوجھ بننے کی بجائے معاشرے میں ایک بھرپور زندگی گزار سکیں۔

۲۴۔ ہر بچے کے اس حق کو تسلیم کیا جائے گا

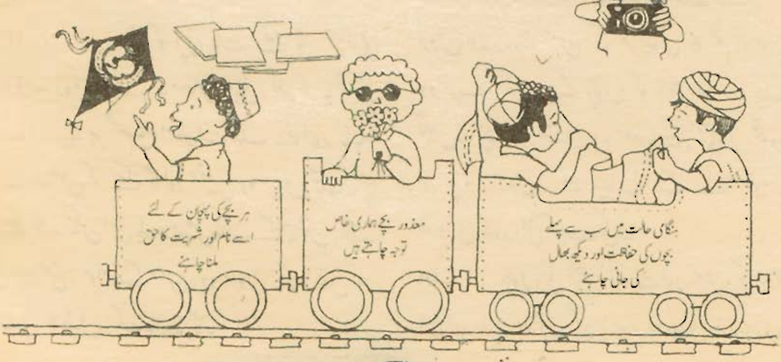

کہ پوری طرح تندرست اور توانا ہو اور اسے صحت اور طب کی ضروری سہولت حاصل ہو۔ اس بارے میں پرہیز اور ابتدائی طبی دیکھ بھال پر خاص طور پر زور دیا جائے گا انہیں صحت کی تعلیم دی جائے گی اور ننھے منے بچوں کی مرنے کی شرح کو کم کیا جائے گا۔ حکومت اس بات کا خیال رکھے گی کہ صحت کے بارے میں نقصان دہ پرانے طریقے ختم کئے جائیں اس بارے میں دنیا کے دوسرے ملکوں سے بھی تعاون حاصل کیا جائے گا۔

۲۵۔ بچوں کی حفاظت، دیکھ بھال اور علاج کے اداروں کی کارکردگی کا وقفے وقفے سے حکومت جائزہ لے گی تاکہ بچوں کو ملنے والی سہولتوں کا کم از کم معیار قائم رکھا جاسکے۔

۲۶۔ تمام ملک بچوں کے اس حق کو مانتے ہیں کہ ان کو ضروری سماجی حفاظت ملنی چاہئے جس میں بیمہ کی سہولت بھی شامل ہے۔ حکومت قومی قانون کے مطابق یہ سہولتیں مہیا کرنے کی پابند ہوگی۔

۲۷۔ ہر بچے کا یہ حق ہے اور اسے زندگی کے کم از کم معیار کے مطابق سہولتیں دینا بچے کے ماں باپ کی پہلی ذمہ داری ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ اس ذمہ داری کو پورا کروایا جائے اور اسے پورا کرنے میں ماں باپ کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔ ان سہولتوں میں روٹی کپڑے اور مکان کی سہولتیں بھی شامل ہیں۔

۲۸۔ تعلیم حاصل کرنا ہر بچے کا بنیادی حق ہے اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ پرائمری تک تعلیم کو لازمی اور مفت فراہم کیا جائے۔ اسکول کے نظم، ضبط کو قائم کرتے وقت بچے کی عزت نفس کا خیال رکھا جائے۔ بچے کے اس حق کو یقینی بنانے کے لئے دوسرے ملکوں کا تعاون اور مدد بھی حاصل کی جائے۔

۲۹۔ حکومت تعلیم کے نظام کو اس طرح بہتر بنائے گی کہ اس سے بچے کی صلاحیت اور شخصیت کو نکھارا اور اسے ایک اچھا شہری بننے کے قابل بنایا جاسکے اور اس میں انسانی حقوق اپنی قومی روایات اور رسم و رواج کا احترام کرنا سکھایا جائے۔

۳۰۔ ملک کی اقلیتی آبادی کے بچوں اور بعض علاقوں میں وہاں پرانے زمانے سے رہنے والے لوگوں کے بچوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنی زبان، مذہب اور رہن سہن کے طریقوں کے مطابق پوری آزادی سے اپنی زندگی گزار سکیں حکومت ان کے اس حق کی حفاظت کرے گی۔

۳۱۔ بچوں کا یہ حق ہے کہ انہیں تفریح اور کھیل کا موقع ملنا چاہئے اسی طرح انہیں اپنے ملک کے رسم و رواج کے مطابق تصویریں بنانے، موسیقی، گیت، ڈرامے، شاعری اور علم و ادب کے دوسرے کاموں میں بھی حصہ لینے کا حق چاہئے۔

۳۲۔ حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ بچوں کو ایسے کاموں سے بچائے جن سے ان کی صحت، تعلیم یا ذہنی و جسمانی ترقی میں رکاوٹ پڑ سکتی ہو

حکومت روزگار کے لئے کام کرنے کی کم از کم عمر مقرر کرے گی اور ملازمت کی شرائط طے کرے گی۔

۳۳۔ بچوں کا یہ حق ہے کہ انہیں نشے والی دواؤں سے محفوظ رکھا جائے اور ایسی خطرناک دواؤں کی تیاری یا تقسیم میں بچوں کو کسی طرح بھی استعمال نہ کیا جائے۔ حکومت اس بارے میں ضروری قانون بنائے گی اور ان پر عمل بھی کرائے گی اس کے علاوہ لوگوں کو اس بات کی تعلیم بھی دی جائے گی کہ بچوں کو ان خطرناک دواؤں سے دور رکھا جائے۔

۳۴۔ بچوں کو ہر قسم کی بد سلوکی، زیادتی اور بے حرمتی سے بچایا جائے گا اور ہر قسم کے مکروہ کاروبار سے بھی دور رکھا جائے گا۔

۳۵۔ حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اپنے ملک کے علاوہ دنیا بھر میں دوسروں سے مل کر ایسا انتظام کرے کہ بچوں کو زبردستی اغوا کرنے، انہیں دوسرے ملکوں میں پہنچا دینے . . . اور ان کی خرید و فروخت جیسے مکروہ کاروبار کو ختم کیا جا سکے اور آئندہ بچوں کے اغواء کو روکا جا سکے۔

۳۶۔ بچوں کا یہ بھی حق ہے کہ انہیں ہر قسم کی ایسی لوٹ کھسوٹ سے بچایا جائے جو ان کی ترقی میں رکاوٹ بنے۔

۳۷۔ بچوں کو ہر قسم کے تشدد، ظالمانہ سلوک اور سخت سزاؤں سے جن میں موت اور عمر قید کی سزا شامل ہے محفوظ رکھا جائے گا۔

۳۸۔ ہر حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ جنگ میں بچوں کے بارے میں انسانی رواداری کے اصول

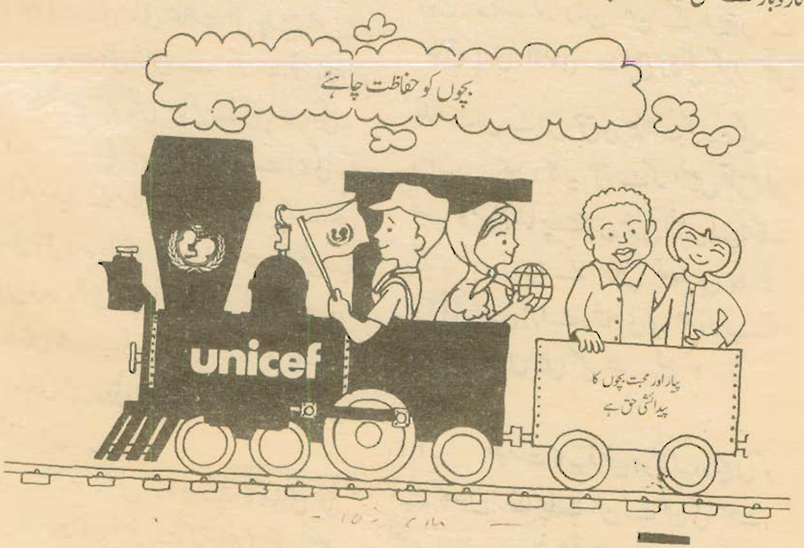

کا احترام کرے گی۔ پندرہ سال سے کم عمر کے کسی بچے کو براہ راست جنگ یا لڑائی میں شامل نہیں کیا جائے گا اور نہ فوج میں بھرتی کیا جائے گا۔ جنگ سے بے گھر ہونے والے تمام بچوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کی جائے گی۔

۳۹۔ حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ جنگ، تشدد ظالمانہ سلوک، لاپرواہی یا لوٹ کھسوٹ کا شکار ہونے والے بچوں کا مناسب علاج اور دیکھ بھال کرے اور ان کی اپنے ماحول میں دوبارہ بحالی کے لئے ضروری کاروائی کرے۔

۴۰۔ جن بچوں پر کوئی الزام ہو یا انہوں نے کوئی جرم کیا ہو انہیں یہ حق حاصل ہو گا کہ ان کے انسانی حقوق کا احترام کیا جائے اور ان سے قانون کے مطابق سلوک کیا جائے انہیں قانونی امداد دی جائے تاکہ وہ اپنی صفائی پیش کر سکیں۔

۴۱۔ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اگر کسی ملک کے قانون یا عالمی قانون میں بچوں کے حقوق کا معیار موجودہ معاہدے سے بہتر ہے تو اس بہتر معیار کو قائم رکھا جائے گا۔

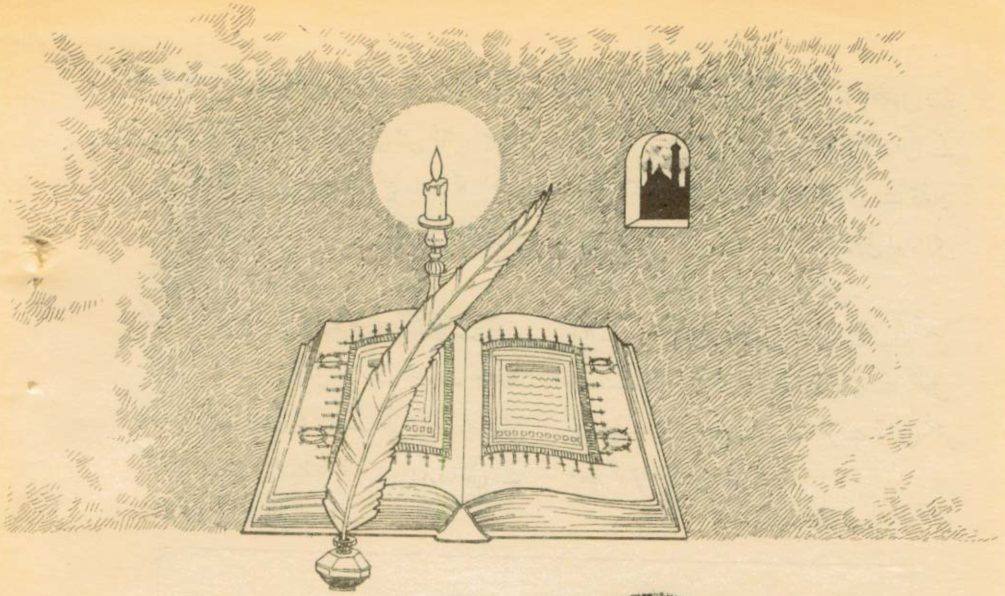

غریب طالب علم

شیخ عبدالمجید عابد

جس نے دنیا کو تعلیم دی
جس کے پاس قلم نہ تھا اور

کئی سو سال گذرے۔ مسجد نبویؐ کے صحن میں ایک بزرگ استاد اپنے شاگردوں کو حدیث کی تعلیم دے رہے تھے۔ کہ ایک غریب سا لڑکا مسجد میں داخل ہوا۔ لباس بالکل معمولی اس کے پاس نہ کوئی تختی نہ قلم دوات۔ وہ بھی چپ چاپ ان لڑکوں کے پاس بیٹھ گیا جو حدیث کا سبق پڑھ رہے تھے۔ سب طالب علموں کے پاس قلم دوات اور کاپیاں تھیں۔ استاد صاحب جو کچھ پڑھاتے وہ ساتھ ساتھ لکھتے جاتے تھے۔

غریب لڑکا کچھ دیر خاموشی سے استاد صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ پھر مسجد کے فرش سے تنکا اٹھا کر اس سے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر اس طرح لکھنے لگا جیسے تختی پر لکھ رہا ہو۔
کبھی کبھی وہ اس تنکے کا سرا اپنے منہ میں لے کر اسے تھوک سے بھگو لیتا تھا۔ یوں جیسے قلم کو روشنائی سے بھگو رہا ہو۔

جب تمام بچوں کی چھٹی ہوئی۔ تو استاد صاحب نے غریب لڑکے کو بلایا۔ اور کہا "بیٹا تم بار بار تنکا منہ میں ڈالتے تھے اور اسے تھوک میں بھگو کر لکھتے تھے۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"

لڑکے نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"جناب!"

"اللہ نہ کرے میں حدیث کی توہین نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ آپ جو پڑھا رہے تھے اسے لکھ رہا تھا۔"

استاد نے کہا۔ "تھوک تو خشک ہو جاتا ہے۔"

"جناب! میں ایسا اس لئے کر رہا تھا کہ مجھے وہ پورا سبق یاد ہو جائے جو جناب پڑھا رہے تھے اور اللہ کے فضل سے مجھے وہ ساری باتیں یاد ہو گئی ہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو سناؤں؟"

استاد نے فرمایا "ہاں سناؤ۔"

اس غریب لڑکے نے وہ ساری حدیثیں بالکل ٹھیک سنا دیں۔ جو استاد صاحب نے پڑھائی تھیں۔

استاد نے اسے سینے سے لگا لیا اور دعا دی اللہ تمہیں بہت بڑا عالم بنائے۔ استاد کی دعا سچ ثابت ہوئی اور وہی غریب طالب علم امام شافعیؒ کہلائے اور ایسی عزت اور شہرت پائی جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

AFC-2/90

یہ بتلانے کی خاطر ہم وطن سے پیار کرتے ہیں
یہ بچّے اک نہ اک عمدہ سا کاروبار کرتے ہیں

صباحت شکیل

جن بچوں کو ابتداء سے صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے وہ بہت کم عمر میں اپنی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں استعمال کر کے کارنامے انجام دینے لگتے ہیں۔ اس صفحے پر ہم ایسے ہی بچّوں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ان بچوں نے اپنی صلاحیتوں کو مختلف اقسام کے کاروبار میں لگا کر شاندار نتائج حاصل کئے ہیں۔

چودہ سالہ جمی نے جس کا تعلق امریکی ریاست ٹیکساس سے ہے خرگوشوں اور شہد کی مکھیوں کو پال رکھا ہے۔ اس وقت اس کے پاس سو خرگوش اور شہد کی مکھیوں کے تین بہت بڑے چھتے ہیں۔ جمی خرگوشوں کو اچھے داموں فروخت کرتا ہے، اس کے کئی خرگوش، خرگوشوں کے خوبصورتی کے ملک گیر مقابلے میں بہت سے انعامات جیت چکے ہیں۔ شہد کی فروخت سے جمی ہر سال ساڑھے چھ ہزار روپے سے زیادہ کمالیتا ہے۔ اس کے پڑوسی اس کے شہد کے سب سے بڑے خریدار ہیں۔

برابر کے صفحے پر آپ کو یہ جو مسخری بچی نظر آرہی ہے اس کا نام کیکی ہے۔ یہ مسخری ہے، اداکارہ ہے، اور ننھی سی جادوگر بھی ہے۔ کیکی ٹی وی کے اشتہارات میں بھی کام کرتی ہے۔ کیکی نے جادو گری کی پہلی "ٹرک" اپنے والدین سے سیکھی تھی۔ کیکی جادو گری کے ایک شو کے تقریباً تین ہزار روپے وصول کرتی ہے۔ اپنی حرکتوں پر لوگوں کو مسکراتا دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔

شکاگو کے بارہ سالہ آرٹسٹ ایری ڈیوس کو کپڑوں پر رنگوں سے کام بنانے کا شوق ہے۔ یہی اس کا کاروبار بھی ہے۔ ایری کو ایک شرٹ پر کام بنانے میں چھ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ اس کی بنائی ہوئی شرٹ تقریباً ۹۰۰ روپے میں فروخت ہوتی ہے۔ ایری شرٹ کے علاوہ پینٹوں، جوتوں اور موزوں پر بھی کام بناتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ بچے کس طرح اپنی صلاحیتوں کے مثبت استعمال کے زریعہ چھوٹے چھوٹے کارو بار چلارہے ہیں۔ یہی بڑے ہو کر بڑے بڑے کارو بار چلائیں گے۔ اور یوں اپنے ملک کی خوشحالی کا سبب بنیں گے۔ وطن سے اپنی محبت کے اظہار کا یہ سب سے عمدہ طریقہ ہے، کیوں جناب؟

بچے بزنس میں
بچے دل کا چین

مختلف امریکی ریاستوں کے بچے جنھوں نے کم عمری میں تجارت کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اچھے خاصے تاجر بن گئے۔ ان تمام تاجر بچوں کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ انھوں نے کبھی بھی تجارت کی خاطر تعلیم کو ترک نہیں کیا۔

کام کے وقت کام اور پڑھائی کے وقت پڑھائی۔ یہی اچھے بچوں کا شیوہ ہے

منیر احمد راشد

اکّو

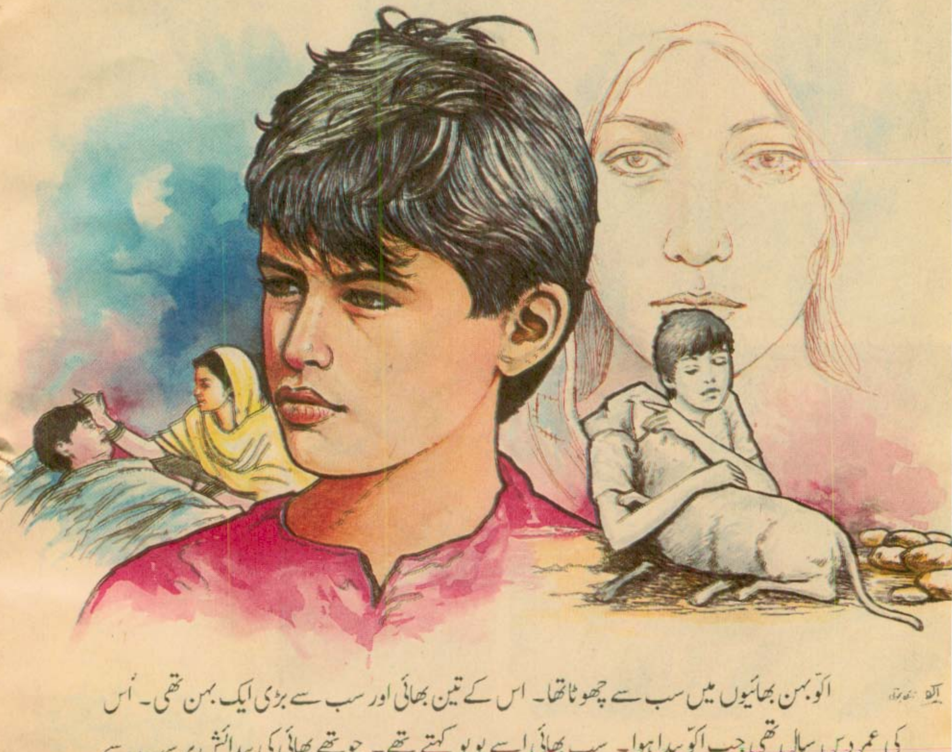

اکّو بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے تین بھائی اور سب سے بڑی ایک بہن تھی۔ اُس کی عمر دس سال تھی جب اکّو پیدا ہوا۔ سب بھائی اسے بوبو کہتے تھے۔ چوتھے بھائی کی پیدائش پر سب سے زیادہ خوشی اُسی کو ہوئی تھی۔ وہ اکثر گول مٹول اکّو کو کمر پر لادے رہتی۔ گڑیوں کا کھیل ہو، یا گھر کا کام کاج، اکّو اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ جب سودا سلف لینے محلے کی واحد پرچون کی دکان پر جاتی تب بھی اکّو کو اٹھائے ہوتی۔ بہن بھائی کی اس محبت سے ماں کو بھی اچھا خاصا وقت مل جاتا اور وہ محلے والوں کے گھروں میں جھاڑو برتن کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی۔

اکّو کا باپ چونے اور رنگ و روغن کا کام کرتا تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں تو لوگ بس عید کے عید یا پھر کبھی شادی بیاہ کے موقع پر ہی گھر میں سفیدی کرنے کے قائل تھے اس لئے اسے گاؤں سے دس میل دور قصبے میں مزدوری کے لئے جانا پڑتا۔ وہ ہر روز اپنی سائیکل کے کیریئر پر روغن کے دو پرانے اور

خالی ڈبے لٹکا لیتا اُن کے اوپر رسی کی مدد سے ڈیڑھ کوچی باندھتا اور اپنے وہ کپڑے کہ جن پر سفیدی اور روغن کے چھینٹوں کے لاتعداد نشانات تھے پہن کر مزدوری کی تلاش میں نکل جاتا جو کبھی تو مسلسل کئی روز تک متواتر ملتی اور کبھی کئی ہفتے تک اسے خالی ہوا خوری کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوتا۔ جس دن اسے مزدوری نہ ملتی اسے بہت غصہ آتا اور یہ غصہ گھر آکر بیوی اور بچوں پر اترتا تھا۔

اب اکّو دو سال کا ہو چکا تھا لیکن وہ ماں کے دودھ کے علاوہ کچھ بھی کھاتا پیتا نہیں تھا۔ حیرت انگیز طور پر اُس کی خوراک بہت معمولی تھی۔ ماں نے بھی اور بوبو نے بھی کئی بار کوشش کی کہ وہ روٹی سالن ، یا چاول کھچڑی کو منہ لگائے لیکن اکو کو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے جب بھی بھوک لگتی وہ چیخنا شروع کر دیتا..... اماں مُدُدُو .... اماں دُدُو .... اکّو کا باپ اُس کی اِس عادت سے چڑتا تھا اور بعض اوقات اس کی پٹائی بھی کر دیتا۔ باپ کی شخصیت کا تاثر اکّو کے معصوم ذہن پر بہت بُرا ہوا۔ وہ اسے ایک ظالم ، غصہ ور اور ہر وقت چیختے رہنے والا ایک بد دماغ شخص سمجھتا تھا۔ اسی لئے کبھی باپ کے پاس میں نہیں جاتا تھا بلکہ اسے دیکھتے ہی ماں کی گود میں چھپ جاتا اور خوف سے اس سے لپٹ جاتا۔ البتہ اس کے بالکل برعکس ماں اسے بہت پیار کرتی تھی۔ دوسرے سب بچوں سے زیادہ..... اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اکّو سب سے چھوٹا تھا اور چھوٹا بچہ ویسے ہی ماں کو بہت پیارا ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ وجہ بھی ہو لیکن ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ اکّو اپنی ماں کی ہر بات مان لیتا تھا۔ اسے تنگ نہیں کرتا تھا اسے جب بھی گھروں میں کام کاج کے لئے جانا ہوتا تو وہ کبھی ساتھ جانے کی ضد نہ کرتا اور ضد کرتا بھی تو ماں کے سمجھانے سے جلد ہی اپنی ضد سے باز آجاتا۔

اکّو کو بھی ماں سے بہت محبت تھی۔ جب تک بوبو فارغ رہتی یا اسے کھلاتی رہتی وہ اس کے ساتھ رہتا جب وہ کسی کام میں مشغول ہو جاتی تو وہ دروازے کے سامنے باہر گلی میں آبیٹھتا اور دیر تک ماں کا انتظار کرتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ شروع دن سے اس کی اپنے بھائیوں سے نہیں بنی تھی۔ نہ جانے کیوں...... وہ ان سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ بھائی بھی اس کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل جاتے اور گاؤں سے متّصل اونچے اونچے ٹیلوں پر کھیلتے پھرتے۔ یا پھر ٹیلوں کے پار کھیتوں سے گذرنے والی چھوٹی سی نہر میں نہاتے رہتے۔ اکّو کبھی بھی ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

شام کو جب ماں اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر لوٹتی تو اکّو دور سے ہی اسے دیکھ لیتا اور اماں اماں کہتا ہوا اس کی طرف دوڑ لگا دیتا۔ ماں بھی محبت سے اسے گود میں بھر لیتی اور پیار سے اس کے گال چومتی۔ یہ روز کا معمول تھا اور اکّو کا پسندیدہ مشغلہ۔ وہ اس سے کبھی نہیں اکتاتا تھا اور شاید ماں بھی کبھی نہیں اکتاتی

تھی۔ اکّو کو ماں کے انتظار میں بھی ایک عجیب لطف آتا تھا۔

پھر ایک دن صبح جب اکّو سو کر اٹھا تو دیکھا کہ ماں ابھی تک بستر پر لیٹی ہے اس نے اپنے سفید دوپٹے کو بٹ کر سر کے گرد کس کر باندھ رکھا ہے۔ اتنا کس کر اس کی بھویں آنکھوں پر جھک سی آئی تھیں .... وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ اکّو اٹھ بیٹھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب بھائی غائب تھے۔ تینوں کی مشترکہ چارپائی خالی پڑی تھی۔ بہن باہر صحن میں چھپری نما باورچی خانے میں مصروف تھی۔ کمرے کے کھلے دروازے سے وہ اسے آٹا گوندھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ذرا آگے جھک کر صحن کے انتہائی کنارے کی طرف دیکھا جہاں ایک دوسرے چھپر کے نیچے اس کے باپ کا پلنگ مستقلاً پڑا رہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ باپ ابھی تک سو رہا تھا۔ اس کی نظر صحن، باورچی خانے اور کمرے میں ادھر ادھر گھوم پھر کر واپس ماں کے چہرے پر آگئی جو آنکھیں بند کئے ہائے ہائے کر رہی تھی .... وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اکّو نے محسوس کیا کہ آج ماں کا جسم ہر روز سے زیادہ گرم ہے۔ اس کے معصوم ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ ماں کو تیز بخار ہے۔ اس نے لمحہ بھر سوچا پھر ماں کے پھیلے ہوئے بازو پر سر رکھ کر خود بھی لیٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ ماں کی گردن پر تھا اور ٹانگ پیٹ پر۔ وہ اب بھی معصومیت سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اکّو کو ایک انجانی خوشی بھی تھی کہ آج ماں اس کے پاس تھی اور ایک بے نام سا خوف بھی کہ ماں ہائے ہائے کیوں کر رہی ہے۔ وہ کچھ دیر تو یونہی لیٹا رہا پھر پیٹ کی آگ نے ماں کو جگانے پر مجبور کر دیا اس نے آہستہ آہستہ ماں کو جھنجھوڑا اور بولا، "اماں دُدّو" .... دودھ پی کر وہ کچھ دیر کے لئے بہن کے پاس بھی گیا لیکن جلد ہی واپس آکر پھر ماں کے پاس لیٹ گیا۔

اکّو کی ماں دو دن بیمار رہی۔ اس دوران میں ان کے گھر بہت سے لوگوں کا آنا جانا رہا۔ اس نے ایک شخص کو دیکھا جو ایک بیگ اٹھائے چشمہ لگائے اور گلے میں رسی کی طرح کا کوئی آلہ لٹکائے آیا۔ اس کے آتے ہی اکّو کو ماں کے پاس سے ہٹا لیا گیا۔ بہن نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔ اکّو بڑے غور سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر اس کی ماں کے بازو میں لمبی سی ایک سوئی چبھو رہا ہے تو وہ ڈر گیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ جیسے ماں کے خلاف ہونے والے ظلم پر احتجاج کر رہا ہو۔ وہ اماں اماں پکارتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں موجود اس کا باپ بھی اس کے احتجاج میں شریک ہوگا لیکن جلد ہی اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ جب اس کے باپ نے اس کے رونے سے تنگ آکر اسے چپ کرانے کے لئے ایک تھپڑ اس کے پھول سے گال پر جڑ دیا۔ وہ چپ تو کیا ہوتا اور زور زور سے رونے لگا۔ بوبو اسے لیکر باہر صحن میں

آگئی اور ادھر ادھر ٹہل کر اور اسے گود میں ہلا ہلا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر اور باپ دونوں گھر سے چلے گئے مگر اکّو کا رونا ختم نہیں ہوا۔ بالآخر ماں نے اسے اپنے پاس لٹایا اور خوب پیار سے چوما، سینے سے لپٹایا تو اسے کچھ سکون ملا اور وہ ماں کی بغل میں منہ دیئے ایک ہاتھ اس کی گردن اور ٹانگ پیٹ پر رکھے نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ مگر اس رات اسے سونا نصیب نہیں ہوا۔ آدھی رات تھی جب اس کی ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ اسے نمونیہ ہو گیا تھا۔ رات کے اس پہر کسی ڈاکٹر کا ملنا محال تھا۔ اس لئے ماں تھوڑی دیر تڑپی اور پھر سب کو روتا چھوڑ کر اپنی اصل منزل کی طرف چلی گئی۔ اس رات اکّو نے پہلی بار دیکھا کہ اس کا باپ بھی رو رہا ہے، بہن اور تینوں بھائی بھی رو رہے ہیں۔ وہ خود بھی ان رونے والوں میں شامل تھا۔ آج پہلی بار اس کے باپ نے سب بہن بھائیوں کو اپنے بازوؤں میں لیکر پیار کیا ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا بھی چوما تھا۔ اکّو جب روتے روتے تھک گیا تو بہن کے کندھے سے لگ کر سو گیا تھا۔ صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ محلے کی بہت سی عورتیں ان کے صحن میں جمع تھیں۔ ان میں سے کچھ تو زمین پر بچھی ہوئی چادر پر بیٹھی تھیں اور کچھ ادھر ادھر کھڑی اپنے روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے میں مشغول تھیں۔ ایک بوڑھی عورت اس کی بہن کے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی اور بہن رو رہی تھی۔ بہن کو روتا دیکھ کر اس کا بھی دل بھر آیا اور اس نے پہلے منہ بسورا پھر ذرا بلند آواز سے رونے لگا۔ بہن نے اس کی آواز سن کر فوراً اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ وہ حیرت سے گھر میں موجود لوگوں اور ان کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ صحن میں ایک طرف چارپائیاں کھڑی کر کے اور ان پر چادریں ڈال کر ایک کمرہ سا بنایا گیا تھا۔

یہاں اس کی ماں کی میت کو آخری غسل دیا جانا تھا۔ لیکن اکّو کو یہ سب نہیں معلوم تھا۔ وہ کچھ دیر تو بہن کی گود میں ہمکتا رہا پھر رونے لگا۔ اسے بھوک لگی تھی۔ اماں دُدّو .... اماں دُدّو پکارتے ہوئے وہ بہن کے بال نوچ رہا تھا۔ بوبو نے اسے پیالی میں دودھ پلانے کی کوشش کی دکان سے بسکٹ بھی دلائے لیکن اکّو نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اسے ماں کے دودھ کے علاوہ کچھ کھانے پینے کی عادت ہی نہیں تھی۔ بھوک تنگ کرتی رہی۔ اور وہ روتا رہا کبھی تھک کر چپ ہو جاتا اور جب بھوک تیز ہو جاتی پھر رونے لگتا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ گھر میں موجود سب بچے بڑے رونے لگے۔ ماں کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔ سب عورتیں اس کا آخری دیدار کر رہی تھیں۔ بہن کی گود میں سوار اکّو نے جب سفید کفن میں سے جھانکتا ہوا ماں کا چہرہ دیکھا تو بے اختیار اماں اماں پکارتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ وہ تو بہن نے فوراً مضبوطی سے اسے تھام لیا

ورنہ وہ لاش کے اوپر ہی جاگرتا۔ اب اکّو کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی ماں کہاں ہے ، وہ بار بار جنازے کی طرف جھکتا اور ماں کو ایسی بے قراری سے پکارتا کہ بہن تو بہن وہاں موجود بہت سی عورتوں کا کلیجہ شق ہونے لگا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی بے ساختہ چیخوں پر قابو پایا۔ ایک بڑی بی نے اکّو اور بوبو دونوں کو وہاں سے زبردستی ہٹادیا۔ دونوں دور کھڑے روتے رہے۔ جنازہ گھر سے چلا گیا۔ کفن دفن کے بعد لوگ اپنے گھروں کو لوٹ بھی آئے اور آہستہ آہستہ اس واقعہ کو بھول گئے۔ مگر اکّو اس واقعہ کو نہیں بھولا تھا۔ وہ ہر روز شام کے وقت دروازے کے سامنے گلی میں بیٹھ جاتا اور نکڑ کی طرف منہ کر کے ماں کا انتظار کرتا۔ جب سورج غروب ہوتا اور اندھیرا چاروں طرف پھیلنے لگتا تو بہن اسے زبردستی وہاں سے اٹھا کر گھر کے اندر لے جاتی۔ اس وقت اکّو خوب روتا اور ماں کو پکارتا۔ پہلے چند دن تو بہن بھی اس کے رونے میں شریک ہوئی لیکن آہستہ آہستہ اس کے آنسو خشک ہوگئے۔ ماں کے بغیر گھر کی ذمہ داری نے اسے وقت سے پہلے ہی باشعور کر دیا تھا۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی سے ویسے بھی محبت زیادہ تھی۔ وہ اس کے درد کو اپنے دل میں محسوس کرتی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ماں کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ، اور وہ ایسا کر بھی رہی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد کئی دن تک اکّو نے ایک قطرہ بھی حلق سے نہ اتارا تھا۔ اسے ماں کا دودھ چاہئے تھا اور ماں اپنے پورے وجود سمیت اس سے دور چلی گئی تھی۔ پھر کچھ بھوک اور کچھ بہن کی محبت نے اسے دودھ کے علاوہ بھی کچھ چیزیں کھانے کا عادی بنادیا۔

اب اکّو کی عمر چار سال تھی۔ وہ ماں کو تو نہیں بھولا تھا۔ لیکن بہن کے اندر ماں کا وجود تلاش کرتا رہتا تھا۔ اس کی بہن نے اسے بتایا تھا کہ ماں اس کے لئے کھلونے اور میٹھی میٹھی چیزیں لینے کے لئے دور گئی ہے۔ اور جلد ہی لوٹ آئے گی۔ اکّو نے اس بات پر یقین کر لیا تھا۔ وہ ہر روز ماں کا انتظار کرتا۔ مگر ماں لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ وہ ذرا بڑا ہوا تو گلی سے باہر بھی نکلنے لگا۔ تب اس نے سنا کہ اس کے کچھ دوست کہتے تھے کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔ اکّو کا دل یہ بات تسلیم نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک کش مکش ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ سچا کون ہے۔ بہن یا دوست .... اسے اس بات کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ جو مر جاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ لیکن اس کی ماں مری تو نہیں تھی۔ وہ تو اس کے لئے کھلونے اور مٹھائی لینے گئی تھی۔ وہ تو ایک دن ضرور آئے گی۔ اسی انتظار میں ایک سال اور بیت گیا۔ ماں تو نہ آئی البتہ کچھ اجنبی سے لوگ آئے۔ اور اس کی بہن کو ڈولی میں بٹھا کر لے گئے۔ لوگ کہتے تھے اس کی شادی ہو گئی۔ اکّو کو تو شادی اور ماں کی موت میں ذرا بھی فرق محسوس نہیں

ہوا۔ وہ شادی والے دن بھی خوب رویا تھا۔ بہن جو اب ماں کی جگہ اس کا سہارا تھی۔ جس کی بغل میں منہ دے کر گلے پر ہاتھ اور پیٹ پر ٹانگ رکھے بغیر اکّو کو نیند نہیں آتی تھی وہ بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اب تو اسے روتے میں چپ کرانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ شادی کے بعد بہن ایک دو بار آئی اور پھر طویل عرصے کے لئے غائب ہو گئی۔ اکّو ایک بار پھر اکیلا رہ گیا تھا۔ باپ اور بھائیوں نے اس کی طرف تھوڑی بہت توجہ دی بھی لیکن اس سے اکّو کا احساس تنہائی کم نہ ہوا۔ ہر روز ناشتے میں چائے پاپے اور ایک آدھ تھپڑ گھونسہ یا صرف ڈانٹ کھانے کے بعد وہ گلی میں نکل جاتا اور نکڑ پر بنے ہوئے ایک چبوترے پر جا بیٹھتا۔ یہ چبوترا دراصل چائے کے ایک ہوٹل کا کھنڈر تھا۔ اس میں ایک طرف بڑا سا سوراخ تھا۔ جو کبھی چولہے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اسی سوراخ کا ایک منہ چبوترے کی دیوار میں بالکل زمین کے برابر بھی نکلتا تھا۔

یہ چبوترا اکّو کا ٹھکانا تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر گھٹنوں پتھروں کو اپنے سامنے رکھے کھیلتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ ان پتھروں میں سے دو بڑے پتھروں کو الگ الگ رکھ لیتا۔ ایک کو اماں اور ایک کو بوبو کہتا اور دیر تک ان سے مزے مزے کی باتیں کرتا۔ ایک ایسے ہی دن جب وہ بوبو سے باتیں کر رہا تھا تو نجانے کہاں سے کتے کا ایک پلا وہاں آگیا۔ سیاہ اور سفید رنگ کے اس پلے کو دیکھ کر پہلے تو اکّو ڈرا اور اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر رک گیا۔ کتے کا پلاّ چھوٹا سا تھا۔ وہ دُم کو زور زور سے ہلا کر اور منہ سے کُوں کُوں کی آواز نکالتے ہوئے دبکتا ہوا اس کے پاؤں چاٹنے کے لئے آگے کو کھسکتا۔ ڈر کر رک جاتا اور پھر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔ اکّو تھوڑی دیر تو اسے دیکھا رہا پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اسے چمکارتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کی کمر سہلانے لگا۔ کتا یہ شفقت کا برتاؤ دیکھ کر خوشی سے زمین پر پھیل گیا۔ اور پیٹھ کے بل لیٹ کر ٹانگیں اوپر کو کرلیں۔ دُم اب بھی برابر ہل رہی تھی اور کوں کوں بھی جاری تھی۔ بلکہ اب تو ہمت کر کے اس نے دو ایک بار اپنی زبان سے اکّو کا ہاتھ بھی چاٹ لیا تھا .... اکو کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کافی دیر اس کے ساتھ کھیلتا رہا۔ پلے نے بھی ذرا بے تکلفی اختیار کی اور کئی مرتبہ اکّو کے رخسار سے اپنا چہرہ رگڑنے لگا۔ یہ ان کی دوستی کا پہلا دن تھا۔ پلا چونکہ کتیا تھی اس لئے اکّو نے اس کا نام بلّو رکھا۔

اکّو اور بلّو کی دوستی دن بدن گہری ہوتی چلی گئی۔ اکو، بلو کے لئے اپنے کھانے میں سے بچا کر لاتا اور بڑے پیار سے اسے کھلاتا۔ اس کے علاوہ گاؤں کے قصاب کی دکان سے چھیچھڑے بھی مانگ کر لاتا اور بلّو کو کھلاتا۔ بلّو بھی اس کی ایک آواز پر دوڑی دوڑی آتی اور بہت پیار سے اس کے ہاتھ پاؤں چاٹتی۔ اکّو بلّو کی وجہ سے وقتی طور پر اپنا غم بھول گیا۔ اب اسے کھیلنے کے لئے ایک ساتھی مل گیا تھا۔ وہ بلّو سے بالکل ایسے گفتگو کرتا جیسے انسان آپس میں کرتے ہیں۔ اور بلّو بھی خوب اس کی بات سمجھتی تھی .... وقت

گذرتا رہا اور ایک برس اور بیت گیا۔ اکوّ چھ سال کا ہو گیا۔ بلو بھی بڑی ہو گئی تھی۔

پھر ایک دن اکوّ سو کر اٹھا تو دو خوشیاں اس کی منتظر تھیں۔ ایک تو یہ کہ بوبو آئی تھی اور اس کی گود میں گول مٹول سفید سا مُنّا تھا۔ اور دوسری یہ کہ بلو بھی ماں بن گئی تھی۔ اس نے چھ بچے دیئے تھے۔ سفید، کالے، بھورے .... رنگ برنگے۔ چبوترے میں موجود چولہے کا سوراخ ان کا گھر تھا۔ اکوّ نے جب بچوں کو دیکھا تو بہت خوش ہوا تھا اور دوڑتا ہوا گھر آیا اور بوبو کو بتانے لگا۔ وہ خوب اچھل رہا تھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی .... وہ کبھی گھر آتا کبھی واپس چبوترے پر بھاگ جاتا۔ اس نے آج ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ اپنے حصے کا تمام ناشتا اس نے بلو کو کھلا دیا تھا۔ وہ آج چھیچھڑے بھی معمول سے زیادہ لایا تھا۔ شام تک اس نے گھر اور چبوترے کے سینکڑوں چکر کاٹے۔ کبھی مُنّے کی گود میں لے کر کھلایا کبھی بلو کے بچوں کو ....

اب یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ مُنّے کو لیکر چبوترے پر آجاتا اور سب مل کر کھیلتے ....

دس بارہ دن گذر گئے بچوں کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور وہ چولہے کے سوراخ سے باہر نکل کر بھی ادھر ادھر لڑھکنے لگے تھے۔ جب بلو کھانے کی تلاش میں اپنے گھر سے باہر ہوتی اور بچے سوراخ سے نکل کر ادھر ادھر بکھر جاتے تو اکوّ انہیں پکڑ پکڑ کر لاتا اور پھر سے ان کے گھر میں رکھ دیتا۔ بلو آتی تو سب بچے کاؤں کاؤں کر کے اسے چمٹ جاتے اور دودھ پینے لگتے۔ اکو بڑی دلچسپی سے یہ سب دیکھتا رہتا۔ ایسے وقت میں اس کی جذبات بڑے عجیب سے ہوتے تھے۔ اسے لگتا جیسے بلو اماں ہے اور سب پلے اکو ہیں۔ اُس کے ننھے سے ذہن میں ماں کی تصویر ابھرتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ اسے ماں کا چہرہ اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ لیکن کہیں لاشعور میں ماں کا پورا وجود محفوظ تھا۔ گزشتہ چار سالوں میں وہ ماں کو ذرا بھی نہیں بھولا تھا۔ کبھی بوبو کی مشکل میں اور کبھی پتھروں میں وہ ماں کو تلاش کرتا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگتا جیسے ماں کے بغیر وہ ادھورا سا ہے۔ اپنی تنہائیوں میں جب وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوتا اور نیند نہ آتی تو وہ ماں کی ایک خیالی تصویر بنالیتا اور چپکے چپکے اس سے باتیں کرتا۔ وہ اپنے میلے اور بدبو دار تکیے کو اپنے برابر لٹالیتا اور ایک ہاتھ اور پاؤں اس پر رکھ کر یہ سمجھتا کہ ماں کی گردن پر ہاتھ اور پیٹ پر پاؤں رکھا ہے اسے بہت سکون ملتا وہ آنکھیں موند لیتا۔ اسے لگتا جیسے ماں اسے آہستہ آہستہ لوری سنا رہی ہے۔ اور پھر چند لمحوں کے بعد وہ نیند کی وادی میں کھو جاتا ....

وہ شاید کوئی چیخ کی آواز تھی جسے سن کر اکوّ چونکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بچے نے دوسرے کو پیچھے دھکیل کر خود دودھ پینا شروع کر دیا ہے۔ اور دودھ سے محروم ہونے والا صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا

پوری قوت سے دودھ پینے میں مصروف اپنے بھائی بہنوں کے اوپر نیچے سے گھس کر دودھ تک پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ اکّو کو اس پر ترس آیا۔ اس نے ایک پلّے کو، جو کہ مسلسل کافی دیر سے دودھ پی رہا تھا، ہٹا کر اس چیخنے والے کو دودھ سے لگا دیا۔ وہ ہر روز ایسا ہی کرتا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ کسی کو دودھ سے محروم نہیں رہنا چاہیئے۔

یوں تو دن اچھے بیت رہے تھے لیکن ایک بات یہ ہوئی کہ ماں بننے کے بعد بلو کچھ کٹکھنی سی ہو گئی تھی۔ وہ بات بے بات بھونکتی رہتی۔ کوئی اس کے چبوترے کے نزدیک سے گذرتا تو اسے کاٹنے کو دوڑتی۔ شاید سمجھتی تھی کہ آنے والا اس کے بچوں کو نقصان نہ پہنچادے۔ اکّو وہاں ہوتا تو اسے منع کرتا رہتا۔ لیکن وہ ہر وقت تو وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک ایسے ہی دن جب اکو اپنے گھر میں تھا تو بلو نے چبوترے کے پاس سے گذرنے والے ایک بوڑھے شخص کی پنڈلی بھنبھوڑ ڈالی۔ اس واقعے پر گاؤں والوں کو بہت غصہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ بلو کسی وجہ سے پاگل ہو گئی ہے اور اس کا زندہ رہنا پورے گاؤں کے لئے نقصان دہ ہے۔ تب فیصلہ کیا گیا کہ اسے زہر دے دیا جائے۔ اکو کو اس فیصلے کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ حسب عادت صبح سویرے بستر سے اٹھتے ہی چبوترے پر پہنچا لیکن یہاں اس نے جو کچھ دیکھا اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔ اس نے دیکھا کہ بلّو کا جسم ایک طرف اکڑا ہوا پڑا ہے۔ اس کے منہ سے خون نکل نکل کر کچی زمین میں جذب ہو چکا ہے اور سب بچے کاؤں کاؤں کرتے اس کے اوپر نیچے پھر رہے ہیں۔ کوئی بھوک سے بے تاب ہو کر دودھ پینے کی کوشش کرتا مگر وہاں دودھ کہاں تھا۔ زندگی کی تمام علامتیں رخصت ہو چکی تھیں۔ بچہ دودھ کشید کرنے میں ناکامی کے بعد چلانا شروع کر دیتا............ اکّو کو یہ منظر بڑا خوفناک لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہاں بلو نہیں اماں لیٹی ہوئی ہے اور اکو اسے جگانے کے لئے رو رہا ہے۔ چلاّ رہا ہے۔ مگر اماں تو جاگتی ہی نہیں............ وہ کیوں نہیں جاگتی............ کیا وہ مر گئی ہے............ ہاں شاید وہ مر گئی ہے............ بلو بھی مر گئی ہے............ جو مر جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا............ کبھی واپس نہیں آتا............ ایک سرگوشی اس کے اندر سے ابھری اور ساتھ ہی خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی............ اس کے پورے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اور رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود نہ رو سکا نہ چیخ سکا............ بس وہاں سے چپکے سے واپس مڑا اور گھر آکر بستر میں چھپ گیا۔

کچھ دیر بعد جب بوبو ناشتے کے لئے بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ آج خلاف معمول اکّو ابھی تک سویا ہوا ہے اسے حیرت ہوئی وہ چولہے کی طرف جانے کے بجائے اس کے بستر کی طرف بڑھی۔ اکّو چادر

لپیٹے لیٹا تھا۔ بوبو نے آہستہ سے اسے آواز دی اور چادر اس کے چہرے سے ہٹائی۔ لیکن چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی جان نکل گئی۔ اکّو کا چہرہ خوف کی وجہ سے سفید ہو رہا تھا۔ بوبو نے پیشانی پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ اسے سخت بخار ہے۔ وہ پریشان ہو گئی .... اس کے سرہانے بیٹھ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی "کیا ہوا بیٹے .... اکّو .... کیا بات ہے۔" اس نے پوچھا۔ مگر اکّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو خوفزدہ انداز میں ادھر ادھر نظریں گھما رہا تھا۔ بوبو نے محسوس کیا کہ اکّو کا بدن ہولے ہولے کپکپا رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر پیار سے پوچھا "کیا بات ہے بابو؟" بوبو کے پیار بھرے لہجے سے اکّو کو کچھ تقویت ملی اور وہ بولنے کے قابل ہوا۔ لیکن اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ کپکپاتی سی آواز میں بولا، "بوبو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر لگ رہا ہے! مگر کیوں، کس بات سے ڈر لگ رہا ہے۔" بوبو نے حیرت سے پوچھا۔

اکّو نے بدستور خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا، "وہ .... وہ بلّو ہے ناں۔"

"ہاں ہاں .... کیا ہوا بلو کو؟"

"وہ مر گئی ہے۔" اکّو نے بمشکل کہا۔

"مر گئی .... کیوں .... کس نے مارا ہے اسے؟" بلو کی موت کی اطلاع پا کر بوبو بھی پریشان ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اکّو بلو سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اس نے اکّو کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پتہ نہیں۔" اکّو نے بدستور سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر اکّو بولا۔

"بوبو اماں بھی مر گئی ہے ناں؟ اب وہ کبھی نہیں آئے گی ناں؟" اس کے معصوم لہجے میں پوشیدہ کرب کو بوبو نے فوراً محسوس کیا۔ آخر کو وہ بھی تو ماں تھی۔ اس نے چاہا کہ اکّو کو بتائے کہ ماں مری نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کھلونے اور مٹھائی لینے گئی ہے لیکن اکّو اس کی بات سنے بغیر اسی کھوئے کھوئے سے لہجے میں خود کلامی کر رہا تھا۔

"جو مر جاتے ہیں کبھی واپس نہیں آتے! اماں بھی مر گئی .... بلو بھی مر گئی .... وہ بڑبڑا رہا تھا .... اپنے ہی خیالوں میں مگن .... پھر ایک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا اور عجیب سے لہجے میں بولا "بوبو بلّو مر گئی .... اب اس کے بچوں کو دودھ کون پلائے گا؟"

اور بوبو کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سامنے دو سال کا اکّو ہے...اور تڑپ تڑپ کر کہہ رہا ہے۔ اماں دُدّو اماں دُدّو ....

موت سے مُلاقات

ساجد سعید

میں تھوکتا، ہانپتا اور سانس روکتا آگے کی طرف بہے رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے میں کسی بہت بڑی واشنگ مشین کے اندر چکر کاٹ رہا ہوں۔

یہ حادثہ ۱۳ جولائی کی شام کو اس وقت پیش آیا۔ جب میں ریو گرینڈ کے سامنے جو سمندر کے قریب ایک برساتی نالہ تھا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں برساتی نالے کے اندر جاگرا۔ اس واقعہ کو بعد میں امریکہ کے ایک ٹیلی وژن اسٹیشن نے اپنی رات کی نشریات میں دکھایا۔ لیکن اس وقت جب میں نالے میں گرا تھا، حقیقت یہ ہے کہ موت سے پنجہ لڑا رہا تھا۔ مجھے اس وقت

ایسا محسوس ہوا جیسے میں باورچی خانے کی بلینڈر مشین میں گول گول گھوم رہا ہوں اور اچانک میں کسی خاص چیز پر جاگرا اور اس کے بعد میں نیچے جارہا تھا تکلیف اور زخموں کے ساتھ۔ میں نیچے ہی نیچے چلا رہا تھا ہانپتا، سانس روکتا اور پانی تھوکتا ہوا اور ساتھ ساتھ خدا سے یہ دعا کرتا ہوا کہ "اے خدا! مجھے دوبارہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے ملا دے اور مجھے مرنے سے بچالے۔"

اس صورتحال سے کچھ دیر پہلے میں نالے کے قریب کھڑا اس کو بہتا دیکھا رہا تھا جو قریب کے سمندر ریو گرینڈ سے ٹھنڈا پانی لے جایا کرتا تھا۔ یہ کوئی پانچ فٹ چوڑا تھا لیکن مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ کتنی تیزی سے گزر رہا ہے یہ سب باتیں میں اس کے اندر گرنے سے پہلے سوچ رہا تھا اور پھر اچانک میرا پاؤں پھسلا اور پھر میں نیچے گرتا ہی چلا گیا میں نے بہت کوشش کی کہ تیر کر ایک طرف کو ہو جاؤں لیکن پانی کا تیز بھاؤ مجھے کرنٹ کے مانند لگا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں سپرمین سے لڑ رہا ہوں۔

میرے بڑے مجھے ہمیشہ یہ بات سمجھایا کرتے تھے کہ نالے کے پاس مت کھیلو لیکن میں نے ان کی اس بات کو ہمیشہ دوسرے کان سے اڑا دیا تھا اور اب میں اس نافرمانی کی وجہ سے مرنے کے قریب تھا۔

اب میں پانی میں اڑتا اڑتا وہاں پہنچ گیا تھا جہاں پتھر کے بنے پل نما بڑے بڑے پوسٹ تھے جو گلی میں نالے پار کرنے کے لئے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے ہاتھ اپنے سر پر رکھ لئے لیکن میں پھر بھی ان سے ٹکراتا ہوا گزرا مجھے ایسا لگا جیسے میں پن بال مشین میں اس کی اسٹیل بال کی طرح گھمایا جارہا ہوں۔

ڈھگ، ڈھگ، اور میرا سر گھوم گیا۔ میں نے پھر دعا کی کہ "اے خدا" مجھے کسی چیز سے لگنے نہیں دینا نہیں تو میں مر ہی جاؤں گا۔"

لوگ نالے کے ساتھ کھڑے چیخ رہے تھے کہ میں اپنا سر اونچا رکھوں۔ ان میں سے کچھ لوگ رو رہے تھے اور کچھ نالے کے کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے میرے ساتھ ساتھ۔ لیکن میں بہت تیزی سے بہتا جارہا تھا۔

اور وہ سب کنارے میں کھڑے اس طرح باتیں کر رہے تھے جسے وہ کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ میری نگاہوں کے سامنے امی ابو اور بہن بھائیوں کی تصویریں گھومنے لگیں تھیں میں جتنا ڈر رہا تھا اتنا اداس بھی تھا کیونکہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں ان کو دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا۔

پولیس کی گاڑیاں اور فائر انجنز نالے کے کنارے کھڑے تھے۔ ایک پولیس والا ہمت کر کے رسی کا آخری حصہ پکڑ کر نالے میں کود پڑا اور مجھے

پکڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پانی کا تیز بھاؤ کرنٹ کی مانند مجھے جھٹکا دے کر اس کی پکڑ سے دور لے گیا۔

اچانک میں نے ایک سرنگ اپنے سر کی طرف آتے دیکھی تو میں نے فوراً اپنی آنکھیں اور منہ بند کر لئے مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلی ہوں لیکن جب میں نے آنکھیں کھولیں تو خود کو دوسری طرف پایا۔

سامنے سے میں نے فائر مین کی طرف سے ایک کانٹا آتا دکھائی دیا جسے میں نے مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن میرے ہاتھ اور بازو ٹھنڈے پانی سے اس قدر ٹھٹرا چکے تھے کہ میری اس کانٹے پر گرفت زیادہ دیر برقرار نہیں رہی اور یہی کچھ میرے ساتھ کچھ دیر پہلے بھی ہوا تھا جب فائر مین نے میری طرف ایک نٹ پھینکا اور چیختے ہوئے اس کو مضبوطی سے پکڑنے کو کہا تھا میں نے اس وقت اللہ سے دعا کی تھی کہ "اے اللہ مجھے طاقت دے" لیکن پانی اتنا زوروں پر تھا کہ مجھے اپنی طرف کھینچ کر لے گیا۔

اچانک میں نے اپنے آپ کو پانی کے اس حصے میں پایا جہاں میں نے پانی کے بلبلے بنتے ہوئے دیکھے۔ یہاں پانی کا کم دباؤ تھا مجھے وہاں ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی گھر کی واشنگ مشین کے اندر ہوں کیونکہ میں سر سے پاؤں تک اسی پانی میں تر ہو چکا تھا۔ میں یہ سمجھا جیسے یہ میرا آخری وقت ہو اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پاش پاش ہوتا جارہا ہوں۔

میں جو پانی نگل چکا تھا اب میں اسی کو کھانس کھانس کر نکل رہا تھا میں اپنے آپ کو ٹوٹتا اور تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ لیکن اب میں دوسری سرنگ میں تھا اور اس دوسری طرف بہنے سے مجھے پتہ چلا کہ میں نالے کے نچلے حصے میں پہنچ چکا ہوں۔

اچانک دو زنجیروں نے مجھے پکڑے لیا اور مجھے پانی سے اوپر کھینچنے لگیں۔

اوپر آتے ہی میری جان میں جان آئی نیلے آسمان کے نیچے میں دریا کے کنارے ہی لیٹ گیا اپنی سانسوں کو درست کرنے کے لئے۔ "یا اللہ تیرا شکر ہے" میں ہانپتا ہوا بولا۔

مجھے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا اور چیک کیا گیا۔ یہ معجزہ تھا کیونکہ چھوٹی موٹی چوٹ کے علاوہ میں کوئی زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔

اس واقعے سے میں نے یہ سبق حاصل کیا تھا کہ کبھی نہ تو نالے کے قریب کھیلوں گا اور نہ ہی بڑوں کی باتوں کو نظر انداز کروں گا۔

بہادر بیٹا

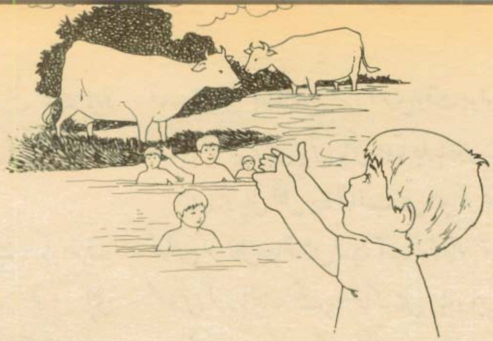

شاہدہ صدف

سبھی مجھ سے بڑے ہیں اور میں چھوٹا سا بچّہ ہوں
مگر ان سے اچھا ہوں
نہ ڈرتا ہوں، نہ لڑتا ہوں، نہ ہر اک پر بگڑتا ہوں
مگر کل شام کا صدمہ مجھے اب تک نہیں بھُولا
چراگاہوں سے بھینسوں کو چرُا کر آرہے تھے ہم
مرے بھائی بھی، رشتہ دار بھی گاؤں کے لڑکے بھی
کہ یکدم راستہ سب نے بدل ڈالا
گھنے برگد تلے تالاب میں جاکر نہانے کا سبھی کو شوق ہے
اکثر سبھی اس میں نہاتے ہیں
مگر...... مجھ کو تو ڈھلتی شام کا سورج
بہت پرلطف لگتا ہے
چمکتا آگ کا گولہ...... وہ جب ننھی ملائم
بدلیوں میں چھپ سا جاتا ہے
تو میرے جی میں آتی ہے کہ یکدم دوڑ کر جاؤں
اور اس کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھر کے لے آؤں
مگر میں کیا کروں پانی سے مجھ کو خوف آتا ہے
بہت ڈرتا ہوں چھپّڑ میں نہانے سے
مرے بھائی مرے ساتھی اچانک پانیوں میں کود جاتے ہیں

سبھی کو علم ہے میں سب سے چھوٹا ہوں
مگر پھر بھی سبھی مجھ کو ستاتے ہیں
چڑاتے ہیں

میں رہ جاتا ہوں خشکی پر
تو سب مڑ مڑ کے انگوٹھے دکھاتے ہیں
یہی کل بھی ہوا جب سرخ سی بدلی نے سورج کو نگل ڈالا
تو سب ساتھی ندی کے پار کھیتوں کے پرے جاتے نظر آئے
وہیں تنہا اندھیرے میں کھڑا رویا کیا میں دیر تک
لیکن پلٹ کر مجھ کو اک نے بھی نہیں دیکھا
مجھے ایسا لگا جیسے اچانک بھیڑیا کوئی
مجھے کھانے کو آئے گا

مویشی سب کے سب پانی میں شپ شپ اترے جاتے تھے
وہ بھوری بھینس میں جس سے بہت ہی پیار کرتا ہوں
مرے نزدیک سے گزری شپڑ سے سامنے پانی میں اتری
اور اپنی دُم ہلاتی تیرتی آگے کو جانکلی
مجھے اتنے اندھیرے میں سمجھ آتا نہیں تھا کچھ
بجز اس کے "میں جنگل میں اکیلا ہوں"
اکیلا دیر تک رویا کیا پھر ایکدم ابّا نے آکے
مجھ کو بانہوں میں بھرا، گودی اٹھایا
میرے رخساروں کو چوما اور گھر لائے
بتایا
"تم تو میرے سارے بیٹوں سے بہادر ہو"
تو پھر ایکدم مرے دل میں یہ ننھّا سا خیال آیا
"اگر میں بھینس کی دُم کو پکڑ لیتا
تو شاید پار اتر جاتا"

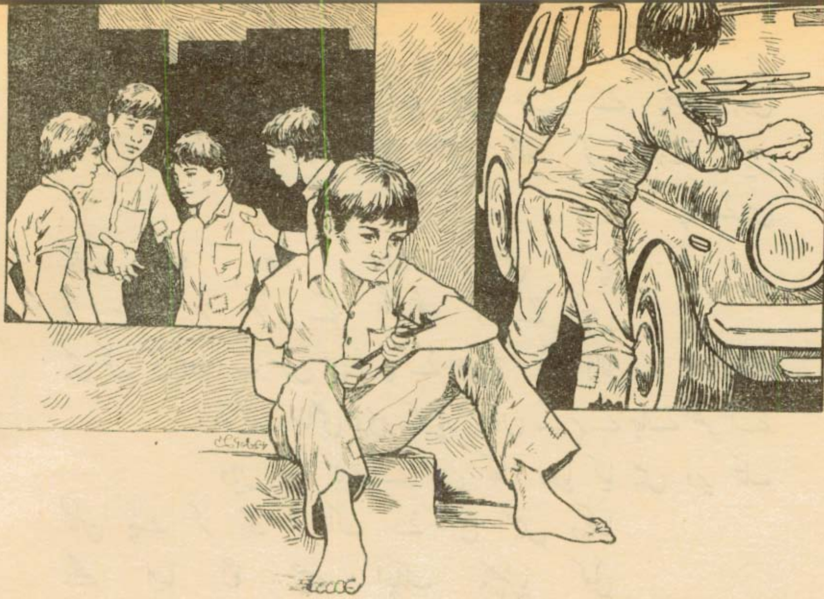

یہ میرے گاؤں کے بچے

نفیس احمد خان

بچے ہمارا سرمایہ، ہماری رونق ہیں جب یہ اچھلتے ہیں، کودتے ہیں، اٹکھیلیاں کرتے ہیں تو زندگی اپنی اپنی سی محسوس ہوتی ہے۔

یہ ننھے منے پیارے پیارے بچے، جب رنگ برنگے کپڑے پہن کر، اپنی توتلی اور میٹھی زبان میں تم سے باتیں کرتے ہیں، تو دوستو! کیا تمہیں کچھ محسوس ہوتا ہے؟

جب میں انہیں دیکھتا ہوں تو، تو سوچتا ہوں ہمارے کل کے معمار یہی تو ہیں انہیں ہی کل ملک کی باگ دوڑ سنبھالنی ہے، پھر جب ان کی طرف سے نظریں ہٹا کے دور کہیں دیکھتا ہوں، جہاں گیراجوں پہ، ہوٹلوں پہ، ملوں و کارخانوں پہ، ننھے منے بچے کاموں میں غرق ہوتے ہیں تو میں اداس ہو جاتا ہوں۔ میرے محلے، میرے گاؤں کے بچے جب ہاتھوں میں "تختی و قلم دوات" اور چند کتابیں تھامے مدرسے کی

جانب گامزن ہوتے ہیں تو یہ بچے دور کہیں سے انہیں دیکھتے ہیں اور کچھ سوچتے ہیں۔ آیئے ہم بھی ان کی سوچوں میں شریک ہو جائیں، ان کے دکھ، درد بانٹ لیں، ان سے باتیں کریں، انہیں اپنے سینوں سے لگائیں، اور انہیں بتائیں کہ ان کا مستقبل "روشن" ہے "تاریک" نہیں؟

اگر آپ ریلوے ورکشاپ (کوٹری) کی طرف سے گذریں تو چند گز کے فاصلے پر آپ کو ایک چھوٹا موٹا "گیراج" نظر آئے گا یہاں پر گیارہ سال سے پندرہ سال تک کے لڑکے کام کرتے ہیں اس طرف آیئے! اس چھوٹے سے بچے کا نام ناصر ہے عمر صرف بارہ برس، یہ معصوم سا بچہ بھی اسی گیراج پر کام کرتا ہے۔ صبح آٹھ بجے سے بارہ بجے تک اور ایک بجے سے شام پانچ بجے تک۔ اس "آٹھ" گھنٹے کی مزدوری کا معاوضہ اسے صرف سات روپے ملتا ہے، اس مہنگائی کے دور میں یہ سات روپے کچھ بھی تو نہیں۔ اس معصوم بچے نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا کہ گھر میں کما کر لانے والا وہ چھٹا فرد ہے چار چھوٹے بڑے بھائی، ایک اس کے ابو، اگر آپ اس معصوم سے بچے سے پوچھیں!

بیٹا! تمہیں پڑھنے کا، امیر آدمی بننے کا کوئی شوق ہے؟

تو یہ بچہ جواب دے گا، جی نہیں؟ وہ کیوں؟ اس لئے .... اس لئے کہ پڑھائی پر ہم غریب بچوں کا کوئی "حق" نہیں۔ جی ہاں صاحب، یہ حق تو صرف ان کو حاصل ہے جو غریب نہیں، امیر والدین کے بچے ہیں۔ اور جو انتہائی قیمتی و چمکدار گاڑیوں میں بیٹھ کر گرامر انگلش اسکول جاتے ہیں، اور اس گاڑی کو وردی پہنے شوفر چلاتا ہے۔

اے میرے محلے، میرے گاؤں کے بچو! کیا تمہارا کوئی مستقبل نہیں؟

ہاں، تمہیں کیا معلوم دن کب شروع ہوا سہ پہر کب ہوئی، اور شام کب ڈھلی، کاش کوئی تنظیم تمہارا مسئلہ اٹھائے، کوئی تم پہ توجہ دے کوئی تمہیں بتائے، کہ پڑھائی پر تمہارا بھی حق ہے۔ اے میرے خدا وہ وقت جلد لا، وہ انقلاب جلد آئے، جب ان معصوم بچوں کو ان کے بنیادی حقوق مل جائیں۔

میرے گاؤں کے بچے ہاتھوں میں دوسرے بچوں کی طرح کتابیں تھامے مکتب جا رہے ہوں۔ ہنستے، مسکراتے، اچھلتے کودتے، تب خوشیاں و مسرتیں مزید نکھر جائیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا ہے، معلوم نہیں ادارہ آنکھ مچولی اسے شائع بھی کرے گا یا نہیں لیکن بقول شاعر

صادق ہوں اپنے قول پہ غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ، کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آئیں بتلائیں تمہیں ہم کان میں
بچے کیا کیا سہتے ہیں جاپان میں

حارث شمیم

اس پروگرام کی سختی کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ اکثر اوقات جب بچے گھروں سے نکلتے ہیں تو شدید سردی کے باعث ان کے جسم نیلے پڑ جاتے ہیں اور ان کی مائیں ہاتھ جوڑ کر اساتذہ سے درخواست کرتی ہیں کہ انہیں ٹی شرٹ پہننے کی اجازت دے دی جائے بعض بچوں کی کمزور جسمانی صحت کو دیکھتے ہوئے انہیں ٹی شرٹ پہننے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

ماہرین کے مطابق بچوں کو اس سخت ماحول سے گذارنے کے بڑے حیران کن مثبت نتائج بر آمد ہوئے ہیں۔ ماہرین کے بقول سخت ماحول سے گذرنے والے بچے اوسط درجے کی صلاحیت رکھنے والے بچوں سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ جسمانی اور ذہنی ترقی کرتے ہیں۔ وہ عام میل جول کی طرف راغب ہوتے ہیں اور تعلیم پر بھرپور توجہ دیتے ہیں۔

اس سخت تربیت کے باعث ان بچوں کے جسموں کی قوت مدافعت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اگر انہیں کبھی سردی لگ بھی جاتی ہے تو وہ ایک آدھ دن میں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ جب بچے ان اسکولوں سے نکل کر کالجوں وغیرہ میں جاتے ہیں تو وہ عام لباس پہننے لگتے ہیں لیکن اس وقت تک ان کے جسم اور ذہن سختی برداشت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ زندہ قومیں کس طرح اپنی کمزوریوں پر نگاہ رکھتی ہیں اور انہیں دور کرتی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھتے ہوئے ذرا بتایئے تو کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کیوں اور نہیں ہیں تو کیوں؟

ابھرتے سورج کی سرزمین جاپان کی ہر بات انوکھی اور حیران کن ہے۔ مثلاً جاپان کی صنعتی ترقی جسے بیسویں صدی کا معجزہ کہا جاتا ہے۔ جاپانی قوم نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بھی ایک حیران کن طریقہ استعمال کر کے بڑے مفید نتائج بر آمد کئے ہیں۔

جاپان کے شہر کاواساکی کے "سن شائن کنڈن گارڈن" اسکولوں میں تین سے چھ برس کے عمر کے بچوں کو شدید سے شدید سردی میں بغیر قمیص کے آکر پڑھنا پڑتا ہے۔ ان کے کلاس روم کی تمام کھڑکیاں کھلی رہتی ہیں انہیں برف سے بھرے

میدان میں کھلے آسمان کے نیچے کھیلنا پڑتا ہے۔ ان کے جسم پر نیکر، پیروں میں جوتے اور سر پر ہیٹ ہوتا ہے۔ البتہ انہیں کبھی کبھی موزے پہننے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ بچوں کے برعکس ان کے اساتذہ عام لباس پہنے رہے ہیں۔

آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ ایسا بچوں کو سزا دینے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جی نہیں۔ یہ ایک باقاعدہ پروگرام ہے جس کا مقصد جاپانی بچوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر سخت بنانا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جاپان کے ماہرین تعلیم نے دیکھا کہ جاپانی بچوں کی اکثریت شدید سردی، گرمی، برف باری اور بارش کے وقت گھروں سے باہر نہیں نکلتی۔ بلکہ وہ گھروں میں دبک کر یا تو ویڈیو گیم کھیلتے رہتے ہیں۔ یا پھر کامک پڑھتے رہتے ہیں۔ جس کے باعث وہ جسمانی اور ذہنی طور پر انتہائی کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں جسمانی اور ذہنی طور پر ٹھوس اور متحرک بنانے کے لئے یہ پروگرام ترتیب دیا گیا۔

سخت سردی، برف اور بچوں کا کھیل

پڑھتے ہیں ہم کلاس میں کپڑے اتار کے

ہم سردی سے جیت گئے

پاکستان میں بچوں کی پہلی انوکھی دلچسپ پریس کانفرنس

افشین ـــــ مشکل سوال کا سامنا

آدرش بچوں کے مسائل بیان کرتے ہوئے

پریس کانفرنس کا سماں

بچوں کی آواز پر گوش بر آواز اخبارات کے نمائندے

بچوں کے مطالبات لکھتے ہوئے۔ صابر علی عارف اسحاق، شریف عثمانی، سرور جاوید اور دیگر اخباری نمائندے

ہمیں نظر انداز نہ کیجیے

طاہر مسعود

پاکستان کی ۴۳ سالہ تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے۔

یہ پہلا واقعہ ہے کہ دس بچے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنے جمع ہوئے ہیں۔ یہ بچّے کتنے کم عمر اور ننھے سے ہیں۔ اسکولوں میں ساتویں آٹھویں جماعت میں پڑھتے ہوں گے۔ لیکن انہیں پریس کانفرنس کرنے کی کیا سوجھی ہے۔ یہ مشغلے تو سیاستدانوں کے ہیں۔

ارے ؟ ذرا غور سے دیکھئے .... یہ تو اپنے ڈوڈو صاحب لگ رہے ہیں۔

وہی ڈوڈو جو کچھ عرصہ پہلے آنکھ مچولی کے الیکشن میں بھاری اکثریت سے بچوں کے نمائندے چنے گئے تھے۔ جنھوں نے جیدی، ماسی مصیبتے، انکل سرگم کو ہرایا تھا۔

لوہو، تو یہ حضرت واقعی لیڈر بن گئے .... وہی لیڈروں والا انداز، شلوار قمیض، اور سیاہ واسکٹ پہنے کتنے اعتماد سے اپنے ساتھیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں۔

آج ان کے ارادے کچھ اچھے دکھائی نہیں دیتے۔

لیجئے، وہ دو تین فوٹو گرافر صاحبان کیمرے اٹھائے سیڑھیاں چڑھتے آرہے ہیں۔ یہ تو واقعی سچ مچ کی پریس کانفرنس ہو رہی ہے۔

باپ رے .... تو یہ صحافی حضرات بھی چلے آرہے ہیں۔ یہ تو نمائندہ جنگ ہیں عارف اسحاق .... اور یہ حریّت کے نمائندے ہیں، بچوں کے لئے پیاری پیاری نظمیں بھی لکھتے ہیں .... شریف کمال عثمانی .... اور یہ صاحب کون ہیں بھلا؟ روز نامہ "پارلیمینٹ" کے فوٹو گرافر ہیں۔ مگر یہ کون سا اخبار ہے۔ اچھا، اچھا نیا نکلا ہو گا۔ ماشاء اللہ "ڈان" کے نمائندے بھی آگئے۔ یہ تو بڑی زبردست پریس کانفرنس ہونے والی ہے۔ اتنے تجربہ کار صحافی آئے ہیں، ان کی تو عمریں اسی شعبے میں گزر گئی ہیں۔ یہ لوگ تو ڈوڈو صاحب کے چھکّے چھڑا دیں گے۔

بھائی ڈوڈو .... اب بھی وقت ہے .... بھاگ لو!!

بھاگنے میں زیادہ نقصان نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ یہی خبر چھپے گی نا کہ ڈوڈو پریس کانفرنس سے بھاگ نکلے۔ کوئی بات نہیں اگلے دن اس کی تردید چھپوا دیں گے۔ لیکن بھائی! اگر نہ بھاگے اور صحافیوں کے ہتھّے چڑھ گئے تو بڑی بری درگت بنے گی۔ چلئے صاحب .... یہ نہیں ماننے والے۔ کافی سارے صحافی آچکے ہیں۔ اب تو دوسری میزوں سے بھی لوگ سر اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ کئی فوٹو گرافروں کو جلدی ہے۔ اسی لئے وہ جلدی جلدی تصویریں بنا رہے ہیں۔ ڈوڈو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدہ ہیں اور سنجیدہ کیوں نہ ہوں۔ آج پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پریس کے سامنے آئے ہیں تاکہ بتا سکیں کہ پاکستانی بچوں کو کیسے کیسے مسائل کا سامنا ہے۔ اور اس پریس کانفرنس کا سارا انتظام آنکھ مچولی والوں نے کیا ہے۔ سارا انتظام کا مطلب تو سمجھتے ہیں نا آپ؟

ہاں بھئی۔ لیجئے وہ پریس کانفرنس شروع ہو رہی ہے۔

ڈوڈو نے آہستہ سے کھنکار کر گلا صاف کر لیا ہے۔

اخباری نمائندوں نے اپنے اپنے کاغذ اور قلم نکال لئے ہیں۔

ڈوڈو کہتے ہیں:

جناب صحافی حضرات .... السلام علیکم

سب سے پہلے تو ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ ہماری پریس کانفرنس میں تشریف لائے۔ اس سے پہلے آپ بہت سی پریس کانفرنسوں میں شریک ہوئے ہونگے لیکن بچوں کی پریس کانفرنس

بچوں کے مسائل معلوم کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کیلئے میشن قائم

کمسن بچوں سے بھیک منگوانے اور مزدوری کرانے والوں کے خلاف سخت قوانین بنائے

بزرگ سگریٹ نوشی ترک کر دیں یا کم از کم بچوں کے سامنے نہ ...

اغوا کی وارداتوں نے بچوں کی تعلیم کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے

تعلیمی معیار کو برقرار رکھنے کیلئے نقل کے رجحان پر قابو پانا بہت ضروری

کراچی ۸ دسمبر (اسٹاف رپورٹر) بچوں کے عالمی سال کے سلسلے میں کراچی ٹیلی ویژن اسٹیشن بچوں کے بارے میں پیش کئے جانے ...

اظہار کیا کہ بڑے بچوں کی بات پر کوئی ... دیتے ہیں اور حکومت منصوبہ بندی کر ... بچوں کا کوئی خیال نہیں رکھتی ہے ... سیاست دانوں کے کردار پر بھی تنقید کی ... ان کے کھیل کود کے لئے کھیل ... نے کی ضرورت پر بھی زور دیا انہوں ... اغوا کی وارداتوں کی وجہ سے طلبا کی تعلیم ... ہے انہوں نے اس بات کی بھی ... بچوں پر کم توجہ دیتے ہیں انہوں ... رجحان پر قابو پانے پر بھی زور ... نمائندوں نے کہا کہ ٹی وی پر ... دیکھنے کے باوجود بزرگ سگریٹ ... تے انہوں نے کہا کہ ٹی وی ...

بچوں کے مسائل حل کرنے کیلئے کمیشن قائم کیا جائے

بچوں کی پریس کانفرنس

طبقاتی نظام تعلیم پر نکتہ چینی، بچوں کی پریس کانفرنس

کراچی ۸ دسمبر (اسٹاف رپورٹر) بچوں کے مسائل کے حل ... بچوں کے اساتذہ والدین اور ... آج مختلف اسکولوں کے ... مقامی ہوٹل میں مشترکہ ... پریس کانفرنس سے خطاب ...

کانفرنس کا اہتمام بچوں کے ماہنامہ آنکھ مچولی نے بچوں کے عالمی سال کے سلسلے میں کیا تھا۔ کانفرنس سے شیراز احمد، ایاز ... مسعود اختر، عامر انیس، سعیدہ انیس ... رمضان علی، عائشہ علی اور سعیدہ بٹ نے ... خطاب کیا ... اور کہا کہ ... انہوں نے بچوں ... اور کہا کہ ان وارداتوں کے اغوا کی وارداتوں ... ہوئی ہے۔ حکومت کو بچوں کے ... چاہئیں۔ بچوں نے الزام لگایا ہے ... تمام کے موثر اقدامات کرنے چاہئیں ... ٹی وی بچوں کی پڑھائی پر بری طرح اثر انداز ہو رہا ہے ...

DAWN

جسارت

School children hold Press confere...

By Our Staff Reporter

KARACHI, Dec 8: A ... ference of small sch... was organised b... Urdu periodic... Saturday ... faced ... wit...

...rd of edu... hool lev... udents ... oblems incl... d lack of pr... However, th... not scar... give ...

...ng some two privat... om a govern... oke to the jour... es a written state... ad by one of them, Ada... az, young TV artiste.

The students said that all private schools were commercialis... cation and Gov... were no...

...ical c... ng that ... disturbed s... nded that the scheduled, keeping i... the stude... ration o... nature ... e child... hey be...

...e at the Adarsh Ahmed... ment G... d Edit... he Pres...

روزنامہ جنگ کراچی

نوائے وقت ... ملتان

ماہنامہ "آنکھ مچولی" کے زیر اہتمام بچوں کی پہلی پریس کانفرنس سے آدرش ایاز، سعیدہ انیشن، سعیدہ ... تاجیہ ریاض پریس کانفرنس سے خطاب کر رہی ہیں۔ (تصویر قومی اخبار)

بچوں کی فریاد

بچوں کے مسائل حل کرنے کے لئے کمیشن قائم کیا جائے، آدرش ایاز

... مسائل حل کرنے کے لئے آواز اٹھاتے ہیں لیکن ہمیں بچہ سمجھ کر ٹال دیا جاتا ہے

ہمارے سیاسی لیڈر مستقبل کو سامنے رکھ کر کام کریں کیونکہ ملک کا مستقبل بچے ہی ہیں

... سے کام لینے پر پابندی ہے لیکن اس قانون پر عملدرآمد نہیں ہوتا، بچوں سے بھیک منگوائی جاتی ہے

... اسکولوں میں بچوں کی مارپیٹ پر پابندی لگائی جائے، اغوا کی وارداتوں سے بچوں میں خوف و ہراس پھیلا ہے

رپورٹ: صابر علی

قومی اخبار

... بچوں کے مسائل سے متعلق پہلی اور انوکھی پریس ... اس وقت دلچسپ صورتحال پیدا ہوئی جب بچوں نے ... پبلک اسکول کی ... انہوں نے کہا کہ ٹیلی ویژن پر ... کے ایک اشتہار میں ایک بچی اپنے باپ سے سگریٹ ... گورنمنٹ گرلز جینسو کوٹھ اسکول کی بی بی سعیدہ ... سرکاری اسکولوں کے بچے انگریزی سے واقف نہیں ... ٹی وی پروگرام بچوں کو خراب کر رہے ہیں۔ ... شیراز احمد، عامر انیس، خرم بدر اور ...

سعد اختر نے کہا کہ ہم ٹی وی پروگراموں کے معیار ... نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ... انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک کی ... نے کہا کہ سیاست میں طلبہ کے ... بعد حصہ لینے کی اجازت ...

مشرق

بچوں کے مسائل کے حل کیلئے اعلیٰ اختیاراتی کمیشن قائم کیا جائے

بچوں کو نہ بیچ دیا جائے۔ مفت تعلیم کیلئے قانون بنا کر سختی سے عملدرآمد کرایا جائے

اسکولوں میں بچوں کی مارپیٹ روکنے کیلئے قانون سازی ضروری ہے

معصوم طلبہ کے اغوا کے خلاف بچوں کا پریس کانفرنس سے خطاب

کراچی (اسٹاف رپورٹر) اسکولوں کے معصوم اور بے گناہ طلبہ ... کے واقعات کے باعث اسکولوں کے بچوں میں خوف و ہراس ... جس کے باعث ان کی تعلیم بھی متاثر ہو رہی ہے اس لئے ... حکومت کو اس کی روک تھام کیلئے فوری موثر اقدام کرنے ... بچوں کے مسائل کے حل کیلئے اعلیٰ اختیاراتی کمیشن قائم ...

کیا جائے۔ ان خیالات کا اظہار مختلف اسکولوں کے دس بچوں نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس ... کیا۔ جس کا اہتمام بچوں کے ایک مقامی ماہنامہ نے بچوں کے عالمی سال کے سلسلے میں کیا تھا۔ پریس کانفرنس سے ... آدرش ایاز، شیراز احمد، خرم بدر، سعد اختر، عامر انیس، سعیدہ ...

بچوں کے عالمی سال کے موقع پر ... آدرش ایاز ... پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں۔

بچوں کے مسائل حل کرنے کے لئے کمیشن قائم کیا جائے

بچوں کی پریس کانفرنس

لیڈر اپنے بچوں کو ... منشیات پر قابو پایا جا سکتا ہے

کراچی ۸ دسمبر (وقائع نگار) بچوں کے مسائل کے حل کے لئے کمیشن قائم کیا جائے بچوں کو اغوا کرنے والوں کو سخت ... سزائیں دی جائیں ... آج یہاں ایک مقامی ہوٹل میں ... جس کا اہتمام ... ماہنامہ ... کے دوران کہا ...

... صحیح طرح پر کام کریں تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ لیڈروں کو مستقبل کے رہنما یعنی بچوں کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہئے ... لیکن ہر پالیسی میں بچوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ... بچوں کا حال تباہ ہو رہا ہے ... مستقبل بھی روشن نظر نہیں ...

انہوں نے مطالبہ کیا کہ ... سے جو محنت مزدوری ... بچوں کو ... زیادہ کام لیا جاتا ... سرکاری اسکولوں میں معیار تعلیم ... خلاف قانون بنایا جائے ... ٹیلی ویژن پر بچوں کے ... پروگرام ...

بچوں کی پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں۔

بچوں کے عالمی دن کے موقع پر آدرش ایاز، سعیدہ انیشن، تاجیہ ریاض اور محترم بدر پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں

میں پہلی بار آئے ہوں گے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم نے یہ پریس کانفرنس کیوں کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بچوں کا سال ہے اور تمام دنیا خاص طور پر ہمارے جیسے ملکوں میں بچوں کے مسائل پر غور کیا جارہا ہے۔ بڑے بڑے سیمینار ہو رہے ہیں اور ان پر لاکھوں روپے خرچ کئے جارہے ہیں۔ ہم نے بھی آپ کو اس لئے دعوت دی ہے کہ ہم آپ کے سامنے پاکستانی بچوں کے مسائل رکھ سکیں۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ بڑے تو اپنے مسائل کے لئے آواز اٹھا لیتے ہیں لیکن اب تک بچوں نے اپنے مسائل کے لئے آواز نہیں اٹھائی۔ وہ اس لئے کہ کوئی ہماری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ہمیں بچہ سمجھ کر ٹال دیا جاتا ہے اب ہم اپنے مسائل پر بات کرنا چاہتے ہیں تاکہ حکومت اور دوسرے ذمہ دار لوگوں کی توجہ اپنے مسائل کی طرف دلائیں آپ لوگ ہماری آواز دوسروں تک پہنچانے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ہم ماہنامہ آنکھ مچولی کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں آپ سے ملنے کا موقع دیا۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارا ملک غریب ہے اور بہت سارے مسائل کا شکار ہے۔ لیکن اگر اچھے لیڈر ہوں اور صحیح طرح کام کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیڈروں کو ہمیشہ مستقبل کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہئے۔ اور ہمارے ملک کا مستقبل ہم بچے ہیں لیکن جب کوئی پلاننگ کی جاتی ہے تو بچوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ یہی تو افسوس کی بات ہے اس لئے بچوں کا حال بھی تباہ ہو رہا ہے اور مستقبل بھی روشن نظر نہیں آتا۔

بچوں کے کچھ مسائل کا تعلق والدین سے ہے کچھ کا حکومت سے اور معاشرے سے۔ سب مل کر ہی مسئلے حل کر سکتے ہیں۔

جناب! غربت اور جہالت دو بڑے مسئلے ہیں۔ اگر تعلیم عام کر دی جائے تو جہالت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ ہمارے ملک میں کروڑوں بچے بہت غریب ہیں۔ لاکھوں بچے محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ وہ موٹر ورکشاپوں میں کام کرتے ہیں۔ اخبار بیچتے ہیں ہار اور کھلونے بیچتے ہیں۔ گھروں میں کام کرتے ہیں۔ مالکوں اور گاہکوں کی ڈانٹ سنتے ہیں۔ دن بھر محنت کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان کو بہت کم پیسے ملتے ہیں۔ بچوں سے کام لینے پر پابندی ہے لیکن اس قانون کو توڑا جاتا ہے بچوں سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔ لیکن آج تک کسی حکومت کو ان کی حالت سدھارنے کا خیال نہیں آیا۔

ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ میٹرک تک تعلیم لازمی اور مفت کر دی جائے۔ جو بچے کام

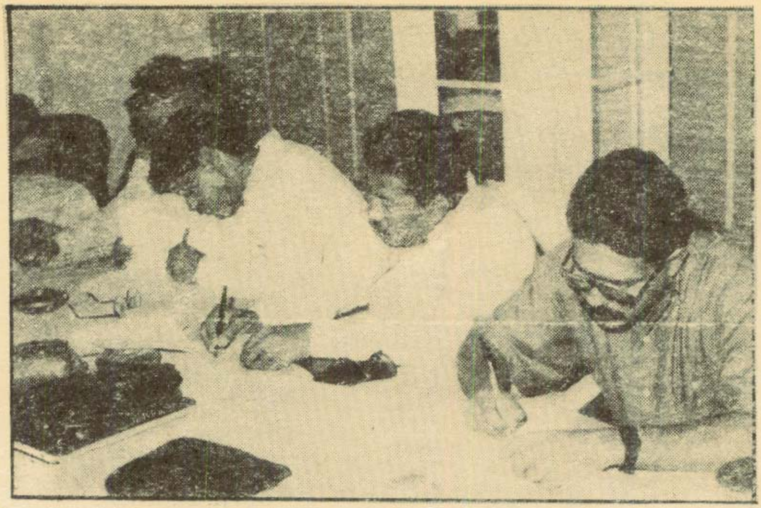

مسائل ہیں بچوں کے ۔ ہم لکھ رہے ہیں ۔ (اخبارات کے نمائندے)

کرتے ہیں ان کے اوقات میں کمی کی جائے۔ اس سلسلے میں نئے قانون بنائے جائیں اور ان پر سختی سے عمل کیا جائے۔ جو لوگ بچوں سے بھیک منگواتے ہیں ان کو سخت سزا دی جائے۔

ہمارے یہاں دو طرح کے اسکول ہیں۔ ایک تو پرائیویٹ ہیں یہاں بچوں سے بہت فیس لی جاتی ہے۔ اسکول آدھا سال بند رہتے ہیں لیکن فیس پوری ہوتی ہے۔ ہاں البتہ اساتذہ کو تنخواہ کم دی جاتی ہے۔ ایسے اسکولوں میں بچے بہت زیادہ لے لئے جاتے ہیں۔ جس کا اثر تعلیم پر پڑتا ہے۔

دوسری طرف سرکاری اسکول ہیں وہاں غریب بچے پڑھتے ہیں لیکن ان کا حال بہت خراب ہے۔ اکثر اسکولوں کی عمارتیں ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں۔ فرنیچر نہیں ہوتا۔ بچے زمین پر بیٹھ کر پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اکثر دیہاتوں میں بچے درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ بہت سے اسکولوں میں بچوں کو سخت سزائیں دیتے ہیں جس سے ان کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ بھاگ جاتے ہیں۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اسکولوں میں بچوں کو مار پیٹ سے روکنے کے لئے قانون بنائے جائیں حکومت پرائیویٹ اسکولوں کو لوٹ مار سے روکے اور سرکای اسکولوں کی حالت کو بہتر بنائے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ حکومت کو چاہئے کہ بچوں کے کھیل کود اور تفریح کے لئے مناسب سہولتیں دے تاکہ بچے غلط راستے پر نہ نکلیں اور صحت مند سرگرمیوں میں حصہ لیں۔

اس کے علاوہ ٹیلی ویژن پر بھی بچوں کے لئے اچھے پروگرام پیش کئے جائیں۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ

ا...... بچوں کے کھیل کے پارکوں اور میدانوں کا بندوبست کرے۔

۲...... بچوں کے لئے ایک کمیشن بنایا جائے جو بچوں کے مسائل حل کرنے کے لئے مناسب انتظام کرے۔

آج کل سب سے بڑا مسئلہ کراچی میں یہ ہے کہ بچوں کو اغوا کیا جارہا ہے۔ جس سے بچوں میں خوف پھیل رہا ہے۔ حکومت اور پولیس کو چاہئے کہ اس مسئلے کا فوراً حل سوچیں اور اغوا کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے۔ ہم والدین سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیں اور اپنی نگرانی میں رکھیں۔

آخر میں میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ آپ ہمارے مسائل لوگوں تک پہنچانے میں ہماری مدد کریں گے۔ آپ ہم کو اچھا "حال" دیجئے ہم آپ کو اچھا "مستقبل" دیں گے۔

ڈوڈو صحافیوں سے خطاب کر چکے تو سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ مختلف اخبارات کے نمائندوں نے سوال کئے اور ڈوڈو اور ان کے ساتھیوں نے جوابات دیئے۔

نمائندہ حریّت : آپ نے مطالبہ کیا کہ بچوں کے مسائل کے حل کے لئے ایک کمیشن بنایا جائے۔ ملک میں اس سے پہلے بھی بہت سے کمیشن بن چکے ہیں اور انہوں نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ اب اگر بچوں کا کمیشن بن گیا تو اس سے کون سا مسئلہ حل ہو جائے گا؟

ڈوڈو : جب ہر مسئلے کے لئے کمیشن بن چکا ہے تو بچوں کے مسائل کے لئے کمیشن کیوں نہیں بنا؟ اور یہ تو کمیشن پر ہے کہ وہ مسئلہ حل کرتا ہے یا نہیں۔ پہلے کمیشن بنے تو سہی۔ یہ بعد میں سوچا جائے گا کہ کمیشن نے کام کیا یا نہیں۔ اگر کمیشن کام نہیں کرے گا تو پھر ہم سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

جسارت : اس کمیشن میں کون کون شامل ہو گا۔ والدین ہوں گے یا سرکاری افسران؟

ڈوڈو : افسران تو ہر کمیشن میں ہوتے ہیں۔ اس میں والدین کو بھی ہونا چاہئے۔ اور ہم بچوں کا بھی ایک نمائندہ ہونا چاہئے تاکہ وہ بچوں کے مسائل بتا سکے۔

جنگ : اساتذہ پر آپ کو اعتبار نہیں ہے۔

مائیں بھی تھیں شریک اُستانیاں بھی تھیں۔

ڈوڈو : اساتذہ ہمارے دوسرے والدین کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں بھی کمیشن میں ہونا چاہئے۔

قومی اخبار : کیا آپ نے بچوں کی کوئی ایسوسی ایشن بنائی ہے؟

ڈوڈو : ہم نے ابھی تو اپنی کوئی ایسوسی ایشن نہیں بنائی ہے۔ کیوں کہ ایسوسی ایشن آہستہ آہستہ بنتی ہے۔ یہ ہمارا پہلا قدم ہے۔ ہم نے ابھی اپنی آواز بلند کی ہے۔ اسے سن کر اور بچے بھی متحد ہوں گے۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ تنظیم بننا چاہئے یا نہیں۔

قومی اخبار : کیا آپ بچوں کا کوئی کنونشن کریں گے؟

ڈوڈو : ہم ابھی بچے ہیں۔ اگر ہمیں بڑوں کا تعاون ملا تو ہم یقیناً کنونشن بلانے کے قابل ہو سکیں گے۔

آنکھ مچولی : شہر میں بچے اغوا ہو رہے ہیں۔ اس مسئلے پر آپ کا موقف شدت سے سامنے نہیں آیا ہے۔

عائشہ علی : اغوا بڑوں کا بھی ہو رہا ہے۔ حکومت کو اسے کنٹرول کرنا چاہئے۔ حکومت کو ایسے اقدامات کرنے چاہئیں کہ جو لوگ بچوں کو اغوا کرتے ہیں انہیں کڑی سے کڑی سزا دی جائے تاکہ وہ آئندہ ایسے کام نہ کریں۔

جنگ : بچوں نے اغوا کے خوف سے اسکول جانا چھوڑ تو نہیں دیا؟
ڈوڈو : روزانہ ایسی خبریں آ رہی ہیں۔ ہم لوگ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ پہلے ڈر لگتا تھا لیکن اب ہم اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہیں۔
قومی اخبار : اس کا اثر اسکولوں پر پڑا ہے؟
ڈوڈو : اثر تو پڑا ہے۔ اور بچوں میں ڈر بھی ہے۔
خرم بدر : ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں کہ امتحانات میں اب نقل بہت ہوتی ہے۔ اس لئے حکومت کو کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ وہ نقل کے رجحان کو ختم کر سکیں۔
قومی اخبار : نقل تو بچے ہی کرتے ہیں؟
خرم بدر : ٹیچرز اگر چاہیں تو بچوں کو نقل سے روک سکتے ہیں۔
سیدہ افشین : ایک بات میں بھی کہنا چاہتی ہوں۔ ٹی وی پر سگریٹ کے اشتہارات کیوں آتے ہیں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ تمباکو نوشی صحت کے لئے خطرناک ہے اور پھر اشتہارات بھی دکھاتے ہیں۔
سعیدہ بٹ : ہمارے اسکولوں میں امتحان میں مسیں بچوں کو بتا دیتی ہیں۔ یہ صحیح بات نہیں ہے۔
ڈوڈو : یہ خرابی دو ایک ٹیچروں میں ہو سکتی ہے۔ لیکن ٹیچرز ہمیں علم دیتے ہیں۔ ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔
جنگ : کیا آپ وضاحت کر رہے ہیں؟
ڈوڈو : جی ہاں، یہ میں وضاحت کر رہا ہوں۔
عائشہ علی : حکومت انڈسٹری کے قیام کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ لیکن تعلیم کو بھی اتنی ہی اہمیت دینی چاہئے جتنی آپ انڈسٹری کو اہمیت دیتے ہیں۔ اسی لئے کہ تعلیم نہیں ہوگی تو انڈسٹری کو کون چلائے گا۔
آنکھ مچولی : اکثر اسکولوں کے باہر چھولے والے بیٹھتے ہیں۔ ان پر مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں، ان کے کھانے سے بچوں کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ آپ منتخب نمائندے ہیں آپ نے بچوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ ایسی چیزیں نہ خریدیں۔
ڈوڈو : انسان جب کوئی بزنس کرتا ہے تو ایسی جگہ ڈھونڈتا ہے جہاں اسی کا بزنس چل سکے۔

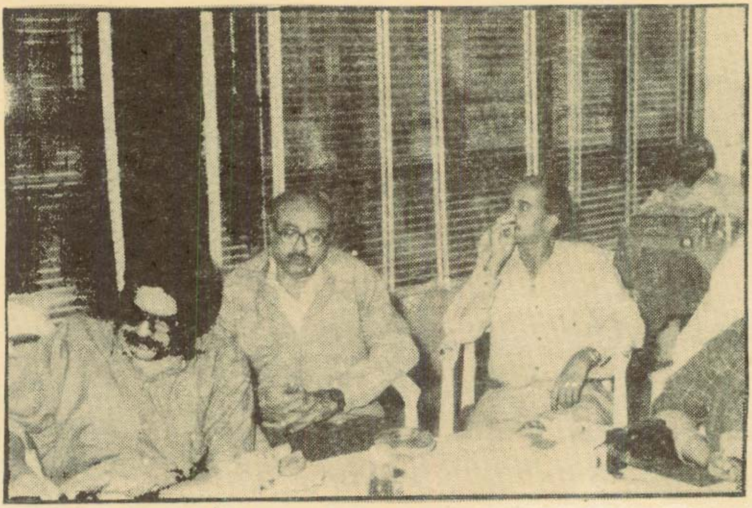

تین معروف صحافی - نمایاں قومی اخبار کے الیاس شاکر۔

اسکولوں کے باہر چھولے والوں کا بزنس چلتا ہے اس لئے وہ وہیں آکر اپنی چیزیں بیچتے ہیں۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ایسی چیزیں نہ خریدیں۔

جنگ : آپ اپنے ساتھیوں کی رہنمائی کرتے ہیں کہ وہ ایسی چیزیں نہ کھائیں۔

ڈوڈو : میں ہر ایک بچے کے پاس جاکر تو نہیں کہہ سکتا کہ بھائی آپ نہ کھائیں۔ اور سچ بات یہ ہے کہ میں خود کھاتا ہوں۔

(صحافی حضرات ہنسنے لگے۔ ایک صحافی نے کہا یہ پہلی پریس کانفرنس ہے جس میں ہمیں سچ سننے کو ملا ہے۔)

جنگ : آپ پرنسپل سے کہہ کر ان پر پابندی لگا سکتے ہیں۔

ڈوڈو : ان کے پاس لائسنس ہے۔

آنکھ مچولی : انہیں لائسنس کون دیتا ہے؟

ڈوڈو : پولیس دیتی ہے۔ دس روپے پولیس والے کو دے دیئے لائسنس مل گیا۔ (صحافی حضرات پھر مسکرانے لگے)

قومی اخبار : اچھا یہ بتائیے ٹیلی ویژن سے بچوں کی پڑھائی متاثر ہو رہی ہے۔

ڈوڈو : ٹی وی پر اچھے اور برے دونوں قسم کے پروگرام آتے ہیں لیکن بچوں کے پروگرام ایسے

وقت پر آنے چاہئیں کہ وہ بھی اسے دیکھ سکیں۔

خرم بدر : ٹی وی پر کتابوں پر تبصرہ آتا ہے لیکن بچوں کی کتابوں پر بھی تبصرے ہونے چاہئیں۔ انہیں بھی پتا چلنا چاہئے کہ کون کون سی کتابیں ان کے فائدے کی ہیں۔

آنکھ مچولی : والدین سے آپ کو کیا شکایات ہیں؟

ڈوڈو : والدین بہت مصروف رہتے ہیں۔ وہ بچوں کو بہت کم وقت دیتے ہیں۔ انہیں ہماری پڑھائی پر توجہ دینی چاہئے۔

سیدہ افشین : والدین ہماری بات پر اعتبار نہیں کرتے۔ اسکول میں پڑھائی کے بارے میں ہم انہیں بتاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

ناجیہ ریاض : بچے والدین ہی سے سب کچھ سیکھتے ہیں۔ انہیں ایسے کام نہیں کرنے چاہئیں جن کا بچوں پر برا اثر پڑے۔

ڈان : پرائیویٹ اسکولوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

خرم بدر : پرائیویٹ اسکول سب بزنس ہیں۔ اور سرکاری اسکولوں میں پڑھائی بہت کم ہوتی ہے۔

آنکھ مچولی : غریب اور امیروں کے اسکول الگ الگ ہیں۔ آپ اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں؟

ناجیہ ریاض : نظام تعلیم سب بچوں کا ایک جیسا ہونا چاہئے۔ غریب بچے اور امیر بچے کو ایک ہی جیسے اسکولوں میں پڑھنا چاہئے تاکہ ان کے ذہن ابھر کر سامنے آئیں۔ یہاں اسکالر شپ باہر پڑھنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان میں اتنی اچھی تعلیم کیوں نہیں دی جاتی کہ باہر سے لوگ یہاں پڑھنے آئیں کہ یہاں کی تعلیم اچھی ہے اور یہاں کا معیارِ تعلیم بلند ہے۔

سعیدہ بٹ : گورنمنٹ اسکولوں میں انگریزی بہت کم پڑھائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم انگلش نہیں سمجھ سکتے۔ حکومت کو چاہئے کہ غریب اور امیر کا فرق نہ کرے۔ ایک جیسے اسکول قائم کرے تاکہ ہم سب مل کر پڑھ سکیں۔

ناجیہ ریاض : آپ لوگوں نے تو ہم سے سوال کئے لیکن ایک سوال ہم آپ صحافیوں سے کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہمارے مسائل سنے لیکن یہ بتایئے کہ آپ ہمارے مسائل کے حل کے لئے کیا

کریں گے۔ آپ نے کچھ نہ کیا تو ہم یہ سمجھیں گے کہ آپ نے بھی ہمیں نظر انداز کر دیا۔

جنگ : ہمارے پاس اخبار ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے ہم اسے نمایاں کر کے چھاپیں گے۔ آپ کی آواز عوام اور حکومت تک پہنچائیں گے۔ اسی طرح ہم آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ نہ صرف آج بلکہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ ہمارا کام حکومت تک آپ کی بات پہنچانی ہے اس کے بعد حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے کہاں تک حل کرتی ہے۔

ڈان : جی ہاں ہم معاشرے کے تمام طبقوں کے مسائل اپنے اخبارات میں اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح آپ کے لئے بھی اٹھائیں گے۔

جنگ : اب ایک سوال ہم آپ سے کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ہمیں تو بلایا لیکن کیا آپ الیکٹرونک میڈیا یعنی ریڈیو، ٹیلی ویژن کے اعلیٰ حکام کے پاس بھی گئے اور ان سے کہا کہ وہ ایسے پروگرام شروع کریں تاکہ آپ بچوں کے مسائل سامنے آسکیں۔

ڈوڈو : یہ ہمارا پہلا قدم ہے۔ ہمیں آگے جانا ہے۔ اور یہ آہستہ آہستہ ہو گا۔ اس کے لئے بھی آپ کی مدد چاہئے۔ اگر آپ مدد کریں گے تو ہم ان سے بھی اپنی بات منوائیں گے۔

حریت : آپ بڑوں کی طرح سڑکوں پر آنے کا پروگرام تو نہیں رکھتے؟

ڈوڈو : ہم بڑوں سے الگ ہیں۔ ہم ان جیسے کام نہیں کر سکتے۔

آنکھ مچولی : آپ بچوں کے سیاست میں آنے کے حامی ہیں۔

ناجیہ ریاض : پاکستان کی سیاست کوئی اچھی سیاست نہیں ہے۔ یہاں سیاست میں جو حصہ لیتا ہے وہ گولی سے مارا جاتا ہے۔ اسٹوڈنٹ لائف میں بچوں کو اپنی تعلیم پر پوری توجہ دینی چاہئے تاکہ وہ اچھے شہری بن سکیں۔

ڈوڈو : میری ساتھی نے کہا کہ ہمیں اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہئے۔ لیکن کسی ایک کو تو اپنی پڑھائی کی قربانی دینی پڑے گی۔ وہ جاکر لوگوں کو بتائے گا کہ بچوں کے مسائل کیا کیا ہیں۔

ناجیہ ریاض : یہاں یونین جب بنتی ہے تو سیاست شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر پڑھائی کا نقصان ہو جاتا ہے۔

ڈوڈو : لیکن ہم اپنے خیالات کب تک دوسروں کے ذریعے اوپر پہنچاتے رہیں گے۔ ہم میں سے کسی کو تو جاکر اپنی بات کہنی ہوگی۔

ناجیہ ریاض : اس کے لئے کوئی ایک یونین ہونی چاہئے۔

خرم بدر : جی ہاں یہ تو نہیں ہے کہ دس دس یونینیں بنی ہوئی ہیں۔

(دو تین بچے زور زور سے بولنے لگتے ہیں اور وہ صحافیوں کو بھول کر آپس ہی میں باتیں شروع کر دیتے ہیں۔)

جنگ : لیجئے بھئی ان میں تو اختلاف ہو گیا۔

آنکھ مچولی : اس مسئلے پر ہر بچے کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے۔ بہرحال، ہم تمام صحافیوں کے بہت شکر گزار ہیں۔ ادارہ آنکھ مچولی کی حیثیت اس پروگرام میں صرف ایک میزبان کی تھی۔ بچوں نے یہاں اپنے جو بھی خیالات پیش کئے ہیں۔ یہ ان کے اپنے خیالات ہیں، جن سے ہمیں اتفاق بھی ہے، کچھ باتوں سے اختلاف بھی ہے۔ لیکن ہم توقع رکھتے ہیں کہ ان کی آواز حکومت تک پہنچے گی اور سنی جائے گی۔ کیوں کہ کون ہے جو اپنے مستقبل کی آواز سننا نہ چاہے گا۔!

صحافی حضرات

۱۔ جناب عارف اسحاق، نمائندہ جنگ

۲۔ جناب شریف کمال عثمانی، نمائندہ حریت

۳۔ جناب سرور جاوید، نمائندہ ڈان

۴۔ جناب سرور نسیم، نمائندہ جسارت

۵۔ جناب صابر علی، قومی اخبار

پریس کانفرنس کرنے والے بچے

۱۔ ڈوڈو (آدرش ایاز)

۲۔ ناجیہ ریاض

۳۔ عائشہ علی

۴۔ خرم بدر

۵۔ شیراز احمد

۶۔ سیدہ افشین

۷۔ سعیدہ بٹ

۸۔ شازیہ

۹۔ عامر عزیز

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بچوں سے محبت

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ آپؐ بچوں پر مہربانی فرماتے، ان سے محبت کرتے، پیار سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے اور ان کے لئے بھلائی کی دعا فرماتے تھے۔ اپنے نواسوں حضرت حسنؓ اور حسینؓ سے آپؐ کو بہت محبت تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپؐ ایک دن نماز پڑھ رہے تھے کہ حضرت حسینؓ بچوں کی عادت کے مطابق آپؐ کی کمر پر بیٹھ گئے اور ان کے گر جانے کے خیال سے آپؐ نے سجدہ لمبا کر دیا۔

دوسرے بچوں کے ساتھ بھی آپؐ کو ایسی ہی محبت تھی۔ خاص طور پر یتیم بچوں سے آپؐ بہت پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ عید کی نماز کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں آپؐ نے دیکھا کچھ لڑکے کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک لڑکا الگ بیٹھا رو رہا تھا۔ کپڑے بھی پرانے پہنے ہوئے تھا۔ رسول اللہؐ اس کے پاس گئے۔ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا "کیوں رو رہے ہو؟ دوسرے لڑکوں کے

ساتھ کیوں نہیں کھیلتے؟"

لڑکے نے حضورؐ کو نہیں پہچانا۔ کہنے لگا، "میرے باپ لڑائی میں رسول اللہؐ کی خاطر لڑتے ہوئے شہید ہوگئے ہیں۔ میری ماں نے دوسری شادی کرلی اور میرے سوتیلے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا اور میرا مال لے لیا۔ اب میں سارا دن مزدوری کرتا ہوں۔ شام کو بچوں کے ساتھ کھیلنے آتا ہوں تو کوئی مجھے نہیں کھلاتا۔ اس لئے رو رہا ہوں۔"

حضورؐ نے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا۔

"کیا تم اس سے خوش نہیں ہوگئے کہ رسول اللہؐ تمہارے باپ عائشہؓ تمہاری ماں، علیؓ تمہارے چچا اور حسنؓ اور حسینؓ تمہارے بھائی ہوں؟"

اب لڑکے نے حضورؐ کو پہچان لیا، کہنے لگا۔ "میرے باپ آپؐ پر قربان ہوئے۔ میں بھی آپؐ پر قربان، میں کیوں نہ خوش ہوں گا۔"

اس کے بعد حضورؐ اس یتیم لڑکے کو اپنے گھر لے گئے، اسے صاف ستھرا کیا، اچھے کپڑے پہنائے اور کھانا کھلایا۔

لڑکا اب بہت خوش تھا۔ ہنستا، دوڑتا لڑکوں کے پاس آیا۔ جب لڑکوں نے اسے آتا دیکھا تو پوچھا "ابھی تو تم رو رہے تھے اور اب اتنے خوش ہو۔"

لڑکے نے جواب دیا "میں بھوکا تھا، اب میرا پیٹ بھر گیا، میں ننگا تھا اب میں اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ میں یتیم تھا اب میرے باپ حضورؐ ہیں، میری ماں عائشہؓ، میرے چچا علیؓ اور حسنؓ اور حسینؓ میرے بھائی ہیں۔ کیا میں خوش نہ ہوں؟"

لڑکوں نے یہ سن کر کہا "کاش ہمارے باپ بھی اس لڑائی میں مارے جاتے۔"

وہ لڑکا ہمیشہ حضورؐ کی خدمت میں رہا اور جب آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو روتا تھا اور کہتا تھا "آج میں یتیم ہوگیا، اب میں غریب اور بے گھر ہوگیا۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ دس برس تک حضورؐ کی خدمت میں رہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں دس برس تک حضورؐ کی خدمت کرتا رہا اور اس عرصے میں آپؐ نے مجھے اف بھی نہ کہا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ حضورؐ کسی کام کے لئے کہتے اور میں کھیل میں لگا رہتا یا بھول جاتا، تو آپؐ کچھ دیر بعد مسکرا کر فرماتے۔ "اب تو یہ کام کردو۔"

بچے بھی آپؐ سے بہت محبت کرتے تھے، آپؐ کو دیکھتے تو ہنستے مسکراتے، آپؐ کے پاس

آجاتے اور آپؐ سب کو پیار کرتے۔ آپؐ کی عادت تھی کہ کسی بچے کو دیکھتے تو اس کے سلام کرنے سے پہلے خود سلام کرتے۔ جب آپؐ کو کوئی کھانے پینے کی چیز دیتا تو وہاں موجود سب سے چھوٹے بچے کو پہلے کھلاتے بعد میں کسی اور کو دیتے۔

حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کی یہ محبت صرف مسلمان بچوں ہی کے لئے نہ تھی، بلکہ آپؐ ان بچوں سے بھی محبت فرماتے تھے جو مسلمان نہ تھے۔

ایک یہودی کا بیٹا آپؐ کے پاس اکثر آیا کرتا تھا اور کبھی کبھی کوئی کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ یہودی لڑکا بیمار ہوگیا۔ آپؐ کو اس کی بیماری کا حال معلوم ہوا تو اس کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وقت بچے کی حالت بہت خراب تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے گا۔ آپؐ نے اس کی بھلائی کے خیال سے اسے مسلمان ہوجانے کے لئے کہا۔ بچے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس نے اجازت دے دی، تو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ آپؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا!

"سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے میری وجہ سے اسے دوزخ کے عذاب سے بچالیا۔"

ایک واقعہ جو حضورؐ سے بچوں کی محبت کا ثبوت ہے، حضرت زید بن حارثہؓ کا ہے۔ زید، حارثہ بن شرجیل کے بیٹے تھے۔ آٹھ سال کے تھے جب ان کی والدہ سعدی انہیں لے کر اپنے میکے گئیں۔ دوران سفر ان کے پڑاؤ پر ڈاکا پڑا اور قافلے کا سامان لوٹ لیا گیا۔ زیدؓ کو ڈاکو پکڑ کر لے گئے اور انہیں طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں لے جا کر بیچ دیا۔

زیدؓ کو خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انہوں نے مکے آکر زیدؓ کو اپنی پھوپھی کو دے دیا۔ جب حضورؐ کی حضرت خدیجہؓ سے شادی ہوئی تو حضورؐ نے زیدؓ کو دیکھا۔ ان کی عادتیں حضورؐ کو پسند آئیں اور انہوں نے زیدؓ کو اپنے لئے مانگ لیا۔ اس طرح خوش قسمت لڑکا حضورؐ کے ساتھ رہنے لگا۔ اس وقت زیدؓ کی عمر پندرہ برس تھی۔

کچھ عرصے کے بعد ان کے باپ اور چچا کو پتہ چلا کہ ان کا لڑکا مکے میں ہے۔ وہ اسے تلاش کرتے ہوئے رسول اللہؐ کے پاس آئے اور عرض کیا۔ "ہمارا لڑکا ہمیں دے دیں۔ آپؐ جو معاوضہ مانگیں گے ہم دینے کو تیار ہیں۔"

حضورؐ نے فرمایا۔ "میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اس کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا چاہتا ہے۔ اگر تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔

تم اسے لے جاسکتے ہو۔ لیکن اگر اس نے میرے پاس رہنا چاہا تو میں ایسا نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہے میں اسے بلاوجہ نکال دوں۔ " زیدؓ کے باپ اور چچا بول اٹھے۔ "یہ تو آپ نے انصاف سے بڑھ کر بات کی ہے۔ "

حضورؐ نے زیدؓ کو بلایا اور ان کے باپ اور چچا کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "ان کو جانتے ہو؟"

زیدؓ نے عرض کیا۔"جی ہاں ، یہ میرے باپ اور چچا ہیں۔ "

پھر حضورؐ نے پوچھا "اچھا تم ان کو پہچانتے ہو اور مجھے بھی جانتے ہو۔ اب تمہیں اختیار ہے ، چاہے ان کے ساتھ چلے جاؤ ، چاہے میرے پاس رہو۔ "

زیدؓ نے فوراً جواب دیا۔ "میں آپؐ کو چھوڑ کر کسی کے پاس جانا نہیں چاہتا۔ "

زیدؓ کے والد اور چچا یہ سن کر حیران رہ گئے اور کہنے لگے "زید! کیا تمہیں آزادی کے مقابلے میں غلامی پسند ہے؟ اپنے ماں باپ اور گھر والوں کو چھوڑ کر دوسروں کے پاس رہنا چاہتے ہو۔ "

زیدؓ نے کہا۔ "میں نے حضورؐ کے اوصاف دیکھے ہیں اس کے بعد اب میں کسی کو بھی ان پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ "

زید کا یہ جواب سن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی انہیں حضورؐ کے پاس چھوڑنے پر تیار ہوگئے یہ واقعہ حضورؐ کی نبوت سے پہلے کا ہے۔

(اس مضمون کی تیاری میں "سب سے بڑا انسان" اور "نقوش سیرت" سے مدد لی گئی)

(وضاحت: مضمون نگار نے اپنا نام نہیں لکھا۔)

اے میرے بچّو!

"تمہیں کھیلتا دیکھ کر میں اپنی تمام پریشانیاں بھول جاتا ہوں۔ تمہارے دل معصوم پرندوں کی طرح دھڑکتے ہیں۔ تمہارے چہرے سورج کی طرح چمک دار اور تمہارے خیالات میں ندیوں کی سی روانی ہے ، آہ یہ دنیا کیسی ہوتی ، اگر بچے نہ ہوتے ، جس طرح پتوں کے بغیر جنگل ، جنگل نہیں رہتا ، اسی طرح بچوں کے بغیر دنیا بھی اجڑ جائے گی ، بچوں کا پیار بھری نظروں سے ہمارے طرف دیکھنا علم اور ایجادوں سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ (لانگ فیلو)

مرسلہ ...... محمد انعام۔ کراچی

بچّے اور حیوانات

مشہود احمد فاروقی

بھالو سے کتنا پیار ہے، بچوں کو دیکھیے

بچّوں کے دل بہت نرم ہوتے ہیں، اس لیے ان کے دل میں رحم کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے رحم کا جذبہ اس وقت زیادہ اُبھر کر سامنے آتا ہے جب ان کا واسطہ بے زبانوں یعنی حیوانوں سے ہو۔ حیوانوں سے بچّوں کی محبّت کی چند ایسی مثالیں ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

مغربی ممالک میں بہت سے حیوانات

اس مخلوق کی خاطر چلنا، آہستہ آہستہ۔

کا بوجھ اُٹھانے کی سکت نہیں رکھتے تو وہ ان بچّوں کو جنگل وغیرہ میں چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلی رنگین تصویر میں دو بچّے بھالو کے ایک ایسے ہی بے سہارا بچّے کو پکڑے بیٹھے ہیں۔ ان بچّوں نے اپنے گھر پر ایسے بے سہارا حیوانات کے لیے حیوانات گھر قائم کیا ہے۔ ان بچّوں کا کہنا ہے کہ جب حیوانات کے بچّے ان کے حیوانات گھر میں رہتے رہتے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ ان کو دوبارہ جنگل میں چھوڑ آتے ہیں۔ ایسا کرنے سے انہیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔

میرا کچھوا...... کتنا پیارا

مَیں چھوٹا سَا
اِک مَینڈک ہُوں
پَر کام کروں گا
بَڑے بَڑے

پھُدک کر دور جانا ہے۔ مجھے تو کود جانا ہے

ایک ڈپلومہ ہولڈر مینڈک

سند لینی ہے۔ مجھ کو ویٹ لفٹنگ روز کرنی ہے۔

دوسری تصویر میں ایک بچی پانی کے ایک حیوان کے بچاؤ کی طرف متوجہ کرنے والے سائن بورڈ کے ساتھ موجود ہے۔ یہ حیوان اس بچی کے گھر کے پاس موجود جھیل کے اندر بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ حیوان جھیل سے نکل کر سڑک پر آجاتا ہے جس کے باعث وہ تیز رفتار گاڑیوں کے نیچے کچلا جاتا ہے۔ اس بچی نے یہ سائن بورڈ بنا کر سڑک پر لگا دیا تاکہ لوگ اسے دیکھ کر گاڑیاں آہستہ چلائیں۔ اس بچی کو یہ سائن بورڈ ڈیزائن کرنے پر حکومت کی جانب سے انعام مل چکا ہے۔ تیسری تصویر میں موجود بچہ زخمی کچھوؤں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کام میں اس کے والد اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

امریکہ میں ایک ایسا اسکول بھی موجود ہے جہاں مینڈکوں کو چھلانگ لگانے اور وزن اٹھانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ تربیتی کورس کی تکمیل کے بعد ان مینڈکوں کو باقاعدہ ڈپلوما کی سند دی جاتی ہے۔ تربیت کے بعد اکثر مینڈک اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ تین چھلانگوں میں بیس فٹ تک کود جاتے ہیں۔ ان مینڈکوں کی چھلانگوں کے باقاعدہ مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ ان مقابلوں میں بچے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

مہربانی کر کے دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں
آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰/- روپے

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲ ڈی سائٹ کراچی نمبر ۱۶

یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟

ابن انشاء

یہ بچّہ کیسا بچّہ ہے
جو ریت پر تنہا بیٹھا ہے
نہ اس کے پیٹ میں روٹی ہے
نہ اس کے تن پر کپڑا ہے
نہ اس کے سر پر ٹوپی ہے
نہ اس کے پیر میں جوتا ہے
نہ اس کے پاس کھلونے ہیں
کوئی بھالو ہے، کوئی گھوڑا ہے
نہ اس کا جی بہلانے کو
کوئی لوری ہے، کوئی جھولا ہے
نہ اس کی جیب میں دھیلا ہے
نہ اس کے ہاتھ میں پیسا ہے

نہ اس کے امّی ابوّ ہیں
نہ اس کی آپا خالہ ہے
یہ سارے جگ میں تنہا ہے
یہ بچہ کیسا بچّہ ہے

○

اس جگ میں سب کچھ رب کا ہے
جو رب کا ہے، وہ سب کا ہے
سب اپنے ہیں کوئی غیر نہیں
ہر چیز میں سب کا ساجھا ہے
جو بڑھتا ہے، جو اُگتا ہے
وہ دانا ہے یا میوہ ہے
جو کپڑا ہے جو کمبل ہے
جو چاندی ہے جو سونا ہے
وہ سارا اس بچّے کا ہے
جو تیرا ہے، جو میرا ہے
یہ بچّہ کس کا بچّہ ہے
یہ بچّہ سب کا بچّہ ہے

مرسلہ: سعدیہ چوہدری

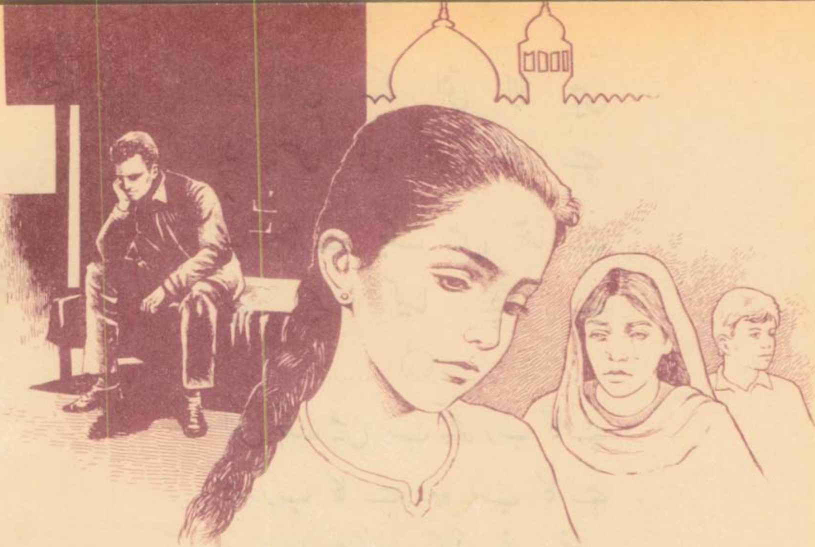

کرنیں

حمیدکاشمیری

ایک خوبصورت کھیل

(ڈرامہ)

☆

اطفال نمبر کے لئے معروف ڈرامہ نگار حمید کاشمیری نے خصوصی طور پر تحریر کیا۔

کردار:۔

- جیلا .... تقریباً دس برس کی لڑکی
- ٹونی .... چھ سات سال کا لڑکا

○ ...... امّی

○ ...... ابّو

نوٹ:۔

(یہ ڈرامہ کسی مخصوص تکنیک کے تحت نہیں لکھا گیا لیکن یہ اسٹیج پر کھیلا بھی جا سکتا ہے اور تھوڑی سی ردو بدل کے ساتھ ٹیلی ویژن کی ضروریات بھی پوری کرتا ہے)

سین نمبر۔ ۱

(ریت کا ڈھیر)

..................☆..................

گھر کی دیوار کے پاس گیلی گیلی ریت کا ایک ڈھیر پڑا ہوا ہے جیلا اور ٹونی ریت کے گھروندے بنا رہے ہیں۔ جو بنتے اور بکھرتے ہیں۔

جیلا:۔ (گھر بناتے ہوئے) دیکھو یہ کمرہ ابّو اور امّی کا۔ ٹھیک۔

ٹونی:۔ ٹھیک۔

جیلا:۔ اور یہ کمرہ تمہارا۔

ٹونی:۔ اوں چھوٹا ہے۔

جیلا:۔ (توڑ کر نیا بناتے ہوئے) لو بڑا کر دیتی ہوں۔ ٹھیک ہے!

ٹونی:۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔

جیلا:۔ اور یہ میرا کمرہ۔

ٹونی:۔ (کچھ سوچ کر بے دلی سے) چلو............ مان لیا۔

جیلا:۔ (کان پکڑ کر) مانو گے کیسے نہیں۔ خود غرض۔ تمہارا کمرہ پہلے بنایا ہے اپنا کمرہ بنانے سے پہلے۔

ٹونی:۔ (کراہتے ہوئے) ارے کان چھوڑو ناں۔ مان لیا ہے میں نے۔ مکان تو مکمل کرو۔

جیلا:۔ (بناتے ہوئے) اب بولنا نہیں بیچ میں۔ یہ ہے منّے کا کمرہ۔

ٹونی:۔ منا تو امی ابّو کے کمرے میں رہتا ہے۔

جیلا: لیکن ہمیشہ تو نہیں رہے گا ناں۔ بڑا ہو گا۔ اسے الگ کمرہ چاہئے۔

ٹونی:۔ ہاں یہ بات تو ہے۔

جیلا:۔ تیری سمجھ میں بات دیر سے آتی ہے۔

ٹونی:۔ چل چل .... بہت عقلمند نہ سمجھو اپنے کو، مکان بنا۔

جیلا:۔ ہونہہ یوں آرڈر دیتا ہے جیسے مجھے مکان بنانے کا ٹھیکہ دے رکھا ہو۔ اب نہیں بولنا بیچ میں۔

ٹونی:۔ اچھا نہیں بولوں گا۔ میری پیاری جیلا۔ بناؤ مکان۔

جیلا:۔ (بناتے ہوئے) اور یہ ہے ڈرائنگ روم۔ یہ مہمانوں کا کمرہ۔ یہ اسٹور .... یہ میرا کمرہ .... اور .... اور بس ....

ٹونی:۔ اور میرے دوستوں کا کمرہ ....؟

جیلا:۔ بھئی کافی ہے۔ دوستوں کو اپنے ہی کمرہ میں بٹھانا۔

ٹونی:۔ کنجوس مکھی چوس کہیں کی۔

جیلا:۔ تم بناؤ ناں۔ بڑے سخی ان داتا۔ دیکھتی ہوں کتنا بڑا بناؤ گے۔

ٹونی:۔ بناؤں۔؟

جیلا:۔ ہاں ہاں۔ ریت کا ڈھیر پڑا ہے سامنے۔ بناؤ۔ خرچہ تھوڑی آئے گا۔

ٹونی:۔ تو پھر دیکھو (دونوں ہاتھوں سے بنانے لگتا ہے) یہ ہے امّی ابّو کا کمرہ، یہ رہا میرا کمرہ۔ یہ ہو گیا منّے کا کمرہ۔ یہ ڈرائنگ روم۔ یہ اسٹور۔ یہ میرے دوستوں کا کمرہ .... یہ منّے کے دوستوں کا کمرہ۔ اور یہ مہمانوں کا کمرہ .... اور .... اور بس ....

(جیلا ٹونی کا کان پکڑتی ہے)

ٹونی جلدی جلدی بناتا ہے۔ ٹونی:۔ اوئی اللہ نہی نہی .... مذاق کر رہا تھا۔ (کمرہ بناتا ہے) یہ دیکھو تمہارا کمرہ تو میں نے سب سے بڑا بنایا ہے۔ اور یہ تمہاری سہیلیوں کا .... اللہ بابا معافی دے دے۔

(جیلا ٹونی کا کان چھوڑتی ہے۔)

(دونوں کھلکھلا کر ہنستے ہیں)

(سین بدلتا ہے۔)

سین نمبر۔ ۲ (لان)

☆

امی اور ابّو دونوں لان میں بہت اداس اور چپ چاپ بیٹھے ہیں اچانک جیلا اور ٹونی دوڑتے ہوئے اور قہقہے لگاتے ہوئے آتے ہیں دونوں کے پاس رنگ برنگے پھولوں کے گلدستے ہیں جو انہوں نے ہاتھوں میں پیچھے چھپا رکھے ہیں۔

جیلا:۔ ابّو بتائیں ہمارے پاس کیا ہے؟

ابو:۔ تمہارے پاس ....!

جیلا:۔ ہاں۔ ہم دونوں کے پاس۔

ابّو:۔ (سوچ کر) تم دونوں کے پاس۔ تم دونوں کے پاس پیار ہے۔ محبت ہے۔

جیلا:۔ اس کے علاوہ ابّو۔

ابّو:۔ اس کے علاوہ بہت کچھ ہے۔

جیلا:۔ نہیں .... آپ نہیں بوجھ سکے۔

ٹونی:۔ امی آپ بتائیں۔

امی:۔ تم لوگوں نے کوئی بہت اچھی چیز چھپا رکھی۔ کوئی خوبصورت چیز۔

جیلا:۔ (گلدستہ پیش کرتی ہے) یہ لیں .... خوبصورت چیز۔ گلدستہ۔

ٹونی:۔ (گلدستہ پیش کرتا ہے) اور میری طرف سے بھی۔

جیلا اور ٹونی:۔ (دونوں) مبارک ہو مبارک ہو۔

ابّو:۔ کیسی مبارک باد ہے بچو۔ کیسے پھول ہیں یہ۔

جیلا:۔ ہم نہیں بولتے۔ کیا آپ کو یہ بھی یاد نہیں کہ آج آپ کی شادی کی سالگرہ ہے۔

ابّو:۔ اوہ، ارے ہم تو بھول ہی گئے تھے۔

جیلا:۔ کھلانا پڑتا ہے ناں۔ اس لئے۔

ابّو:۔ ارے نہیں نہیں میری جان۔ جتنا مرضی ہے کیک کھاؤ۔ (سو روپے کا نوٹ نکال کر) لو بھئی بیگم۔ بہت اچھا سا کیک منگواؤ چاکلیٹ والا۔

جیلا:۔ ابّو اگر آئندہ سال آپ اپنی سالگرہ بھولے ناں تو ہم کبھی نہیں بولیں گے۔

ابّو:۔ نہیں بیٹے آئندہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ آئندہ سال ....

(ابّو کی آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں)

امی :۔ جاؤ بیٹے۔ جاؤ۔ جیلا لے جاؤ بھائی کو ہوم ورک کرواؤ۔ میں بہت اچھا سا پائن ایپل منگواتی ہوں۔

ابّو :۔ پھر ہم سالگرہ منائیں گے۔

جیلا :۔ لیکن ابّو اتنے اداس ہو کر نہیں۔ اگر سو روپے کا اتنا افسوس ہے تو رہنے دیں۔

ابّو :۔ ارے پگلی تمہاری خوشی کے لئے ایسے ایسے کئی سو قربان کر دیں۔

(پانچ سو کا نوٹ نکال کر) لو بیگم بہت بڑا کیک منگواؤ اور جیلا کی سہیلیوں اور ٹونی کے دوستوں کو بھی بلاؤ۔ لو پانچ سو روپے کا کیک بنواؤ۔

جیلا :۔ (خوش ہو کر) ابّو امی زندہ باد۔

ٹونی :۔ زندہ باد ابّو امّی۔

(دونوں ہنستے ہوئے جاتے ہیں)

(ابّو پھر اداس ہو جاتے ہیں)

ابّو :۔ (بچوں کے جانے کے بعد) میں چاہتا ہوں کہ بچوں کو بتا دیا جائے۔

امّی :۔ نہیں رفیق ٹونی بہت چھوٹا ہے۔

ابّو :۔ لیکن جیلا تو بہت چھوٹی نہیں اسے بتا دینا چاہئے۔ تاکہ اسے اچانک صدمہ نہ پہنچے اچانک ان پر پہاڑ نہ ٹوٹ پڑے۔

امّی :۔ میری ہمت نہیں پڑتی۔

ابّو :۔ تو پھر مجھے ہمت کرنی پڑے گی۔

امّی :۔ نہیں رفیق ابھی صبر کرو۔ ان کی ہنستی کھیلتی دنیا کو کچھ دن اور ہنستا کھیلتا رہنے دیں تو اچھا ہے۔

(ابّو ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہیں)

(سین بدلتا ہے)

سین نمبر۔ ۳ (ریڈنگ روم)

☆

○ سین قہقہے سے شروع ہوتا ہے۔ جیلا اور ٹونی کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں۔

ٹونی :۔ (ہنسی روک کر) کوئی اور لطیفہ سناؤ۔

جیلا:۔ اب تم سناؤ۔
ٹونی:۔ مجھے نہیں آتا کوئی لطیفہ۔
جیلا:۔ کیوں نہیں آتا۔ تمھاری عمر کے لڑکوں تو اتنی ہنسی کی باتیں یاد ہیں۔
ٹونی:۔ مجھے نہیں ہیں ناں یاد۔ تم سناؤ۔ نہیں تو میں نہیں بولوں گا۔
جیلا:۔ اچھا ناراض نہ ہو بابا سناتی ہوں مگر سچا لطیفہ سناؤں گی۔
ٹونی:۔ (سراپا گوش بن کر) سناؤ لطیفہ تو ہے ناں۔
جیلا:۔ پتا کیا ہوا آج اسکول میں پڑھائی نہیں ہوئی مس نے ایک لڑکی سے کہا کوئی اچھا سا لطیفہ سناؤ۔ اس نے سنایا پھر دوسری لڑکی نے سنایا۔ پھر تیسری نے سنایا پھر ایک اور لڑکی سے مس نے لطیفہ سنانے کو کہا تو وہ ناں اٹھ کے کھڑی ہوئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مس پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ ارے رے کیا ہوا۔ کیوں رو رہی ہو۔ تو ہچکیاں لے کر کہنے لگی۔ مس میری امی کا نام لطیفہ بیگم ہے۔"
ٹونی:۔ پھر کیا ہوا؟
جیلا:۔ پھر کیا ہونا تھا۔ لطیفہ ختم۔
ٹونی:۔ اس میں ہنسنے والی کونسی بات تھی۔
جیلا:۔ مجھے۔ کیا معلوم۔ لیکن ہنس ہنس کے لڑکیوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔
ٹونی:۔ سچ
جیلا:۔ اور کیا
ٹونی:۔ ہاہاہاہا............پھر تو ہنسنا چاہئے۔
(ٹونی کھلکھلا کر ہنسنے لگا)
(جیلا بھی ہنسنے لگی اور دونوں مل کر قہقہہ لگانے لگے)

(سین بدلتا ہے)
سین نمبر ۴ (امی ابو کا کمرہ)

☆

ابو:۔ میرا کینسر اب بہت بڑھ گیا ہے بیگم۔ اور میں اب زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکتا
امی:۔ ایسا نہ کہیں۔
ابو:۔ سنو بیگم۔ جو حقیقت ہے، وہ حقیقت ہے اور حقیقت کو زیادہ دن تک چھپایا نہیں جاسکتا۔ بچوں کے سر پر باپ

کے سائے سے بڑا سایہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ اور یہ سایہ جب ان کے سر پر سے اچانک اٹھ جائے گا تو وہ اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکیں گے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ انہیں بتادو۔ تاکہ وہ تیار رہیں۔

امّی:- لیکن .... کچھ سمجھ میں ....

ابّو:- جیلا بہت سمجھ دار ہے بیگم۔ وہ بات کو سمجھ جائے گی۔ اور اپنے انداز سے ٹونی کو بھی سمجھا سکے گی۔ اگر تم یہ کام نہیں کروگی تو میں خود جیلا کو بتادوں گا۔

امّی:- اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں جیلا کو بتادوں گی۔ لیکن میں آپ کو یہ بھی بتادوں جیلا آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔

ابّو:- اس وقت برداشت کرلے گی کیونکہ ابھی میں زندہ ہوں لیکن اچانک حادثے کی تاب شاید وہ نہ لاسکے .... میں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ قدرے بڑی ہے۔ سمجھدار ہے۔ ابھی سے ایک بات اس کے علم میں آجائے گی تو وہ دھیرے دھیرے آنے والے غم کے لئے خود کو تیار کرلے گی۔ شاباش بیگم۔ ہمت سے کام لو۔ تم ہی ان بچوں کی ماں اور تمہیں باپ ہوگی۔ جاؤ اور جیلا کو بتادو۔

(امّی آبدیدہ ہو جاتی ہے)

(سین بدلتا ہے)

سین نمبر۔ ۵ (ریڈنگ روم) رات

☆

○ ..... جیلا اپنے اسکول کی کتابیں کھولے ہوم ورک کرنے میں مصروف ہے۔

امّی دبے قدموں ان کے پاس کھڑی ہوتی ہے۔ جیلا انہماک سے پڑھ رہی ہے۔

جیلا:- (چونک کر) اوہ امی .... آپ۔

امّی:- ہاں بیٹے میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا۔

جیلا:- نہیں امی۔ بس میں اٹھنے ہی والی تھی۔ کافی رات ہوگئی ہے۔

امّی:- ٹونی سوگیا ہے کیا۔؟

جیلا:- جی امی .... وہ اتنی دیر تک کہاں جاگ سکتا ہے۔ آپ کیسے آئی ہیں .... خیریت ہے ناں ؟

(امی کرسی قریب کرکے بیٹھ جاتی ہے۔)

امّی:- جیلا بیٹے .... میں کئی دونوں سے تم سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی ..... لیکن ....

جیلا:۔ تو پھر کیوں نہیں کی امی۔ کیا بات ہے۔

امیؔ:۔ بات یہ ہے بیٹے کہ .... وہ ....

جیلا:۔ کیا بات ہے امی .... آپ بات کرتے کرتے رک کیوں گئیں۔

امیؔ:۔ کئی بار بات کرتے کرتے رکی ہوں بیٹے۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔

جیلا:۔ کیوں امی ایسی کیا بات ہے۔

امیؔ:۔ جو بات میں کہنا چاہتی ہوں۔ وہ بات کہنے کی ہمت نہیں پڑھتی ہے بیٹی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں کس طرح کہوں۔ سخت مشکل میں ہوں۔

جیلا:۔ مجھے بتائیں امی۔ شاید میں آپ کی مشکل حل کر سکوں۔

امی:۔ نہیں بیٹی۔ تمہارے بس میں نہیں ہے۔

جیلا:۔ میرے بس میں ہے امی۔ مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔

امی:۔ نہیں بیٹے تمہیں نہیں معلوم جب تمہیں معلوم ہو گا تو ....

جیلا:۔ (بات کاٹ کر) امی .... مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔

امی:۔ (حیرت سے) کیا کہنا چاہتی ہوں؟

جیلا:۔ آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ابو مر جائیں گے۔

امی:۔ (تڑپ جاتی ہے) جیلا بیٹی۔

جیلا:۔ لیکن امی .... آپ کو نہیں معلوم میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔

امی:۔ (دم بخود ہو کر) کیا بیٹی؟

جیلا:۔ ابو زندہ رہیں گے۔

امی:۔ (عجیب و غریب کیفیت میں) جی ی ی ی لا !!!! جیلا۔

جیلا:۔ ہاں امی .... یہ ابو ہی کا دیا ہوا سبق ہے کہ آدمی کو نا امید کبھی نہیں ہونا چاہئے اور میں نا امید نہیں ہوں میرے ابو زندہ رہیں گے۔ ہمارے ابو۔

امی:۔ اوہ جیلا بیٹی۔

(امی جیلا کو اپنے بازوؤں میں لے کر گلے سے لگالیتی ہے)

(ختم شد)

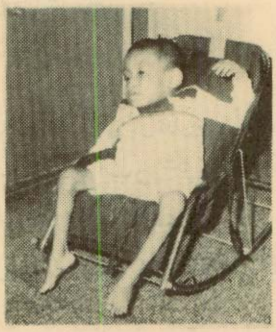

یہ خوبصورت دنیا ان کی بھی ہے

شام یوسفی

یہ جو ہماری خوبصورت دنیا ہے، جس میں پھول کھلتے ہیں تتلیاں اڑتی ہیں. سورج چاند اور ستارے روشن رہتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور کبھی بارش رم جھم کرتی ہے۔ ہم سب اس سے کتنا خوش ہوتے ہیں، کتنا لطف اٹھاتے ہیں۔ کبھی امی یا ابو کے ساتھ باغ میں جائیں تو کس قدر لطف آتا ہے۔ تتلیوں کے پیچھے دوڑنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ اور کبھی ساحل پر جانے کا موقع ملے تو بس مزا ہی آجاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ریت کے گھروندے بناتے رہیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ چمکیلی ریت اور ٹھنڈے پانی میں دیر تک کھیلتے رہیں اور لطف اٹھاتے رہیں۔

پھر دوستوں کے ساتھ اسکول میں پڑھائی کا مقابلہ کرنے، کسی تقریر یا مضمون نگاری کے مقابلے میں حصہ لینے، ڈرائنگ یا گیت سنانے کے مقابلے میں شریک ہونے یا پھر کھیل کے میدان میں اپنے من

پسند کھیل کے مقابلے میں حصہ لینے میں جو تفریح ملتی ہے اس کا تو ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ جماعت میں اول آنے کے لئے سخت محنت کرنا یا دوڑ کے مقابلے میں سب سے آگے رہنا۔ زندگی کی سچی خوشیاں جدوجہد کے ان چھوٹے بڑے مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہیں۔

لیکن یہ سب عام بچوں کی دنیا کی باتیں ہیں۔ وہ بچے جو سوچتے سمجھتے ہیں، دیکھتے اور سنتے ہیں، چلتے ہیں اور دوڑتے ہیں اور جو بات کہی جاتی ہے اسے بالکل ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتے ہیں۔ اسی دنیا میں ایک دنیا ایسے دوستوں کی ہے، جو سوچنے اور سمجھنے کی قوت نہیں رکھتے، جو دیکھ نہیں سکتے اور جو سن نہیں سکتے۔ اور جو باتوں کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکتے۔

یہ دنیا معذور یا ذہنی پس ماندہ بچوں کی دنیا ہے، جن کے لئے زندگی کی خوشیاں یا تو بہت کم ہیں یا پھر بالکل نہیں ہیں۔ کیونکہ انہیں زندگی کی نعمتوں، اور اس دنیا کی رونقوں کا احساس ہی نہیں ہے۔

"احساس" تو آپ سمجھتے ہیں نا؟

بھئی یہ "احساس" ہی تو ہے جو کبھی دل کو خوشیوں سے بھر دیتا ہے اور کبھی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی رونے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ جو ساتھی صبح سویرے اٹھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جلدی اٹھنے پر تازگی کا احساس، دل کو کیسے کھلا دیتا ہے۔ امتحان میں اول آنے پر جی چاہتا ہے کہ آسمان پر اڑا جائے۔ یہ خوشی کے احساس کی انتہا ہے۔

جن دوستوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ ذہنی پس ماندہ یا جسمانی طور پر معذور ہوتے ہیں۔ ذہنی پس ماندہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا دماغ ان کے جسم کے مطابق ترقی نہیں کرتا۔ جسم تو بڑھتا رہتا ہے۔ دماغ ایک جگہ ٹھہر جاتا ہے یا بہت آہستہ..... بہت آہستہ بڑھتا ہے۔ دیکھنے میں لگے گا کہ اس دوست کی عمر ۱۳ سال ہے لیکن اس کا دماغ ۳ سال کے بچے کے برابر ہوگا اور آپ جانتے ہیں کہ تین سال کا بچہ بالکل نا سمجھ ہوتا ہے۔

دوسری طرف ایسے دوست ہیں جو پیدائشی طور پر کسی جسمانی معذوری کا شکار ہوتے ہیں۔ یا تو وہ دیکھ نہیں سکتے یا وہ سن نہیں سکتے۔ یا بول نہیں سکتے۔ بعض بچے بچپن میں کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ٹانگوں سے یا ہاتھوں سے معذور ہو جاتے ہیں۔

ذہنی پس ماندہ یا جسمانی طور پر معذور بچے پوری دنیا میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ اندازہ ہے کہ پوری دنیا میں ذہنی طور پر معذور لوگوں کی تعداد ۳ فیصد ہے۔ پاکستان

میں تقریباً ۳۰ لاکھ افراد ذہنی معذور ہیں۔ ان میں سے ۱۳ لاکھ ۵۰ ہزار بچے ہیں۔ بچوں میں ایک دن کی عمر سے ۱۴ سال تک کے بچے شامل ہیں۔

ان ساڑھے تیرہ لاکھ بچوں میں سے صرف ۳۳ ہزار ۷ سو ۵۰ بچے ایسے ہیں جو اسکول جاتے ہیں۔ باقی بچوں کے لئے اسکول کی سہولت ابھی موجود نہیں ہے۔

ان دوستوں کو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔ کسی کے گھر میں کسی تقریب میں یا آس پڑوس میں۔ ممکن ہے کہ آپ کے کسی دوست کا بھائی یا بہن ایسے بچوں میں شامل ہوں۔

یہ ننھے منے ساتھی، جو ہماری آپ کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ دراصل کسی نہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض بچے اپنی ظاہری حالت سے پہچان لئے جاتے ہیں کہ یہ عام بچوں کی طرح نہیں ہیں ایسے بچوں کی رال بہتی رہتی ہے یا ان کے چہرے کی بناوٹ میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے یا پھر ان کے چلنے، پھرنے، دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ "مختلف" ہیں۔

ان کے مقابلے میں بعض بچے ایسے ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بالکل عام بچوں جیسے نظر آتے ہیں لیکن اصل میں وہ عام بچے نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ بچے مرگی کے مریض ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں بالکل ٹھیک لگتے ہیں لیکن اس مرض کی وجہ سے ان کے دماغ کی ترقی پوری طرح نہیں ہو پاتی۔ یہ بچے باتیں کرتے ہیں سنتے ہیں چلتے پھرتے ہیں لیکن ان کا دماغ ان کے جسم کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ وقاص حسین ایک ایسے ہی ساتھی ہیں۔ ان کی عمر ۱۲ سال ہے لیکن ان کا دماغ ۳ سال کے بچے کے برابر ہے۔ اس مرض میں جسم کو جھٹکے لگتے ہیں اور مریض زمین پر گر کر تڑپنے لگتا ہے۔ وقاص حسین بہت چنچل ہیں۔ ٹک کر ایک جگہ نہیں بیٹھے ہر وقت کسی کام میں لگے رہنا چاہتے ہیں۔

کچھ بچے ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں جسے "منگول ازم" کہا جاتا ہے۔ ان کے قد چھوٹے رہ جاتے ہیں چہرہ سوجا سوجا لگتا ہے۔ بول نہیں سکتے اور دماغ کی ترقی رک جاتی ہے۔ اپنا کام خود نہیں کر سکتے ہیں۔ بہت محنت کی جائے تو بہت تھوڑی سی باتیں، بہت مشکل سے سیکھ پاتے ہیں۔شہزاد ملباری کی عمر چھ سال ہے۔

کچھ ننھے منے ساتھی ایسے ہوتے ہیں، جو پیدا ہوتے ہیں تو بالکل عام بچے کی طرح ہوتے ہیں لیکن بعد میں کسی بیماری کی وجہ سے ان کی صحت اور ذہن پر اثر پڑتا ہے اور دماغ کی پرورش رک جاتی ہے یا بہت کم رہ جاتی ہے۔ فہیم احمد چھ ماہ کی عمر تک بالکل ٹھیک تھے۔ عام بچوں کی طرح قلقاریاں مارتے تھے۔ بھوک لگتی

تھی : گلا پھاڑ کر روتے تھے۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ انہیں ایک دن سخت بخار آگیا اور یرقان ہو گیا اس بیماری نے ان کے ذہن کو متاثر کیا۔ دوسری غلط بات یہ ہوئی کہ اس بیماری میں ان کی دیکھ بھال صحیح طرح نہ ہو سکی۔ یہ سب باتیں ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئیں پانچ سال تک انہوں نے بولنا نہیں سیکھا چھ سال کے ہو گئے تب بھی نہ خود سے کھاتے تھے اور نہ بول پاتے تھے۔ سوتے تھے یا سو کر اٹھتے تھے تو ان کے جسم کو جھٹکے لگتے تھے اور یوں نظر آتا تھا جیسے دماغ اور پورے جسم کی رگیں کھنچ رہی ہوں اور اکڑ رہی ہوں۔ دماغ کی رگوں کے کھنچنے سے ان کا ذہن متاثر ہوا۔ اب یہ ایک خاص اسکول میں جاتے ہیں اور امید ہے کہ علاج جاری رہا تو تین سال میں بولنے لگیں گے۔

ایک اور بیماری جو بچوں کے ذہن کو متاثر کرتی ہے "آٹزم" کہلاتی ہے یہ بچے بہت زیادہ ذہنی معذور ہوتے ہیں۔ نہ بولتے ہیں نہ خوشی یا رنج کا اظہار کرتے ہیں۔ نہ ان میں سوچنے کی قوت ہوتی ہے نہ بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے بچوں کی اپنی علیحدہ دنیا ہوتی ہے جس میں یہ گم سم رہتے ہیں۔ ہمیں ابھی تک اندازہ نہیں کہ ان دوستوں کی دنیا کیسی ہے۔ نہ یہ اپنی بے چینی ظاہر کر پاتے ہیں نہ مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ بس ان کا رویہ اجنبیوں کا سا ہوتا ہے۔ یا کبھی ایسی ناراضگی کا جس کی وجہ سے دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا۔ اس مرض کے بچے عام طور پر بڑے پھرتیلے بظاہر ٹھیک ٹھاک اور اکثر خوبصورت ہوتے ہیں اس لئے انہی پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔

یہ بدنصیب دوست جو ذہنی یا جسمانی طور پر معذور ہوتے ہیں۔ ہم سب کی توجہ کے حقدار ہیں۔ ان سے نہ توڑنا چاہئے اور نہ ان سے الگ تھلگ رہنا چاہئے۔ ان کے ساتھ بہت پیار کا اور دوستی کا سلوک کرنا چاہئے تاکہ جہاں تک ہو سکے یہ بھی اس رنگ برنگی دنیا کی خوشیوں میں تھوڑا بہت حصہ لے سکیں۔ اپنے ان دوستوں کو بھولیئے نہیں۔ یاد رکھئے۔ جب آپ بڑے ہو جائیں تب بھی ان کا خیال رکھنے کی کوشش کیجئے گا۔ ان کے لئے کوئی ایسا کام کیجئے گا جس سے ان کو کوئی سہولت پہنچ سکے۔

ایسے بچوں کے اسکول ہوتے ہیں لیکن وہاں انہیں عام بچوں کی طرح تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ ہر بچہ کو اس کی ضرورت کے مطابق سکھایا جاتا ہے۔ یہ اسکول "اسپیشل اسکول" یا "خاص اسکول" کہلاتے ہیں۔ یہاں جو اساتذہ ان بچوں کو سکھاتے ہیں وہ بھی خاص قسم کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

کیا پتا آپ میں سے کوئی بڑے ہو کر ایسا ہی خاص بنے جو ان خاص دوستوں کو زندگی گزارنے کی تربیت دے سکے۔

ترجمہ: عاصم

نو عمر سائنسدان

جنہوں نے اپنی عمر سے بڑی ایجادات کیں

مختلف کلاسوں سے تعلق رکھنے والے یہ بچّے اپنی ان ایجادات کے ساتھ کھڑے ہیں جن کو بنانے پر انہیں گولڈ میڈل اور واشنگٹن ڈی سی آنے جانے کا ٹکٹ بطور انعام دیا گیا۔

○ ...... یہ بچّی تیسری جماعت کی طالب علم ہے۔ اس بچی نے بلّی کے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے ایک ایسی بوتل بنائی ہے جس میں ۳ نپل لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح سے بیک وقت ۳ بلی کے بچوں کو دودھ پلایا جا سکتا ہے۔

○ ...... کمرے کو گرم رکھنے کے لئے اس بچے نے ایک سستا اور اچھا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اس نے المونیم کے ڈبوں کو ایک لائن میں رکھ کر ان پر کالا رنگ کر دیا جس کی وجہ سے یہ سورج کی روشنی اچھی طرح جذب کر لیتے ہیں اور خوب گرم ہو جاتے ہیں۔ ایک پنکھے کی مدد سے ان ڈبوں کے پاس سے ہوا گذاری جاتی ہے جو ان کے پاس سے گذر کر گرم ہو جاتی ہے۔ پائپوں کے ذریعے گرم ہوا کو مطلوبہ جگہ پہنچا دیا جاتا ہے۔

○ ...... امریکہ میں معذور افراد کی گاڑیوں کے لئے پارکنگ علیحدہ بنائی جاتی ہے جس میں دوسرے افراد کو گاڑی پارک کرنا منع ہوتا ہے۔ اس بچے نے ایک ایسا آلہ بنایا ہے جس کی مدد سے معذوروں کی پارکنگ میں غیر متعلقہ افراد کی پارکنگ کو ناممکن بنایا جا سکتا ہے۔

ہوتا دراصل یوں ہے کہ جیسے ہی کوئی گاڑی معذوروں کی پارکنگ میں گاڑی پارک کرتا ہے ایک سائرن بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سائرن ایک مخصوص قسم کے کارڈ سے بند ہوتا ہے جو صرف معذور افراد کے پاس ہوتا ہے۔

○ ...... تصویر میں بچہ جو ساز بجا رہا ہے اس کا نام سیلو ہے۔ یہ ساز زمین پر لٹکا کر بجایا جاتا ہے۔ بجانے کے دوران یہ وزن کی وجہ سے آگے کی طرف کھسک جاتا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اس بچے نے ایک اسٹینڈ بنایا ہے جو بجانے والے کی کرسی میں لگا دیا جاتا ہے۔ اس اسٹینڈ میں متعدد سوراخ بنے ہوتے ہیں جس میں سیلو کی نوک پھنسا دی جاتی ہے جس کی وجہ سے سیلو آگے پیچھے حرکت نہیں کر پاتا ہے۔

○ ...... کنڈر گارٹن میں پڑھنے والی اس بچی نے چھوٹے بچوں کے ایک مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک مشین بنائی ہے۔ چھوٹے بچے الٹے اور سیدھے پاؤں کے جوتوں میں فرق نہیں کر پاتے ہیں اور یوں وہ الٹے پاؤں کا جوتا سیدھے میں اور سیدھے پاؤں کا جوتا الٹے پاؤں میں پہن لیتے ہیں۔ یہ مشین دونوں جوتوں کو الگ الگ کر کے پہچان کو آسان بنا دیتی ہے۔

مُوجد بچّے۔ کتنے اچھے

پارکنگ کا مسئلہ حل کر دیا۔

اُلٹے سیدھے جُوتوں کی اب اس سے پہچان کریں۔

انوکھی سی بوتل بنائی ہے مَیں نے۔

ایسا آلہ جس سے کمرہ گرم ہو۔

باندھ کر رکھ دیا، مَیں نے اس ساز کو۔

سات دن کی حکومت

شاہنواز فاروقی

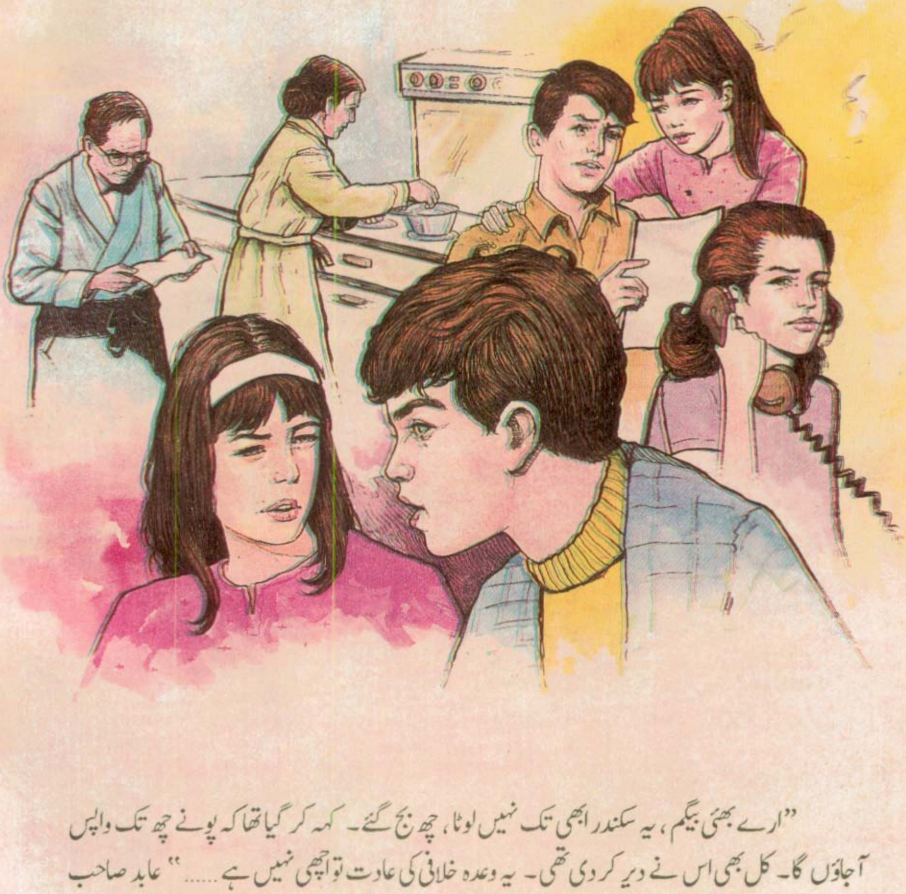

"ارے بھئی بیگم، یہ سکندر ابھی تک نہیں لوٹا، چھ بج گئے۔ کہہ کر گیا تھا کہ پونے چھ تک واپس آجاؤں گا۔ کل بھی اس نے دیر کر دی تھی۔ یہ وعدہ خلافی کی عادت تو اچھی نہیں ہے......" عابد صاحب نے اپنی بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔

بیگم نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بس دھیرے سے بڑبڑا کر رہ گئیں۔ عابد صاحب کا خیال تھا کہ وہ مزاج کے اعتبار سے ایک بااصول اور اس سے بھی زیادہ نظم و ضبط کے پابند شخص ہیں۔ یہ بات وہ اپنے بچوں کے سامنے اکثر دہراتے تھے۔ ان کے چار بچّے تھے۔ اسرار، روبینہ، سکندر اور شازیہ۔ اسرار اور روبینہ اپنی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ اسرار آج کل نوکری کی تلاش میں تھا اور روبینہ گھر پر رہ کر اپنے

خیال میں گھر کے کاموں میں اپنی امی کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ اس کے بر عکس ان کی امی کا خیال تھا کہ وہ کاموں میں ہاتھ بٹانے کے بجائے ٹانگ اڑاتی ہیں۔ امی کے بقول روبینہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد پر پرزے نکالے تھے۔ ورنہ جب تک وہ کالج میں تھی تب تک وہ واقعی امی کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ سکندر اور شازیہ ایک ہی اسکول میں دسویں اور نویں کے طالب علم تھے۔

اسرار اور روبینہ ابّو کے قریب تھے اور سکندر اور شازیہ امّی کے۔ ابّو کی طرح اسرار اور روبینہ کا بھی اپنے بارے میں یہی خیال تھا کہ وہ بہت بااصول اور نظم و ضبط کے انتہائی پابند ہیں۔ اس لئے وہ سکندر اور شازیہ کو ہر وقت نظم و ضبط کی تلقین کرتے اور ان پر اپنا حکم چلاتے رہتے تھے۔ اس معاملے میں انہیں ابو کی حمایت حاصل رہتی تھی۔ ان کی امی یہ سخت گیری دیکھتیں تو بھڑک اٹھتیں۔

"ہاں ہاں بس تم اور تمہارے ابو ہی نظم و ضبط کے پابند ہیں، باقی لوگ تو جیسے جنگل سے آئے ہیں......"

"امی جنگل میں رہنے والوں کے اندر بھی نظم و ضبط پایا جاتا ہے" روبینہ جواب دیتی۔

"ہاں ہاں ہم تو کوڑا کرکٹ ہیں۔ اجی سن رہے ہیں آپ؟ آپ کی اولاد کیا کہہ رہی ہے۔" عابد صاحب گھر پر ہوتے تو وہ انہیں مخاطب کر کے کہتیں۔ سکندر اور شازیہ بھی یہ احکامات سنتے سنتے عاجز آچکے تھے اور چڑ کر اسرار کو پراسرار بھائی اور روبینہ باجی کو پودینہ باجی کہنے لگے تھے۔

یہ بات نہیں تھی کہ عابد صاحب بچوں میں فرق کرتے تھے۔ سب بچوں سے انہیں ایک جیسا پیار تھا۔ ان کی ہر جائز خواہش کو پورا کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس مقولے پر یقین رکھتے تھے کہ اولاد کو کھلاؤ سونے کا لقمہ مگر دیکھو شیر کی نظر سے۔ اس پر ان کی بیگم کہتیں۔

"جی ہاں شیر کی نظر سے دیکھنا چاہئے، آدم خور شیر کی نظر سے نہیں۔"

ان ہلکی پھلکی جھڑپوں کے علاوہ گھر کا ماحول پر سکون رہتا تھا اور گھر کے سب لوگ ایک درسرے سے محبت کرتے تھے۔ محبت کے ایسے لمحات میں وہ ایک دوسرے سے خوب خوب بحث کرتے تھے۔ آزادی کے ساتھ، بے فکری کے ساتھ اور اپنائیت کے ساتھ۔

ایک مرتبہ سکندر اور شازیہ کے اسکول میں "بچّوں کا دن" منایا گیا۔ اس دن کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اسکول کا تمام کام استادوں کے بدلے طلبہ انجام دیتے ہیں۔ اس میں اسکول کے نظم و ضبط کی دیکھ بھال۔ کلاسیں لینا، غرضیکہ تمام کام شامل ہوتے ہیں۔ سکندر کو اس دن اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنایا گیا۔ سکندر نے اسکول کے تمام کاموں کا ایک خاکہ بنا کر تمام کام اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیئے۔ اور خود کڑی نظر سے تمام معاملات کی نگرانی کرتا رہا۔ تمام ساتھیوں کے تعاون سے سکندر نے وہ دن نہایت

کامیابی کے ساتھ گزار دیا۔ اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے نہ صرف یہ کہ اس کی زبانی طور پر بہت تعریف کی بلکہ اسے ایک تعریفی سند سے بھی نوازا۔

سکندر اس دن بہت خوش تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ابّو، بڑے بھائی اور بڑی بہن کا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ وہ نظم و ضبط کا پابند نہیں ہے اور نہ وہ اپنے ساتھ رہنے والوں کو اس کا پابند بنا سکتا ہے۔ شازیہ بھی اس روز بہت خوش تھی۔ جیسے سکندر کی تعریف اس کی اپنی تعریف تھی۔

اس روز شام کی چھٹی کے بعد دونوں شور مچاتے ہوئے گھر پہنچے۔ اور تفصیل کے ساتھ اپنے کارنامے امّی کو سنائے۔ امّی کے چہرے پر سوواٹ کا بلب روشن ہو گیا۔ انہوں نے دونوں کو باری باری سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔

رات کو کھانے پر امی نے سکندر اور شازیہ کے کارنامے بیان کرنے شروع کئے۔

"تو کیا اب اسکول کا معیار اتنا گر گیا ہے کہ سکندر اس کا ہیڈ ماسٹر بن جائے۔" اسرار بھائی نے فقرہ اچھالا۔

"تو آپ کیا سمجھتے ہیں میں ایسا نہیں کر سکتا؟ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو گھر چلا کر دکھادوں" سکندر نے پر جوش لہجے میں کہا۔

"آپ سے سائیکل تو چلتی نہیں بھلا گھر کیا چلے گا؟" روبینہ باجی نے بھی پنجے نکالے۔

"سائیکل چلا سکتا ہوں یا نہیں، مگر گھر ضرور چلا سکتا ہوں" سکندر نے چمچے سے اپنی پلیٹ میں پڑے آلو کو دو ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم ایک ہفتے تک گھر چلا کر دکھاؤ" اسرار نے یونہی ایک تجویز پیش کی۔

"بھئی آئیڈیا تو اچھا ہے" ابو جو اب تک خاموشی سے یہ بحث سن رہے تھے بولے۔ "یعنی سکندر اور شازیہ مل کر ایک ہفتے تک گھر چلائیں۔ شاید اسی طرح یہ نظم و ضبط کے پابند ہو سکیں۔"

"ہم اس کے لئے تیار ہیں، مگر ہماری ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ گھر کے خرچ سمیت تمام امور ہمارے ہاتھ میں ہونگے۔ گھر میں کسی بھی کام کے لئے ہم سے اجازت لی جائے گی اور سب کو ہمارے حکم کی پابندی کرنی ہوگی، بالکل ویسے ہی جیسے اب ہم سے ہر حکم کی پابندی کرائی جاتی ہے۔"

اسرار اور روبینہ کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ سکندر اور شازیہ اگر گھر کا انتظام چلائیں گے تو تمام امور ان کے ہاتھ میں ہونگے۔ یہاں تک کہ وہ حاکم بن جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس تجویز کی

مخالفت کی۔ لیکن بالآخر طویل بحث کے بعد سکندر کی تجویز مان لی گئی۔ اور یوں آئندہ سات دن یعنی ایک ہفتے کے لئے گھر پر دو چھوٹے بچوں یعنی سکندر اور شازیہ کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حاکم محکوم اور محکوم حاکم بن گئے۔

اگلی صبح روبینہ کی آنکھ کھلی تو اس نے سرہانے ایک پرچہ پڑا دیکھا۔ پرچے پر "ہدایت نامہ" کی سرخی جمی تھی اس کے اور نیچے یہ درج تھا۔

(۱) کل سے آئندہ ایک ہفتے تک صبح کا ناشتہ امی کے بجائے آپ تیار کریں گی۔

(۲) گھر کی تمام صفائی بھی آپ کی ذمہ داری ہوگی۔

(۳) ایک دن میں اپنی صرف دو سہیلیوں کو فون کریں۔ اور دس منٹ سے زیادہ باتیں نہیں ہونی چاہیں۔"

(۴) اس ہفتے آپ ایک بار بھی بیوٹی پارلر نہیں جائیں گی۔

(۵) وسی آر پر ہفتے میں صرف ایک فلم دیکھی جائے گی۔

(۶) ضرورت کے تحت دوسری ہدایت دی جاتی رہیں گی۔

روبینہ کا تو خون کھول اٹھا۔ دل چاہا کہ ان دونوں کی ٹھکائی کر دے۔ مگر یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان کے ہر حکم پر عمل کیا جائے گا۔ ورنہ ایک حکم نہ ماننے پر ان کی حکمرانی میں مزید ایک دن کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ خیال کر کے روبینہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

اسرار بھائی کے نام چار نکاتی ہدایت نامہ جاری ہوا۔

(۱) شام چھ بجے تک گھر پہنچیے۔

(۲) چونکہ یہ میوزک سینٹر نہیں ہے اس لئے ڈیک پر مدھم آواز سے کیسٹ سنئے۔

(۳) اس ہفتے اپنے کپڑے خود دھوئیے۔

(۴) دن میں صرف دوبار بنی بنائی چائے ملے گی۔ اگر اس سے زیادہ کی طلب ہو تو اپنی چائے خود بنائیں۔

اسرار نے کاغذ کو ٹکڑے کو پڑھتے ہی پھاڑ کر پھینک دیا اور کمرے کی دیوار پر زور سے ٹھوکر ماری۔ جوگر پہنے ہونے کے باوجود ان کے پاؤں کا انگوٹھا ٹھک گیا۔

امی کو دونوں بچوں نے اپنا مشیر مقرر کیا۔ مشیری کے علاوہ ان کے ذمے دو کام تھے۔ اوّل یہ دیکھنا

کہ ان کی ہدایات پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں اور دوم دوپہر اور رات کا کھانا بنانا۔ سکندر اور شازیہ نے آئندہ ایک ہفتے کے کھانوں کی پوری تفصیل لکھ کر امی کو فراہم کر دی تھی۔ جس میں مرغن کھانوں کے بجائے دالوں اور سبزیوں پر زور تھا۔

بچوں کی حکمرانی کے ہفتے کے پہلے روز عابد صاحب شام کو دفتر سے گھر آئے تو انہوں نے اپنی میز پر ایک چٹ رکھی دیکھی۔ جس پر لکھا تھا۔

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ سگریٹ پینا صحت کے لئے انتہائی مضر ہے۔" عابد صاحب پیغام کا مطلب سمجھ گئے۔

سکندر اور شازیہ کے احکامات پر سختی کے ساتھ عمل در آمد شروع ہو چکا تھا۔ صبح دس بجے تک سونے کی عادی روبینہ باجی صبح چھ بجے اٹھ کر ناشتے کی تیاری کرتیں اور پھر گھر کی صفائی میں مصروف ہو جاتیں۔ ان کی عادت تھی کہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ اپنی چند قریبی سہیلیوں کو لمبے لمبے فون کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی گھر کے ٹیلی فون کا بل کسی صحت مند بل کی طرح ہوتا تھا۔ روبینہ باجی اس بل کا ذمہ دار ہمیشہ دوسروں کو ٹھہراتیں۔ مگر اب وہ دن میں صرف دو فون کر سکتی تھیں اور وہ بھی صرف دس منٹ کے لئے۔ بچوں کی حکمرانی کے آغاز کے دوسرے دن انہوں نے اپنی عزیز دوست نوشابہ کو فون کیا تو گھڑی سامنے رکھ لی۔ جیسے ہی پانچ منٹ گزرے انہوں نے نوشابہ سے فون بند کرنے کی اجازت چاہی۔

"خیریت تو ہے؟" نوشابہ نے پوچھا۔

"بس کچھ نہیں" روبینہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسی طرح کی کچھ باتیں دوسری سہیلیوں کے ساتھ بھی ہوئیں۔ نتیجتاً دو دنوں میں ان کی سہیلیوں کے حلقے میں ان کے بارے میں بڑی تشویش ناک خبریں گشت کرنے لگیں۔ سب کی رائے تھی کہ روبینہ کنجوس ہو گئی ہے۔

بیوٹی پارلر نہ جانے کا خیال روبینہ کے ذہن پر اس بری طرح سوار ہوا کہ اس نے فرض کر لیا کہ اس کے بال انتہائی خراب ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے منہ پر ہر روز مہاسوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نتیجہ وہ دن میں جب تک دس بار آئینہ نہیں دیکھ لیتی تھیں، انہیں سکون نہیں ملتا تھا۔

اسرار بھائی نے زندگی میں پہلی بار کپڑے دھوئے تو انہیں بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ انہیں کپڑے دھوتے ہوئے بالکل ویسا ہی احساس ہوا جیسا ایک بار بچپن میں کلاس کے اندر مرغا بننے پر ہوا تھا۔

چوتھے روز وہ گھر سے باہر اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں ایسے کھوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

"میرے خدا پونے چھ بج گئے...... " اچانک اسرار نے گھڑی کی جانب دیکھا کر پریشانی کے ساتھ کہا۔

"کیا ہوا بھئی...... " کسی دوست نے پوچھا۔

"یار چھ بجے تک گھر پہنچ جانا ہے ورنہ "

"ورنہ " ان کے دوست نے تجسّس کے ساتھ پوچھا۔

"ورنہ ایک دن مزید بڑھ جائے گا۔ " اسرار یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ اپنی موٹر سائیکل کی طرف لپکے۔

"ایک دن مزید بڑھ جائے گا......؟ " ان کے تمام دوستوں کے منہ سے نکلا۔ ان سب کے چہروں پر حیرت کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔

"اسرار ٹھیک چھ بجے گھر پہنچ گئے۔ " اس سے قبل وہ عام طور پر رات کو گیارہ بجے گھر پہنچتے تھے۔ چونکہ اب وہ پڑھائی سے فارغ ہو چکے تھے اور امکان تھا کہ انہیں جلدی ہی کوئی اچھی سی نوکری مل جائے گی اس لئے ان کے ابو دیر سے گھر آنے پر انہیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ سکندر اس بات کو شدت سے محسوس کرتا تھا کہ اس کے دس منٹ دیر سے گھر آنے پر ابو اسے ڈانٹ دیتے ہیں مگر اسرار بھائی کے اتنی دیر سے آنے پر بھی انہیں کچھ نہیں کہا جاتا۔

سکندر کے ابو نے گھر میں سگریٹ پینی چھوڑ دی تھی۔ اس باعث ان کے سر میں درد رہنے لگا تھا اور ان کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔

دوپہر اور رات کے کھانے میں اب گوشت کی ڈشوں کے بجائے دال سبزی کی ڈشیں ہوتی تھیں۔ روبینہ اور اسرار دونوں وقت کے کھانے پر اتنے برے منہ بناتے جیسے وہ کھانا نہیں زہر کھا رہے ہوں۔ کھانے پر سب لوگ خاموش رہتے اور سر جھکائے کھانے میں مصروف رہتے۔ کھانے کے بعد خاموشی سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں کا رخ کرتے۔ رات دس بجے پورے گھر میں سناٹے کا راج ہوتا۔ سکندر اور شازیہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اگلے دن کے منصوبے بناتے۔

ہفتے کے پانچویں دن صبح کو سکندر کے ابو نے دفتر جاتے ہوئے سکندر کی امی سے کہا کہ رات کو تین

افراد کا اضافی کھانا تیار کرلیں۔ اس رات ان کے دفتر کے تین دوست ان کے گھر پر تاش کھیلنے آنے والے تھے۔ پہلے بھی بے شمار مرتبہ ایسا ہوتا رہا تھا۔ سکندر نے اپنے ابو کی بات سن لی۔ وہ تیزی کے ساتھ اندر گیا اور اس نے ایک چٹ پر لکھا۔

"شریف گھرانوں میں تاش کھیلنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

یہ چٹ اس نے شازیہ کے ذریعہ ابو کو پہنچا دی۔ چٹ پڑھتے ہی ابو بھڑک اٹھے۔

"میاں صاحب زادے تمہاری شرط منظور کر کے ہم نے بڑی بھیانک غلطی کی ہے۔ تم نے تو ہم سب کا جینا ہی حرام کر دیا ہے۔ یہ نہیں ہوگا، وہ نہیں ہوگا۔ یہ ٹھیک نہیں، وہ ٹھیک نہیں۔ بس بہت ہوا یہ مذاق، ختم ہوئی تمہاری حکمرانی۔"

"مگر آپ نے ایک ہفتے کا وعدہ کر رکھا ہے اور آپ نے یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ اگر کوئی ہمارے حکم پر ایک مرتبہ عمل نہیں کرے گا تو ہماری حکمرانی میں مزید ایک دن کا اضافہ ہو جائے گا۔ آپ اخلاقی طور پر مزید دو دن تک ہماری حکمرانی میں رہنے کے پابند ہیں۔"

عابد صاحب کا دل چاہا کہ بڑھ کر صاحب زادے کے ایک چپت لگائیں مگر وہ واقعی وعدہ کر چکے تھے۔ چنانچہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ دفتر جا کر انہوں نے دوستوں کو پروگرام کے ملتوی ہونے کی خبر سنائی۔ دوستوں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہہ دیا کہ آج بیوی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں اس لئے کھانے کا بندوبست نہیں ہو سکے گا۔ دوستوں کو اس بات کا یقین نہ آیا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا کہ سکندر کی امی کی طبیعت خراب تھی مگر ان کے یہاں تاش کھیلنے کا پروگرام ہوا تھا۔

اس دوپہر کو بُوا نصیرن سکندر کی امی کے پاس آئیں۔ بوا نصیرن کپڑا فروخت کرتی تھیں۔ خاص طور پر شادیوں کے جوڑوں میں استعمال ہونے والا کپڑا۔ پچھلے ڈیڑھ برس سے سکندر کی امی ان کی مستقل گاہک تھیں۔ وہ اپنی بڑی بیٹی روبینہ کا جہیز تیار کر رہی تھیں۔ اس بار بوا نصیرن کئی عمدہ ساڑیاں لے کر آئی تھیں۔ سکندر کی امی کو ساڑیاں بہت پسند آئیں۔

"تو پھر کتنی لے رہی ہیں آپ؟" بوا نصیرن نے سکندر کی امی سے پوچھا۔

"اے بہن میرے چھوٹے بچے پانچ بجے تک آجائیں گے ان سے پوچھ کر بتاؤں گی۔" سکندر کی امی کے منہ سے ایسی بات نکل گئی جو وہ ہرگز نہیں کہنا چاہ رہی تھیں۔

"کیا کہہ رہی ہو بہن۔ ساڑیوں کے بارے میں سکندر اور شازیہ سے پوچھو گی؟" بوا نصیرن نے

پان بھر ا منہ کھول کر پوچھا۔

"سکندر کی امی گھبرا گئیں اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ معاملے کو کس طرح درست کریں۔ ان کے چہرے کے تاثرات نے بوانصیرن کو اور تجسّس میں مبتلا کر دیا۔

"آخر بات کیا ہے بہن؟" انھوں نے سکندر کی امی کے قریب آکر ان کے ہاتھ پر ہاتھ دھرتے ہوئے پوچھا۔ سکندر کی امی نے جھجکتے ہوئے انہیں ساری بات بتا دی۔ شاید یہ باتیں ان کے لئے بھی بوجھ بن گئی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر بوانصیرن کا منہ اور کھل گیا۔ اور وہ اتنی دیر تک کھلا رہا کہ اس میں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی دو مکھّیاں داخل ہو گئیں۔ بوانصیرن کو دھکا لگ گیا اور ان کی پیک کے چھینٹے ان کی لائی ہوئی ساڑیوں پر گر پڑے۔ بیچاری بوا نے فوراً ہی انہیں رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔

سکندر کے گھر سے فارغ ہو کر بوانصیرن محلے کے کئی اور گھروں میں گئیں۔ شام تک محلے کے تمام گھروں میں سکندر کے گھر کی عجیب و غریب کہانی پہنچ چکی تھی۔ جس نے سنا حیرت کا اظہار کیا۔ کسی نے قہقہہ لگایا، کسی نے فقرہ کسا۔ سب گھروں کے بڑے لوگوں نے اس خبر سے خوب لطف لیا۔ مگر ہر گھر میں پوری کوشش کی گئی کہ ان کے کسی بھی بچے کو اس خبر کی بھنک نہ لگے۔ چنانچہ یہ خبر صرف بڑوں کی دنیا میں گشت کرتی رہی۔ اب محلے کے بڑے افراد کو سکندر کے گھر کا جو فرد بھی نظر آتا وہ اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیتے۔

سات دن بعد بچوں کی حکمرانی طے شدہ معاہدے کے مطابق ختم ہو گئی۔ روبینہ باجی اور اسرار بھائی نے ایک دوسرے کو مٹھائی کھلائی۔ اسرار بھائی نے اس دن چار بار چائے پی، پوری آواز سے ڈیک پر گانے سنے اور رات کو ایک بجے گھر لوٹے۔ روبینہ باجی نے دو درجن سے زیادہ فون کئے اور رات کو چکن تکّے کھانے کے بعد وی سی آر پر تین فلمیں دیکھیں۔ وہ اتنی خوش تھیں کہ بیوٹی پارلر جانا بھول گئیں۔

دو ماہ بعد ایک دن شام کے وقت جب سکندر چھ بجے تک آنے کا کہہ کر ساڑھے چھ بجے تک گھر نہ لوٹا تو اس کے ابّو نے ان کی امّی سے کہا۔

"بھئی یہ سکندر چھ بجے تک آنے کا کہہ گیا تھا۔ ساڑھے چھ بج گئے ہیں مگر وہ ابھی تک نہیں لوٹا۔ خیر میں خود دیکھتا ہوں۔" عابد صاحب نے یہ کہا اور سکندر کو بلانے کے لئے گھر کے قریب واقع ہاکی گراؤنڈ کی طرف چل پڑے۔ سکندر کی امی نے یہ دیکھا تو مسکرا دیں۔ وہ تشویش اور غصّے کا فرق خوب پہچانتی تھیں۔

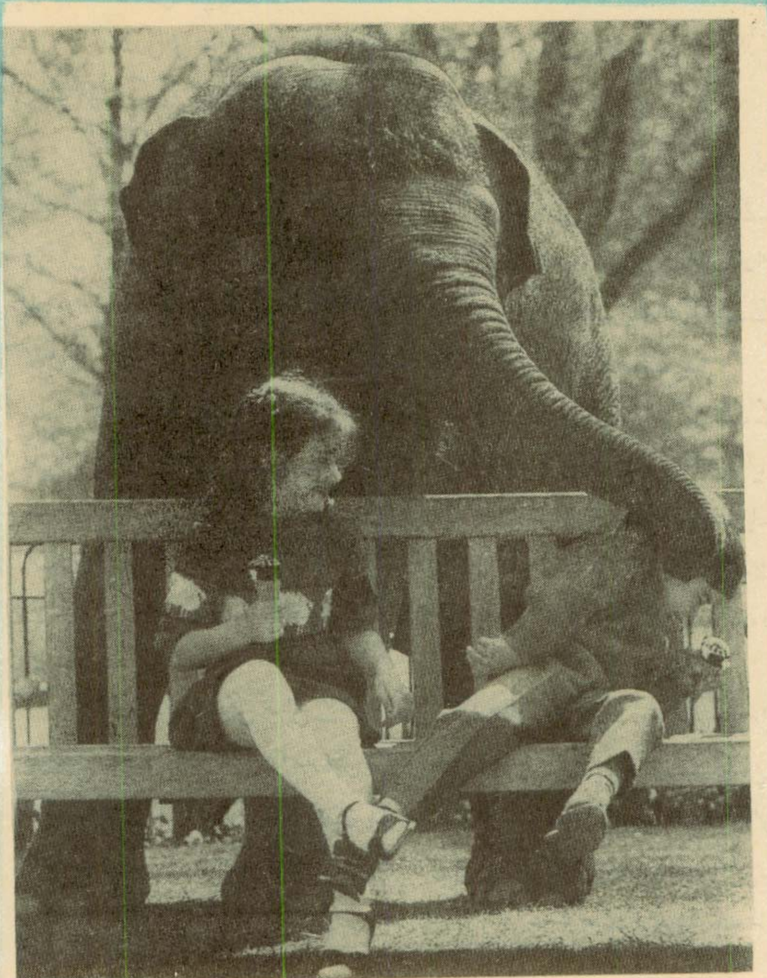

نہیں کرو ناں! گدگدی ہوتی ہے۔

ڈنڈا ڈولی

اس ماہ سے موضوعاتی
لطائف کا سلسلہ
ختم کیا جا رہا ہے
آئندہ ماہ سے
منتخب لطائف
شائع
کئے جائیں گے۔

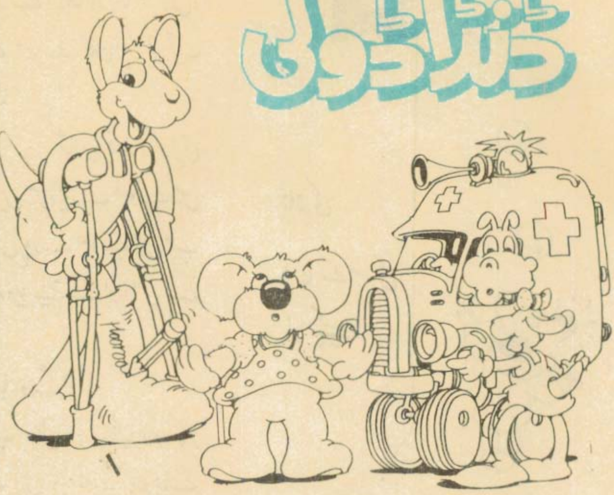

انعامی لطیفہ

مشہور مزاح نگار مارک ٹوئین نے ایک استقبالئے میں تقریر کرتے ہوئے بتایا:
"میرے بچپن کا زمانہ مفلسی کا زمانہ تھا۔ ہم لوگ اس قدر غریب تھے کہ اپنے گھر کی حفاظت کے لئے ایک کتا بھی نہیں رکھ سکتے تھے چنانچہ رات کو جب کوئی آہٹ سنائی دیتی تو ہمیں خود ہی بھونکنا پڑتا تھا۔

مرسلہ:- عاصم شہزاد خان

ایک عورت کے پڑوس میں کسی کا انتقال ہو گیا وہ وہاں گئی اور خوب بین کیا۔ جب وہ وہاں سے واپس آئی تو گھر میں سب بچے رو رہے تھے عورت بولی! "چپ ہو جاؤ کمبختو" تو ایک بچہ غصے میں بولا "اماں خود تو دوسروں کے گھر جا کر رو لیتی ہو اور ہمیں اپنے گھر میں بھی نہیں رونے دیتیں۔"

جنید اختر۔ کراچی

ایک لڑکا میدان میں کھڑا پتنگ اڑا رہا تھا۔ اس کے مانجھے سے ایک بچے کا کان کٹ کر کہیں کا کہیں جا گرا وہ تو پتنگ چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا اور بچہ اپنا کٹا ہوا کان ڈھونڈنے لگا۔ وہاں سے ایک اور بچہ گزرا جو کہ پہلے بچے کا دوست تھا اس نے پوچھا "یار کیا کر رہے ہو تم" تو پہلے بچے نے پوری بات بتا دی، چنانچہ بچے کا دوست بھی کان ڈھونڈنے لگا کچھ دیر بعد وہ ایک کان لے کر اپنے دوست کے

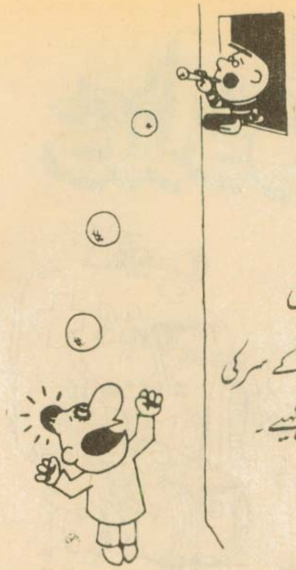

پاس پہنچا اور بولا "لو اسی کو تلاش کر رہے تھے نا تم" اس نے کان کو غور سے دیکھا اور کہا "نہیں! یہ میرا کان نہیں ہے میرے کان پر تو ایک پینسل اٹکی ہوئی تھی"۔

شازیہ غفار، کراچی

ایک بچے نے آٹھویں میں پورے صوبے میں ٹاپ کیا اور پھر دسویں میں پورے صوبے میں ٹاپ کیا اخبار نویس اس کا انٹرویو لینے گئے اور اس سے سوال پوچھے۔

"تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟"

لڑکا خاموش رہا جب سوال دہرایا گیا تو وہ پھر خاموش رہا۔ باپ نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! شرماتے کیوں ہو۔ بتا دو تم بڑے ہو کر کیا بنو گے۔"

لڑکے نے شرماتے ہوئے کہا "میں بڑا ہو کر دولہا بنوں گا۔"

(شہلا عنبرین ...... ڈیرہ اسماعیل خان)

ایک بوڑھے شخص نے ایک دروازے پر دستک دی اندر سے ایک لڑکا باہر آیا ان دونوں کے درمیان کچھ یوں گفتگو ہوئی۔

بوڑھا۔ "بیٹا! گھر پر تمہارے ابو ہیں۔"

بچہ۔ "جی نہیں وہ دفتر گئے ہوئے ہیں۔"

بوڑھا۔ "اچھا تو امی ہوں گی۔"

بچہ۔ "جی وہ پڑوسن کے گھر گئی ہیں۔"

بوڑھا (کچھ غصے سے) "تو کوئی بڑا بھائی ہو گا۔"

بچہ۔ "جناب وہ کرکٹ کھیلنے گئے ہیں۔"

بوڑھا (مزید غصے میں) "تو کوئی بڑی بہن بھی نہیں ہوگی۔"

بچہ - "جناب وہ اپنی سہیلی کے گھر گئی ہیں۔"

بوڑھا۔ "تو آخر تم گھر میں کیا کر رہے ہو؟"

بچہ - (معصومیت سے) "میں تو خود اپنے دوست کے گھر کیرم کھیلنے آیا ہوں۔"

یاسمین ناز، کراچی

امی نے طاہر کو لیٹے دیکھ کر پوچھا۔ "تمہارے امتحان شروع ہونے والے ہیں اور تم ہو کہ رات

دن سوتے رہتے ہو۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "امی! ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ تم اس وقت ہی پاس ہو سکتے ہو جب دن رات ایک کر دو۔"

ثاقب اسلام، کراچی

بچوں کی کلاس میں ایک مس نے پوچھا کہ "پاکستان کی کل آبادی کتنی ہے" ایک چھوٹے سے بچے نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ میں نے اسے جواب دینے کے لئے کہا تو بچے نے کہا "ساڑھے دس کروڑ اور ایک۔"

مس نے کہا کہ ساڑھے دس کڑور تو ٹھیک ہے۔ مگر ایک کا کیا مطلب ہے"

بچے نے جواب دیا "مس میرا ایک چھوٹا بھائی آج ہی پیدا ہوا ہے۔"

ثمرین آفتاب۔ لاہور

ایک بچہ دوسرے بچے سے (خوش ہو کر) "میں۔نے سنا ہے کہ تم دوسرے بچوں سے یہ کہتے ہو کہ میں بہت ذہین اور عقل مند ہوں۔"

دوسرا بچہ :۔ "ارے بھائی تمہیں تو پتہ ہے مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔"

راجہ بشیر۔ کراچی

اسکول میں تین بچے پڑھتے تھے جو کہ بھائی بھائی تھے۔ انسپکٹر نے معائنے کے دوران میں سب سے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

"تمہارے دوسرے بھائیوں کی تو مونچھیں

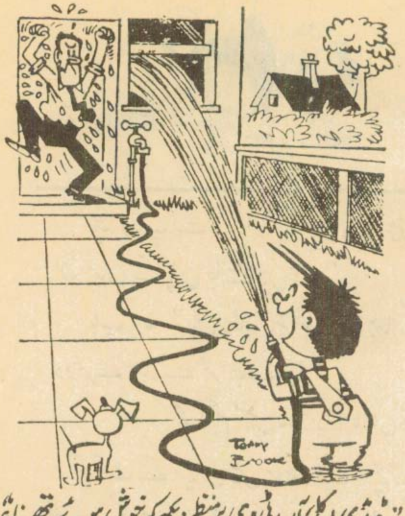

"ڈیڈی! کل آپ ٹی وی پر منظر دیکھ کر خوش ہوئے تھے نا"

نہیں ہیں۔ تمہاری کیوں ہیں؟ جبکہ تم دونوں سے چھوٹے بھی ہو؟۔"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ "جناب میری شکل میرے باپ پر ہے اور ان دونوں کی شکل ماں پر۔"

ذیشان احمد۔ کراچی۔

بچہ :۔ (اپنی باجی سے) "باجی بارش کا یہ سارا پانی کہاں جاتا ہے؟۔"

باجی :۔ (جو غصے میں تھیں) "میرے سر میں۔"

بچہ :۔ (جلدی سے) "اس لئے آپ کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے۔"

عرفان خالد آرائیں۔ ماڑی پور کراچی

بچہ (باپ سے) "ابو کیا ہم جہاز میں بیٹھ کر اللہ میاں کے پاس جا سکتے ہیں؟۔"

باپ:۔ "ہاں بیٹا۔ بشرطیکہ ہمارا جہاز کسی دوسرے جہاز سے ٹکرا جائے۔!"

محمد انجم مبین۔ ڈیرہ اسماعیل خان

کرکٹ کے میدان میں موجود ایک بچے نے غصے سے آسمان کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا "یہاں میرے علاوہ بھی کم از کم ۱۵ ہزار لوگ اور بچے ہیں اور کبوتر صرف ایک ہے لیکن اس واہیات کو مجھ پر ہی بیٹ کرنا تھی۔"

سفیان ناصر۔ کراچی

ایک گھر میں کسی آدمی نے فون کیا۔ ریسیور بچے نے اٹھایا تو آدمی نے پوچھا کہ کیا تمہارے والد گھر پر ہیں۔ بچے نے جواب دیا نہیں۔ کیا اور کوئی ہے جس سے بات کر سکوں۔ ہاں میری ایک بہن ہے بچے نے کہا۔ اچھا اسے ہی بلاؤ۔

معاف کریں بچے نے کہا میں اس کو جھولے میں سے نہیں اٹھا سکتا۔

ن۔ ب۔ کوہاٹ

جب ننھی کی نانی ان کے ہاں آئی تو دوسرے دن ننھی نے پوچھا۔ "نانی جان کیا آپ آرٹسٹ (فنکارہ) ہیں۔؟"

نانی اماں نے جواب دیا "نہیں بیٹی مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔"

ننھی بولی۔ "وہ امی ابو کہہ رہے تھے کہ اب بڑھیا آگئی ہے اور یہاں روز نیا ڈرامہ ہوا کرے گا۔"

(نائلہ بختیار۔ کوہاٹ)

اسکول ٹیچر نے بچوں کو نیوٹن کا واقعہ سناتے ہوئے کہا! ایک دن نیوٹن باغ میں سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ اس کے سر پہ ایک سیب گرا اور یوں اس نے کشش ثقل کا اصول دریافت کیا۔"

پھر اس نے بچوں سے پوچھا۔

آپ نے اس بات سے کیا سبق سیکھا؟

ایک بچہ بولا، یہی کہ اسکول سے غائب ہونا کتنی اچھی بات ہے۔ اگر نیوٹن اس دن اسکول گیا ہوتا تو یہ اصول کبھی دریافت نہ ہوتا۔

(احمد فہد صدیقی ...... اسلام آباد)

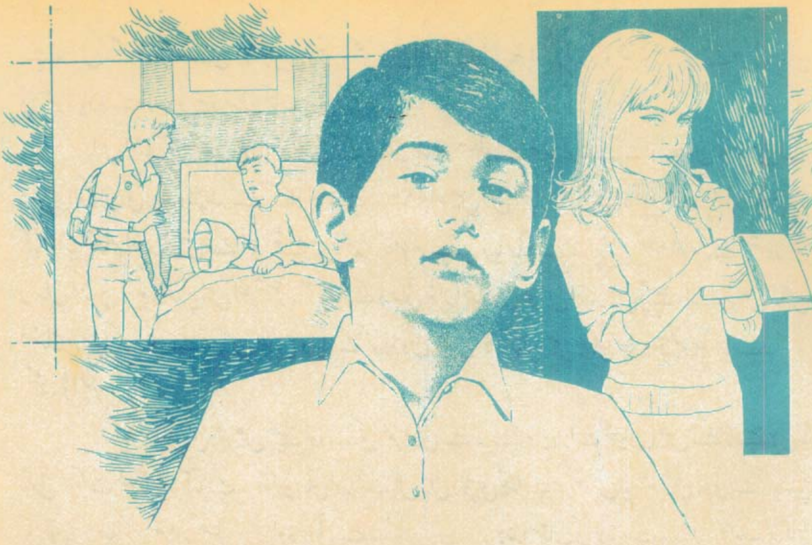

محمد عمران قادر

بچوں کے کارنامے

بچے..................!! جنہیں ہمیشہ "بچہ" کہہ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ جنہیں کمسن سمجھ کر کبھی خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ جنہیں بڑے کارناموں کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ یہ مضمون انہی بچوں کے متعلق ہے۔ کیوں کہ انہی بچوں نے ایسے ایسے زبردست کارنامے انجام دیئے ہیں، جو مشکل سے یقین میں آنے والے ہیں۔

تو آیئے انہی بچوں کے بارے میں آپ کو بتاتے ہیں..................!!!

بچوں نے اخبار نکالا

"چلڈرن ایکسپریس" ایک امریکی اخبار ہے۔ جو ۱۹۷۵ء میں جاری ہوا تھا۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ اخبار بچے خود تیار کرتے ہیں۔ جی ہاں! یہ دنیا کا واحد اخبار ہے جسے خود بچے تیار کرتے ہیں۔ اور وہی اسے چھاپتے ہیں۔ اس اخبار کے ایڈیٹر سے لے کر رپورٹر تک، سارا عملہ بچوں پر مشتمل

ہے۔ اس کے تمام مضامین اور خبریں وغیرہ بھی اس اخبار کے ایڈیٹر اور رپورٹر وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ جن کی عمر زیادہ سے زیادہ تیرہ سال تک ہوتی ہے۔

اس اخبار کا مقصد بچوں کو تفریح کے ساتھ ساتھ معلومات مہیا کرنا ہے۔ اور بڑوں کو بچوں کے مسائل اور ان کی پسند و ناپسند سے آگاہ کرنا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اس اخبار کے ایک کالم پر اسے پولٹزر انعام دیا گیا۔ یہ انعام اخبار نویسی کے کسی شعبے میں عمدہ کام کرنے پر دیا جاتا ہے۔ اپریل ۱۹۸۳ء سے مشہور خبر رساں ایجنسی "یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل" دنیا کے ڈھائی ہزار اخباروں کو اس اخبار میں چھپنے والے خاص خاص مضامین مہیا کر رہی ہے۔ اس طرح دنیا کے کروڑوں بچوں کا آپس میں بھائی چارہ قائم ہو گیا ہے۔

ننھا ڈاکٹر

گیارہ سال کی عمر میں کھیلنے کودنے کی عمر ہوتی ہے۔ بچے دن رات کھیلوں میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی کرکٹ کھیلتا نظر آتا ہے۔ تو کوئی ہاکی اور فٹ بال میں دلچسپی لیتا ہے۔ غرض یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ بچے کی توجہ پڑھائی پر کم اور کھیل پر زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن .... ہندوستان کی ریاست مدراس کا ایک لڑکا بالا مرلی کرشنا ہے۔ جس کی عمر صرف گیارہ سال ہے۔ آپ کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ وہ ایک غیر معمولی بچہ ہے جو اتنی کم عمری میں ڈاکٹر بن جائے گا۔ جی ہاں !!! ڈاکٹر...... وہ بی ایس سی کے فائنل ائیر میں داخل ہو گیا ہے۔

غالباً وہ دنیا کا سب سے کم عمر ڈاکٹر ہو گا جس وقت اسے ڈاکٹری کی ڈگری ملے گی۔ اس کی عمر ۱۷ سال ہوگی۔

بالا مرلی کرشنا ویلور میں پیدا ہوا تھا۔ جب وہ تین سال کا تھا تو اس کا خاندان نیویارک چلا گیا تھا۔ اس کے والد ڈاکٹر مرلی موہن راؤ ایک صنعتی مشیر اور والدہ گومتی، نیویارک کے ایک کالج میں ریاضی کی ٹیچر ہیں۔ اس کا بڑا بھائی جیا کرشنا جس کی عمر ۱۸ سال ہے۔ پری میڈیسن مکمل کر چکا ہے۔ اور آج کل نیویارک میں ایم۔ ڈی اور پی ایچ ڈی کے مشترکہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہاں تو جب بالا مرلی کرشنا تین سال کا تھا تو اس کے والدین نیویارک چلے گئے۔ وہاں وہ چھ سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوا۔ صرف دو ماہ میں اس نے پہلی کلاس کا امتحان پاس کر لیا۔ اسکول میں داخل ہوئے تیسرا سال تھا کہ اس نے تیسری اور چوتھی جماعتوں میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔ اور پھر پانچویں سے ساتویں کلاس میں چھلانگ لگا دی۔ جب وہ نویں کلاس میں تھا اس وقت اس کا داخلہ "اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک" کے گفٹڈ میتھمیٹکس پروگرام میں ہو گیا۔ اب اس نے ریاضی میں اپنی صلاحیتیں بڑھانی شروع کیں۔ یہ پروگرام جان ہوپکنز یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ اس کو کالج کے اس پروگرام میں بھی داخلہ مل گیا جس میں ہائی

اسکول کے بچوں کو اسکول کی تعلیم کے علاوہ کالج کی سطح کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ بالا نے یہاں بھی پوری دلچسپی لی۔ اور کالج بورڈ نے اسے کامیاب قرار دیا اس کامیابی کے بعد اسے اختیار مل گیا کہ وہ جو شعبہ چاہے اپنے لئے منتخب کرلے۔ چنانچہ اس نے اپنے لئے طب کا شعبہ پسند کیا۔ بہرحال اس سے پہلے اسے ایک پری میڈیسن پروگرام میں حصہ لینا ہو گا جس کے بعد اسے میڈیکل اسکول میں داخلے سے پہلے ہی فرسٹ ڈگری مل جائے گی۔

شطرنج، فٹ بال اور باسکٹ بال کھیلنا۔ اور ڈاک ٹکٹ جمع کرنا اس کے محبوب مشاغل ہیں۔ بالا اور اس کے بھائی جیا نے ڈھائی سال کی مسلسل محنت کے بعد ایڈز کی بیماری پر ایک کتاب "ایڈز .... ایک سچی کہانی" لکھی جو جنوری ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ دونوں بھائی ہندوستانی طالب علموں کے لئے ریاضی کے پروگرام تیار کر رہے ہیں۔ جیا نظام اعصاب پر کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ ریاضی کی مدد سے ایک ایسا ماڈل تیار کرے گا جس میں دکھایا جائے گا کہ دماغ کیسے کام کرتا ہے۔

ایک اسرائیلی لڑکے ایوی بنز نے گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق اٹھارہ سال تین ماہ کی عمر میں اطالوی میڈیکل اسکول سے ڈگری لی تھی۔ بالا یہ ریکارڈ توڑ دے گا اور صرف سترہ سال کی عمر میں طب کی ڈگری حاصل کرلے گا۔ دونوں بھائیوں نے اپنی کامیابی کے بارے میں اپنی سخت محنت اور استقلال کے علاوہ اللہ کی مدد اور اپنے والدین کی سرپرستی کا دخل بتایا۔ اور کہا۔ "مستقبل میں ہم کوئی ایسا کام کریں گے جو ہمیں نوبل انعام کا حقدار قرار دلوائے۔"

نو عمر موسیقار

دنیا میں ایک موسیقار ایسا بھی گزرا ہے جس نے صرف تین سال کی عمر میں موسیقی کے فن پر عبور حاصل کرلیا تھا، اس کا نام وولف گانگ موزارٹ تھا اور جو مشہور عالم موسیقار تھا۔ وہ ۱۷۵۶ء میں پیدا ہوا۔ اس نے تین سال کی عمر سے ہی موسیقی میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ پانچ سال کی عمر میں چھوٹی چھوٹی دھنیں ترتیب دینا شروع کردیں۔ سات سال کی عمر میں اس نے یورپ کا دورہ کیا اور اپنی موسیقی سے لوگوں کو محظوظ کیا۔ تیرہ سال کی عمر میں اس نے روم میں اپنی معرکہ آرا دھنیں ترتیب دیں۔ اور پوپ سے "نائٹ" کا خطاب پایا تھا۔ اس کا انتقال صرف ۳۵ سال کی عمر میں ۱۷۹۱ء میں ہوا۔

بچوں کو پیٹنا منع ہے

سویڈن میں بچے کی پٹائی قانوناً جرم ہے اور والدین کسی بھی بات پر اپنے بیٹے یا بیٹی کی پٹائی نہیں کرسکتے۔

غلام بچہ
جس نے آزادی کی شمع روشن کی۔

یہ ۱۸۳۰ کی بات ہے بالٹی مور نامی قصبے میں فریڈرک نام کا ایک بچہ رہا کرتا تھا جس کی عمر ۱۲ سال تھی۔ یہ بچہ غلام تھا۔ صبح سے شام تک اپنے گورے آقاؤں کی خدمت کرنا اس کا کام تھا۔ ایک دن اس نے اپنے آقا کو کسی سے یہ کہتے سن لیا کہ "لکھنا اور پڑھنا غلاموں کو نہیں سکھانا چاہئے کیونکہ اس طرح وہ اپنے حقوق اور آزادی کی اہمیت سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور غلامی سے نجات کے چکر میں لگ جاتے ہیں۔"

اس بات نے فریڈرک کو علم کی اہمیت سے روشناس کرایا اور اس نے عہد کیا کہ وہ لکھنا اور پڑھنا ضرور سیکھے گا۔ اس نے اپنے آقا کے بچوں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسے چوری چھپے لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

رات کو جب سب سو جاتے تو وہ دن میں سیکھے ہوئے سبق کو خوب محنت سے یاد کرتا جب اسے کتابیں پڑھنا آ گیا تو اس نے (THE COLUMBIAN ORATOR) نامی کتاب نہ صرف پڑھنا شروع کی بلکہ اس میں موجود تقاریر کو زبانی یاد کرنا بھی شروع کر دیا

غلام بچہ جس نے آزادی کی شمع روشن کی

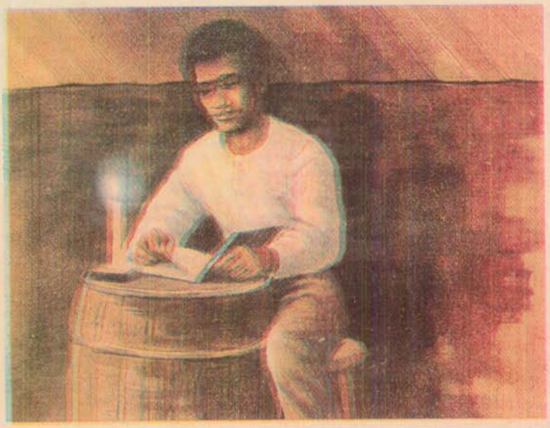

ان تقاریر کو پڑھ کر اسے انسانی حقوق کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں معلوم ہوا۔ ۲۰ سال کی عمر میں وہ نیو یارک چلا گیا جو اس وقت ایک آزاد ریاست تصور کی جاتی تھی۔ یہاں اس نے آزادی کی امنگ رکھنے والے غلاموں کی بنائی ہوئی ایک تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی۔

یہاں اس کی ولولہ انگیز تقاریر اور اخبار نے غلاموں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ۱۸۶۰ء میں ہونے والی خانہ جنگی کے دوران اس نے امریکہ کی پہلی BLACK ARMY قائم کی۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد اگرچہ تمام غلام آزاد ہو گئے لیکن اس نے انسانیت کی خدمت اور انسانی حقوق کی جدوجہد کو جاری رکھا۔ ۷۷ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ اسے آج بھی انہی حقوق کے لئے چلائی جانے والی مہم کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

(شعبہ تحقیق و تلاش ماہنامہ آنکھ مچولی)

ہدایت

محمّد بن مالک

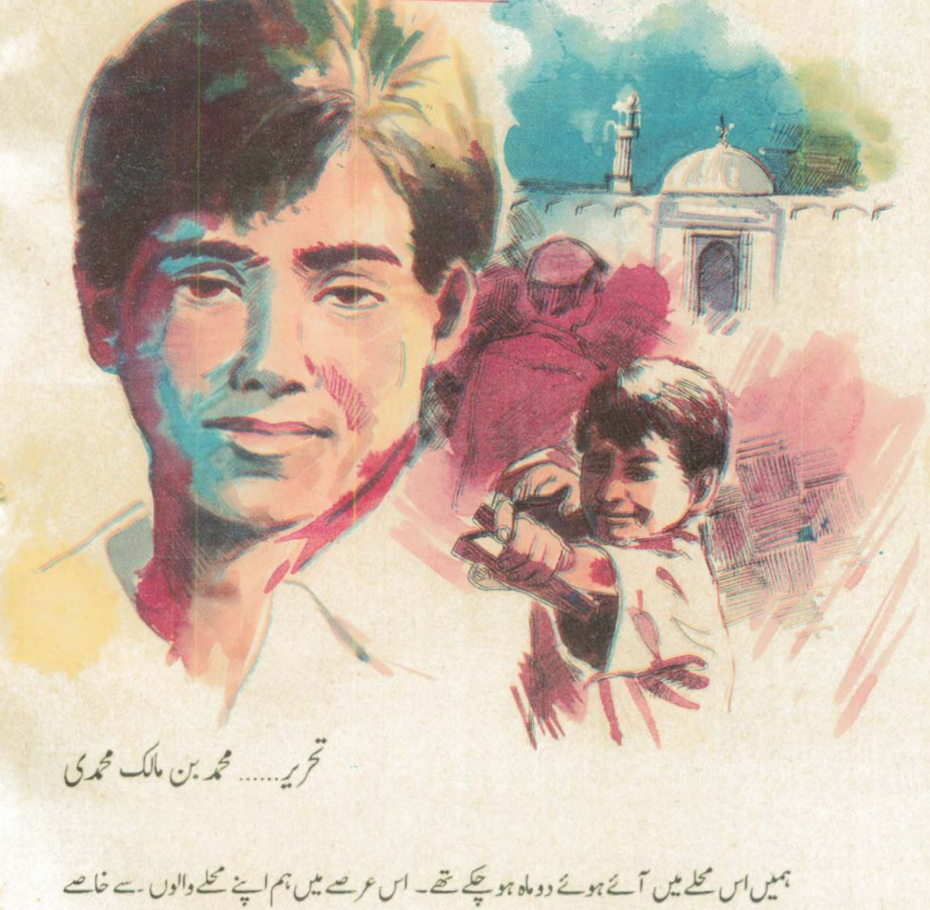

تحریر...... محمد بن مالک محمدی

ہمیں اس محلے میں آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں ہم اپنے محلے والوں سے خاصے گھل مل گئے تھے۔ یوں تو ہمارے تمام پڑوسی خاصے شریف اور ایماندار تھے مگر ان کے بچے......! توبہ، توبہ شیطان کے پتلے تھے۔ گرمیوں کا موسم، اوپر سے دوپہر کا وقت، کڑکڑاتی اور چلچلاتی ہوئی دھوپ، ایسے وقت میں کون ہو گا جو باہر نکل کر اپنا مغز تپائے گا۔ سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ آفت کے پر کالے بچے ہاتھوں میں غلیل لئے چاروں طرف گھومتے رہتے۔ کبھی کسی کی کھڑکی کا شیشہ توڑا، کبھی محلے کے واحد کھمبے میں لگا ہوا اکلوتا مرکری بلب غائب کر دیا۔ کبھی کسی چڑیا کو مارا تو کبھی بلی

کے بچوں کو اپنے ستم کا نشانہ بنایا۔ غرض یہ کہ سبھی محلے والے ان کی حرکتوں سے تنگ اور نالاں تھے۔ شب برات کے موقع پر تو ان بچوں نے حد ہی کر دی۔ عین کڑکتی دوپہر کے وقت کہیں سے کتے کا ایک پلا پکڑ لائے اور لگے اس کو ستانے۔ ایک شیطان نے آگے بڑھ کر اس کی دم سے جلتی پھلجھڑی باندھ دی اور جب کتے کی دم جلنا شروع ہوئی تو اس نے وہ چیخیں ماریں کہ سب محلے والے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور اس کارنامے میں شریک اپنے اپنے بچوں کو پکڑ کر گھروں میں لے گئے۔ پھر ان کی وہ تواضع فرمائی کہ انھوں نے آئندہ کے لئے شرارتوں سے توبہ کر لی۔

مگر رضوان عرف "ولیمہ" (جو کہ اپنے آپ کو چار بھائیوں کا اکلوتا بھائی کہتا تھا۔) وہیں جما کھڑا رہا۔ نہ اس کے گھر سے کوئی اس کو لینے آیا اور نہ کسی اور نے اس کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ کتنا اکھڑ اور بدمزاج ہے، ہمیشہ ہر معاملے میں اپنی من مانی کرتا ہے اور کسی کی نہیں سنتا۔ اس کے گھر والے بھی اسے لاکھ مار پیٹ چکے تھے، سمجھا چکے تھے۔ مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا اور چکنا گھڑا ہی رہا۔ یہاں تک کہ انھوں نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا کہ جو کرتا ہے کرتا رہے۔ کسی دن کوئی زبردست ٹھوکر لگے گی تو خود ہی سدھر جائے گا۔

رضوان کی یہ عرفیت "ولیمہ" اس طرح پڑی کہ آس پاس میں جہاں بھی کوئی محفل یا تقریب منعقد ہوتی تو وہ اس میں ایسے گھس جاتا، جیسے وہ تقریب اس کے اپنے گھر میں ہو رہی ہو۔

گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ ماہ رمضان آنے میں تین چار دن باقی تھے۔ اس دفعہ رمضان المبارک ماہ جون میں پڑ رہا تھا۔ گرمی کی وجہ سے لوگ کم ہی باہر نکل رہے تھے۔ میں بھی اپنے کمرے میں بیٹھا چھٹیوں کا کام کر رہا تھا کہ اچانک فضاء میں اذان کی آواز گونجی۔ ظہر کا وقت تھا۔ میں نے کام کرنا بند کر دیا اور مسجد جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ابھی گھر سے تھوڑا ہی دور گیا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ رضوان عرف ولیمہ ہاتھ میں غلیل لئے عاصم کے گھر کے اوپر بیٹھے کبوتروں کا نشانہ لے رہا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ کسی کبوتر کو زخمی کرتا، میں نے زور سے کہا: "ٹھہرو۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اپنا غلیل والا ہاتھ نیچے کر لیا۔ چونکہ ہم لوگ اس محلے میں نئے نئے آئے تھے۔ اس لئے رضوان دوسروں کی نسبت ہمارے ساتھ ذرا نرمی سے پیش آتا تھا۔ اس کے نرم رویئے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ میرے چھوٹے بھائی سے رسالے اور کہانیاں پڑھنے کے لئے لے جاتا تھا۔ (اور واپس بھی نہیں کرتا تھا۔)

میں نے اس سے کہا۔ "عاصم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، جو تم اس کے کبوتروں کو مارنا چاہ رہے ہو۔ اور اگر عاصم نے تمہیں کوئی تکلیف پہنچائی بھی ہے تو تم اسی سے بدلہ لو، یا پھر معاف کر دو۔ ان بے زبان جانوروں کا کیا قصور ہے؟"

وہ بولا۔ "میں تو بس ایسے ہی نشانہ بازی کر رہا تھا۔"

"نشانہ بازی؟" میں نے تلملا کر کہا! "کڑکتی دھوپ میں نشانہ بازی۔؟ اور وہ بھی بے زبان پرندوں پر؟ کیا تمہیں اس بات کا ڈر اور خوف نہیں ہے کہ کسی کو ستانے اور تنگ کرنے کے نتیجے میں تمہیں نہ صرف گناہ مل سکتا ہے، بلکہ دنیا میں بھی اس کی سزا مل سکتی ہے!۔"

وہ تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑا مجھے گھورتا رہا، پھر آہستہ سے بولا۔

"میں نے اپنی اسلامیات کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک ماں اپنی اولاد سے جتنی محبت اور پیار کرتی ہے۔ اللہ میاں اس سے (۷۰) ستر گنا زیادہ اپنے بندوں پر شفقت اور مہربانی فرماتے ہیں، تو میری امی تو مجھ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتی ہیں۔ میری ہر خواہش اور ضد پوری کرتی ہیں اور کسی شرارت پر بھی مجھے ڈانٹتی یا مارتی نہیں۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ جب میری امی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں تو ان سے (۷۰) ستر گنا زیادہ محبت کرنے والے اللہ میاں تو مجھے یقیناً کسی شرارت پر بھی کچھ نہیں کہیں گے۔"

"اوہ!" میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "تو کیا تم اسی وجہ سے شرارتیں کیا کرتے ہو۔؟"

اس نے تھوڑے توقف کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا۔ "میرے بھائی! ایک بات کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے لیکن اگر کسی دوسرے رخ پر سوچا جائے تو غلط مفہوم بھی ذہن میں آسکتا ہے۔ میرے خیال میں تمہارے ذہن میں ایک ہی بات بیٹھی ہوئی ہے اور وہ بھی غلط۔ میرے بھائی! جہاں تک بات ہے اللہ میاں کے مہربان اور شفیق ہونے کی، تو یہ تو تصویر کا پہلا رخ ہے۔ دوسرے رخ کے متعلق غالباً تم کو علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے۔

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے کفر کرتے ہیں۔ ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اور سخت بدلہ لینے والا ہے۔" اس کے علاوہ قرآن مجید میں کئی جگہوں پر اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کے بارے میں لکھا ہوا ہے جو کہ نہایت شدید ہے۔ یہ قہر و غضب صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے نافرمانوں کے لئے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت و شفقت صرف اس کے نیک بندوں کے لئے ہے، خراب لوگوں

کے لئے نہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے لئے غفار ہے، وہیں ظالموں کے لئے قہار بھی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی بات ختم کر دی اور مسجد کی راہ لی۔ رضوان وہیں سکتہ کی سی حالت میں کھڑا رہا۔

نماز سے فارغ ہو کر میں سیدھا گھر آیا۔ اور کھانا کھا کر سو گیا۔

عصر کی اذان کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں اٹھا اور مسجد کی جانب چل دیا۔ مسجد کے وضو خانے سے وضو کرنے کے بعد جب میں نمازیوں کے ساتھ صف بندی کرنے لگا تو اپنی اگلی صف میں کھڑے شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہی رضوان عرف ولیمہ جس کے بارے میں محلے والے کہتے تھے کہ یہ جمعہ تو جمعہ، عید کی نماز پڑھنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اب مجھ سے آگے کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہا تھا۔ بے اختیار مجھے قرآن پاک کے یہ الفاظ یاد آ گئے۔

"بے شک خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔"

☆ ☆ ☆ ☆

☆ ☆

MASS

بونگا

منیر احمد راشد

شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ دن بھر دانہ دُنکا تلاش کرنے والے پنچھی اپنے آشیانوں کی طرف اور شام کو باغ میں کھیلنے والے بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ گھروں کی سمت پلٹنا شروع ہو گئے تھے۔ باغ کی رونق آہستہ آہستہ ختم ہو گئی اور سیمنٹ کی بنچ پر وہ اکیلا رہ گیا۔ یہ تنویر تھا۔ عمر بارہ سال۔ چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا مگر دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے سولہ سترہ سال کا نوجوان ہو۔۔ دبلا پتلا جسم، نکلتا ہوا قد، بکھرے ہوئے بال اور پریشان سا چہرہ، جس پر کہیں کہیں حماقت برستی تھی۔

تنویر بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ ابو کسی مل میں کام کرتے تھے۔ ماں کچھ کچھ دیوانی سی تھی جسے اپنے وجود کی صفائی کا بھی ذرا کم ہی خیال آتا تھا۔ اس لئے بچوں کی حالت بھی خراب رہتی تھی۔ تنویر کے ابو، شرافت صاحب طبعاً صفائی پسند اور متحمل مزاج آدمی تھے لیکن بیوی کی عادتوں سے تنگ تھے۔ اب تو انہیں بات بات پر غصہ آنے لگا تھا۔ جب تنویر پیدا ہوا تو اس کی پرورش کی زیادہ تر ذمہ داریاں شرافت صاحب ہی کو ادا کرنی پڑتی تھیں۔ اس کو نہلانا، کپڑے بدلنا اور بعض اوقات راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کے لئے دودھ گرم کرنا۔ کیونکہ ماں کا دودھ تو تنویر نے چند ہی دن پیا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ تنویر پانچ سال کا ہوا تو بابر پیدا ہوا۔ ماں کی سستی اور کاہلی کچھ زیادہ ہو گئی، گھر میں گندگی بڑھ گئی اور شرافت صاحب کے ضبط کے بندھن ذرا اور ڈھیلے ہو گئے۔ ان پانچ سالوں میں وہ بارہا تنویر اور اس کی ماں کی پٹائی کر چکے تھے۔ ماں تو دیوانی تھی، صبح کی بات شام کو بھول جاتی تھی لیکن تنویر بہت حسّاس تھا۔ وہ ان واقعات سے بڑا اثر لیتا۔

بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ تنویر کی بدقسمتی تھی کہ اس کی پہلی تربیت گاہ ہی تربیت سے خالی تھی۔ یوں جیسے گرما کی چھٹیوں میں اسکول ہوا کرتے ہیں۔ ماں خود تہذیب سے کوسوں دور تھی، تنویر کو بھلا کیا درس دیتی۔ اس طرح تنویر نے ماں سے جو کچھ سیکھا وہ حماقتوں کا پلندا تھا جس کا طعنہ اکثر اس کے ابو اسے دیا کرتے تھے۔ اس سے ذرا سی غلطی ہو جاتی تو شرافت صاحب اس کی خوب پٹائی کرتے۔ وہ مارتے جاتے اور کہتے "کم بخت تو بھی ماں کی طرح بو نگا نکلے گا۔" تنویر کی سمجھ میں اس جملے کا مطلب نہیں آتا تھا۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ غلط ہے۔ یہ جملہ اس نے اتنی بار سنا کہ اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔ وہ کبھی تنہائی میں اپنے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے کوئی غلطی کر جاتا تو جھنجلا اُٹھتا اور خود سے کہتا: "تُو تو ہے ہی بونگا۔" اور پھر شرمندہ سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔

اسکول میں داخل ہوا تو یہ احساس اور گہرا ہو گیا۔ اس کے ہم جماعت چالاک لڑکے اس کی ذرا ذرا سی غلطیوں کا مذاق اڑاتے اور استاد بھی اکثر مسکراتے ہوئے اسے احمق کا خطاب دے دیتے۔ جب کبھی بھی ایسا واقعہ پیش آتا (اور ایسا واقعہ ہر روز ہی پیش آ جاتا تھا) شرمندگی کا ایک گہرا تاثر اس کے چہرے پر ابھرتا اور نقش ہو کر رہ جاتا...... بو نگا...... یہ لفظ تنویر کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح لگتا تھا۔ شروع شروع میں تو صرف اس کے ابّو ہی اسے یہ خطاب دیتے مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوا تو محلے کے بچوں نے بھی اسے بو نگا کہنا شروع کر دیا۔ اور ایک طرح سے اس کی چڑ بنالی۔ تنویر واقعی اس لفظ سے چڑتا تھا۔ جب بھی محلے کا کوئی بچہ یا بڑا اسے بو نگا کہتا تو وہ اس سے لڑ پڑتا۔ بچہ ہوتا تو اس کی خوب پٹائی کرتا اور اگر کوئی بڑا اس چڑاتا تو وہ اسے گندی گندی گالیاں دیتا۔ گالیاں اس نے ابو سے سیکھی تھیں۔ جو اس کی پٹائی کرتے ہوئے اسے خوب گالیاں بھی دیا کرتے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ تنویر دس سال کا اور بابر پانچ سال کا ہو گیا۔ نورین کی پیدائش ہوئی۔ گھر کی گندگی، ماں کی سُستی، باپ کے غصے، بابر کے نخروں اور تنویر کے جھگڑوں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی سے لڑ جھگڑ کر گھر آتا تھا۔ کبھی خود پٹتا اور کبھی کسی دوسرے کا سر پھاڑ دیتا۔ شرافت صاحب جب گھر آتے تو تنویر کی کوئی نہ کوئی شکایت ان کے سامنے ہوتی۔ وہ جل جاتے اور تنویر کی خوب پٹائی کرتے۔ سچی

بات تو یہ ہے کہ وہ ان روز روز کی شکایتوں سے تنگ آچکے تھے اور تنویر کا کوئی پکا بندوبست کرنا چاہتے تھے۔

تنویر کی ایک اور بدقسمتی یہ تھی کہ شرافت صاحب بابر سے بہت پیار کرتے تھے۔ بابر ذرا تھا بھی خوبصورت .... بابر سے باپ کی اس محبت کو دیکھ کر تنویر کا دل جل جل جاتا تھا۔ اسے باپ پر بھی غصہ آتا اور بابر پر بھی۔ حالانکہ جب بابر چھوٹا تھا تو تنویر اسے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ اسے چومتا اور گھنٹوں کھلاتا رہتا۔ بغیر تھکاوٹ یا بوریت کے...... لیکن اس کا بابر کو کھلانا آئندہ دنوں میں اس کے لئے ایک مصیبت بن گیا۔ ماں جو پہلے ہی کاہل تھی، ننھے بابر کی طرف سے بالکل غافل ہو گئی۔ ہوا کبھی دن بھر میں ایک دو بار دودھ پلا دیا ورنہ تنویر سے کہا کہ دودھ گرم کر کے بابر کو پلا دے اور خود پلنگ پر قبضہ جمائے لیٹی سوتی رہی۔ تنویر کا کھیل اور دیگر مشاغل بابر کی پرورش کی نذر ہو گئے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بابر کو پالنا اسی کا فرض ہے۔ یہ احساس اکیلے اسی کا نہیں تھا۔ شرافت صاحب نے بھی غیر شعوری طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ بابر کی پرورش تنویر کی ذمہ داری ہے۔ اکثر جب ننھا بابر روتا تو شرافت صاحب اپنی بیوی کے بجائے تنویر ہی کو کہتے کہ بچے کو چپ کراؤ۔ اور تنویر جو اس وقت کھیل میں مشغول ہوتا بادل نخواستہ بابر کو اٹھاتا اور گھر سے باہر لے جاتا۔ اسے آہستہ آہستہ بابر سے نفرت ہوتی جارہی تھی۔ باپ کی محبت تو پہلے ہی اس کے دل سے رخصت ہوچکی تھی۔ وہ جب محلے کے دوسرے بچوں کو دیکھتا جن کے ماں باپ انہیں بہت پیار کرتے تھے تو ایک عجیب احساس محرومی اس کے دل میں پیدا ہوتا۔ طرح طرح کے خیالات ذہن پر یلغار کرتے اور وہ پریشان ہو جاتا۔ بعض اوقات جب شرافت صاحب اسے بہت بے دردی سے مارتے تو اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے وہ سوچا کرتا کہ کیا یہ واقعی میرے ابّو ہیں؟ کیا میں ان کا بیٹا ہوں ؟..... لیکن ابو تو ایسے نہیں ہوتے...... گوگا کے ابو تو اس سے بہت پیار کرتے ہیں، کبھی مارتے یا جھڑکتے بھی نہیں۔ بلکہ اکثر مزے مزے کی چیزیں لاکر دیتے ہیں۔ نئے نئے کھلونے...... مگر میرے ابو...... اور اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ پاتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ابو اسے کیوں مارتے ہیں۔ جب وہ نیا نیا اسکول میں داخل ہوا تھا تو شرافت صاحب اسے رات کے وقت اسکول کا سبق یاد کرایا کرتے تھے۔ جو کبھی اسے جلدی یاد ہو جاتا کبھی نہ ہوتا۔ اور جو یاد بھی ہو جاتا اس پر بھی اعتماد نہ ہوتا کہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ جب شرافت صاحب سبق سنتے تو وہ اس بے اعتمادی کی وجہ سے اچھا بھلا یاد کیا ہوا سبق بھی بھول جاتا اور شرافت صاحب اسے بونگا، کند ذہن اور نجانے کیا کیا کہہ کر خوب مار لگاتے۔ حالانکہ بعد میں انہیں افسوس بھی ہوتا مگر وہ اپنے غصے پر قابو نہیں پاسکتے تھے۔

تنویر جوں جوں بڑا ہوتا جا رہا تھا، اس کے اندر انتقام کا جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ باپ کا تو خیر وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن ماں کے ساتھ بد تمیزیاں کرنے لگا تھا۔ اور بابر...... اس کی تو وہ خوب خبر لیتا تھا۔ آج یہی تو ہوا تھا۔ بابر نے تنویر کی پتنگ پھاڑ دی تو تنویر نے اس کے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ مار کھا کر بابر یوں تڑپا جیسے بہت آفت ٹوٹ پڑی ہو۔ اس نے روتے ہوئے پہلے تو تنویر کو گالیاں بکیں اور پھر بابا کا مخصوص خطاب دیا۔ "بونگا......" یہ لفظ سنتے ہی جیسے تنویر پر دیوانگی طاری ہو گئی اس نے بابر کو بڑی بے دردی سے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون سارے کپڑوں پر پھیل گیا۔ ماں نے جب دیکھا تو تنویر کو برا بھلا کہا مگر تنویر اب ماں کے قابو نہیں آتا تھا۔ وہ بچہ تو رہا نہیں تھا بارہ برس کا ہو چکا تھا۔ اس نے الٹا ماں کے ساتھ بھی بد تمیزی کی اور گھر سے باہر چلا آیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور اب رات ہو رہی تھی۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ گھر گیا تو ابو اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ لیکن وہ کبھی رات کو گھر سے باہر بھی نہیں رہا تھا۔ باغ میں اسے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ اس نے اغوا کی بہت سی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ جن کے مطابق اغوا کرنے والے بچوں کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ان سے بھیک منگواتے ہیں۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ وہ اغوا ہو جائے۔ گھر میں کونسا اسے بہت سکھ ملتا ہے۔ مار یہاں بھی پڑتی ہے وہاں ذرا زیادہ پڑ جائے گی۔ مگر پھر اپاہج ہونے کے خیال سے اسے ڈر لگنے لگا۔ اندھیرا جوں جوں گہرا ہو رہا تھا تنویر کے خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ابو نے مجھے مارا تو میں سچ مچ گھر سے بھاگ جاؤں گا۔ ایک باغیانہ خیال یہ بھی اس کے دل میں آیا کہ وہ بھی اب بڑا ہو چکا ہے۔ جب وہ اسکول میں تین تین چار چار لڑکوں کو ایک ہی وقت میں پیٹ سکتا ہے تو ابو کون سے اتنے پہلوان ہیں۔ لیکن اسے اپنے اس خیال سے گھن سی آئی ایک گناہ کا احساس ہوا اور فوراً ہی اس نے اس خیال کو دماغ سے نکال دیا۔ اس نے سوچا "بس ٹھیک ہے اگر مجھے کسی نے مارا تو میں گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی دے دوں گا۔" ایسی ہی باتیں سوچتا ہوا وہ گھر کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ یہاں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دستک دی...... دروازہ ذرا دیر سے کھلا۔ دروازہ اس کے ابو نے ہی کھولا تھا۔ تنویر نے ایک نظر ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ پھر اس ذرا سی جگہ میں سے گزر کر اندر داخل ہو گیا جو اس کے ابو نے کچھ کہے بغیر اس کے لئے چھوڑی تھی۔ تنویر سیدھا اپنے کمرے کی جانب بڑھا لیکن ابو کی آواز نے اس کے قدم روک لئے اس نے پیچھے مڑے بغیر خود کو اس بات کے لئے تیار کر لیا کہ ابھی ربڑ کا وہ مخصوص پائپ اس کے جسم پر پڑنے والا ہے جسے وہ پچھلے کئی برسوں سے برداشت کر رہا تھا۔ تنویر کو مار کھانے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اب تو وہ مار کھاتے ہوئے یا بعد میں روتا بھی نہیں تھا۔

بس ذرا شور مچاتا تھا تا کہ ابو کو احساس ہو کہ اسے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ اندازے سے زیادہ دیر ہو گئی مگر پائپ نے جسم کو نہیں چھوا تو وہ آہستہ سے مڑا۔ اس نے دیکھا اس کے ابو کسی سوچ میں گم کھڑے ہیں۔ پھر وہ بولے "ادھر آؤ...... یہاں بیٹھو۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ تنویر کو ذرا سی حیرت ہوئی وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ شرافت صاحب بھی اس روز روز کی مار کٹائی سے تنگ آ چکے تھے۔ انہوں نے سوچا وہ آج تنویر سے ذرا کھل کر بات کریں گے کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔

"دیکھو تنویر...... تم اب بڑے ہو گئے ہو۔ اچھے خاصے سمجھدار ہو۔ ...... چھٹی میں پڑھتے ہو۔ پھر کیوں ایسی حرکتیں کرتے ہو بیٹے؟" انہوں نے بے بسی سے کہا اور ذرا دیر کے لئے خاموش ہوئے جیسے بات کہنے کے لئے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ تنویر کو یہ سب بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ابو نے اسے بیٹا کہا ہے .... نہ صرف بیٹا بلکہ سمجھدار بھی کہا ہے۔ اسے اپنی سماعت پر شک ہونے لگا...... وہ سر جھکائے بیٹھا تھا...... ابو دوبارہ بولے ......"جب تم پیدا ہوئے تو میں کتنا خوش ہوا تھا۔ سوچا کرتا تھا کہ تم بڑے ہو کر میرا سہارا بنو گے۔ میرے دکھ بانٹو گے۔ ...... میں نے تمہاری پرورش کے لئے کیا کیا تکلیفیں برداشت نہیں کیں۔ دن بھر مل میں گدھے کی طرح کام کرتا تھا۔ رات بھر تمہارے لئے جاگتا۔ کبھی دودھ گرم کرتا۔ کبھی تمہیں سردی سے بچانے کے لئے لحاف میں لپیٹتا...... تمہاری ماں نے تو بس تمہیں جنم دیا تھا۔ باقی ساری تکلیفیں تو میں نے جھیلیں۔ صرف اس لئے کہ تم میرے بیٹے تھے۔ میرا سہارا ...."

شرافت صاحب کی آواز گلوگیر ہو گئی .... وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے مگر آواز نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ تنویر نے گردن اٹھا کر اُن کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے باپ کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو صاف نظر آ گئے۔ اس کا بھی دل بھر آیا۔ وہ لہجہ جو وہ باپ کے منہ سے سننا چاہتا تھا، آج سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے پیدا ہونے والے سارے باغیانہ خیالات اس کے ذہن سے غائب ہو گئے تھے۔ وہ نفرت جو اس کی رگ رگ میں اتر چکی تھی۔ آہستہ آہستہ روپ بدل رہی تھی ...... باپ سے محبت کا روپ۔ وہ تمنا جو اب حسرت کا کھنڈر بن چکی تھی ایک بار پھر زندہ ہو رہی تھی۔ وہ یہی تو چاہتا تھا کہ ابو اسے بیٹا سمجھیں...... بیٹا کہیں۔ کبھی تو پیار سے بات کریں۔ اور آج وہ ایسا کر رہے تھے انہوں نے اسے سمجھدار بیٹا بھی کہا تھا اور پیار سے پاس بھی بٹھایا تھا...... یہ تنویر کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ اتنی بڑی کہ اس کے ننھے سے دل میں نہیں سما رہی تھی۔ اور جب دل میں جگہ نہ ملی تو یہ خوشی

آنکھوں سے بہہ نکلی۔ وہ تنویر جو ربڑ کے مضبوط پائپ سے پٹ کر بھی آنسو نہیں بہاتا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شرافت صاحب اٹھ کر اس کے پاس گئے۔ اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔ تنویر کے رونے میں شدت آتی جارہی تھی۔ باپ نے اس کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"مجھے احساس ہے بیٹے کہ میں تمہیں بہت مارتا ہوں ...... لیکن میں ...... میں ...... کیا کروں ...... سارا دن ٹھیکیدار کی جھڑکیاں کھاتا ہوں ...... گھر آتا ہوں تو یہاں کا ماحول دیکھ کر میرا خون جل جاتا ہے۔ غصے پر مجھے قابو نہیں رہتا ...... لیکن تمہیں پتا ہے ...... اکثر تمہیں مارنے کے بعد میں تنہائیوں میں خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رویا ہوں" .... وہ اس وقت بھی رو رہے تھے۔

مگر تنویر نے ان کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ تو لفظ بیٹا کے تاثر اور باپ کے جسم کے لمس کو جذب کر لینا چاہتا تھا۔ وہ برابر رو رہا تھا ...... شرافت صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا میں تمہارا غریب باپ ہوں ...... مشکل سے اپنا اور تم لوگوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ تمہارے آئے دن کے جھگڑوں اور شکایتوں کی وجہ سے سارے محلے والوں سے میری ان بن ہو گئی ہے۔ میں ایک اکیلا آدمی کس کس سے لڑوں ...... کس کس کو جواب دوں ...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم کیوں سب سے لڑتے پھرتے ہو ...... کیوں جھگڑا کرتے ہو ...... کل اسکول سے تمہاری شکایت آئی تھی۔ آج تم نے اپنے ہی بھائی کا سر پھاڑ دیا ...... بیٹے آخر تم چاہتے کیا ہو ...... مجھے بتاؤ" انھوں نے اپنے خیالات کو بے ربط جملوں میں ادا کرتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

تنویر جو باپ کی شفقت پا کر سب دکھ بھول گیا تھا۔ یکدم چونکا "وہ کیا چاہتا ہے؟" ...... پہلی بار کسی نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے ...... بابر کے ذکر پر وہ سارا منظر بھی اس کے ذہن میں پھر گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام واقعات بھی ایک لمحے میں اس کے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ جن کی وجہ سے اس نے لوگوں سے جھگڑے کئے تھے۔ اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ ...... بونگا ...... یہ لفظ سنتے ہی تنویر پر دیوانگی طاری ہو جاتی تھی ...... اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا تھا سوائے اس کے کہ وہ بونگا کہنے والے کی ہڈیاں توڑ دے ...... یہ لفظ آکٹوپس کی طرح اس کے ذہن سے چمٹ جاتا۔ اور وہ ناقابل برداشت اذیت میں مبتلا ہو جاتا تھا ...... اور یہ بات اس سے بھی زیادہ اذیت ناک تھی کہ یہ خطاب خود اس کے ابو نے دیا تھا ......

تنویر نے کہ جس کا رونا اب ہچکیوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سر اٹھا کر بھیگی پلکوں سے باپ کی طرف دیکھا اور بڑی بے بسی سے احتجاج کرتے ہوئے بس اتنا کہہ پایا ...... "ابو میں بونگا نہیں ہوں۔"

اُداس بچی

محمد سلیم مُغل

لب سڑک چلتے چلتے اک دن
جو میں نے دیکھا
کہ ایک بچی ڈری ڈری سی
کھڑی ہوئی ہے
سوال نظروں سے
میرے چہرے کو گھورتی ہے
زبان چپ ہے
مگر وہ آنکھوں کے زاویوں سے
مرے ذہن کو ٹٹولتی ہے
تو میں نے پوچھا کہ کون ہو تم
کہاں سے آئی ہو کچھ بتاؤ
تمہاری آنکھیں اداس کیوں ہیں
یہ پھول چہرہ ملول کیوں ہے
تمہارے تن پہ پھٹا پرانا
فراک کیسا؟
تمہارے بالوں کو
کیوں کسی نے نہیں سنوارا
کچھ اپنا دکھ تم مجھے بتاؤ
قریب آؤ
وہ سہمی سہمی اداس بچی
قریب آئی
وہ میرے بالکل قریب آکر
مجھے بھی خود سا غریب پاکر
لگی وہ کہنے کچھ اس طرح سے

مری کہانی عجیب تر ہے
جو سن سکو تو تمہیں سناؤں
مگر زباں سے میں کیا بتاؤں
مجھے حوادث نے کیسے پالا
مجھے تو قسمت نے مار ڈالا
مرے بزرگوں نے جانے کتنی
دعائیں کی تھیں
کہ ان کے گھر میں
عدم سے کوئی وجود آئے
بس ایک بیٹا ہو پھول سا جو
خوشی کی لے کر
نمود آئے
مگر مقدر میں جو لکھا ہو
وہ کب مٹا ہے
سو گھر میں آیا وجود میرا
ہوا اندھیرا
سنا ہے بیٹی تو برکتوں اور
رحمتوں کی نوید ہے پر
ہمارے گھر میں یہ سب نہیں ہے
ہمارے گھر میں تو بیٹیاں اک
سوال بھی ہیں
نشان حزن و ملال بھی ہیں
سو میرے آنے پہ
کس لئے کوئی مسکراتا

خوشی سے مجھ کو گلے لگاتا
کہیں سے کوئی مٹھائی آئی
نہ پھول آئے
سبھی کھلونوں کو بھول آئے
میں لعنتوں کی ملامتوں کی
تپش میں اتنی بڑی ہوئی ہوں
سڑک کنارے کھڑی ہوئی ہوں
تم ہی بتاؤ
کہ میرا آخر قصور کیا ہے
یہ سارا قصہ حضور کیا ہے
مرا بھی جی چاہتا ہے میں بھی
مدرسے جاؤں
مرے بھی ہاتھوں میں ہوں کتابیں
کسی قلم سے میں تختیوں پہ
نصاب لکھوں حساب لکھوں
میں اپنے مکتب کے
سارے بچوں کے ساتھ مل کر
سبق سناؤں
جو گیت نغمے کتاب میں ہیں
وہ گنگناؤں
مگر یہ سب کچھ مرے نصیبوں میں
کب لکھا ہے
کتاب کاپی قلم نہ کوئی دوات میری
ہے کتنی کم تر یہ ذات میری

تمہارے اتنے بڑے جہاں میں
کوئی کھلونا، مرے لئے
کیا نہیں بنا ہے؟
نہ کوئی گڑیا نہ شیر بھالو مرے لئے ہے
غلیظ مٹی کے کچھ کھلونے
خود ہی بنا کر
میں کھیلتی ہوں
یہ دکھ بھی
خود ہی میں جھیلتی ہوں

جو دن مرے
کھیلنے کے تھے وہ
مشقتوں میں گزر رہے ہیں
یہ کیسی بے بسی ہے دیکھو
نہ جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں
میں کون ہوں اور
کہاں سے آئی ہوں، لو سنو تم
میں ایک خانہ بدوش لڑکی ہوں
آج یاں ہوں تو
کل وہاں ہوں
میں ایک مفلس غریب ہوں اور
دکھوں کی دہلیز
گھر ہے میرا
اسی سڑک پہ بسر ہے میرا
میں روز و شب اس سڑک کنارے

کھڑی ہوئی
بھیک مانگتی ہوں
یہاں سے اکثر گزرنے والے
مری ہتھیلی پہ
اک چونی یا اک اٹھنی
تھما کے اس طرح دیکھتے ہیں
کہ جیسے دنیا کی ساری دولت نثار کی ہو
میں سوچتی ہوں
کہ کاش ایسا بھی ہو کہ
اک دن
کوئی مسافر کہیں سے آئے
قریب آکر مجھے بلائے
مجھے بلا کر
محبتوں سے گلے لگائے
میں اس کے منہ سے
یہ لفظ سن کر
خوشی سے بس
جھوم جھوم جاؤں
کہ "آج سے تم ہماری بیٹی ہو
ساتھ آؤ
لب سڑک
یوں نہ دکھ اٹھاؤ"

☆

دستِ شفقت

ترجمہ ...... فراز احمد فاروقی

بچوں سے متعلق مختلف نوعیت کی سرگرمیوں پر مبنی یہ رپورٹیں ...... بچوں کے لئے کام کرنے والے ادارے "دست شفقت" کے طبع شدہ نیوز لیٹر سے حاصل کی گئیں۔

دنیا بھر میں بے شمار بچے لاتعداد مسائل کا شکار ہیں۔ ان مسائل میں سے چند کی نوعیت کیا ہے؟ اور مسائل کے حل کے سلسلے میں کیا کوششیں ہو رہی ہیں؟ اس بارے میں ہم یہاں چند حقائق آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ حقائق اگرچہ چند مختصر خبریں ہیں لیکن بہرحال ان کے ذریعہ مسائل پر تھوڑی بہت روشنی ضرور پڑتی ہے۔

بچوں سے متعلق پہلی سربراہی کانفرنس

بچوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک اور ان کی محرومیوں سے متعلق آٹھویں کانگریس جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں منعقد ہوئی۔ جس میں پاکستان سمیت متعدد ممالک نے شرکت کی۔ اس وقت جبکہ دنیا کے اکثر ممالک میں بچوں کو غیر انسانی سلوک سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں مناسب کارروائیاں کی جارہی ہیں ہمارے ملک میں ایسی کارروائیوں کی افادیت کو تسلیم کرانے کی جدوجہد ہو رہی ہے۔ بہرحال اس کانفرنس میں پاکستانی مندوبین کی شرکت اس مسئلہ کے سلسلہ میں ہمارے بڑھتے ہوئے شعور کی علامت ہے۔

بچوں سے متعلق ایک عالمی کانفرنس ۳۰ دسمبر ۱۹۹۰ء کو نیویارک میں منعقد ہوئی۔ جس میں اسّی ملکوں کے سربراہوں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی وزیر خارجہ صاحب زادہ یعقوب

خان نے کی۔ پاکستان ان چھ ممالک میں سے ایک ہے جنہوں نے اس کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں کام کا آغاز کیا تھا۔

کانفرنس میں شریک سربراہان نے فیصلہ کیا کہ بچوں کی بہبود کے لئے کئی ارب ڈالر مختص کئے جائیں۔

مظلوم بچے، مزدور بچے۔ ایک مشاہدہ

۵۰ اسکوائر فٹ کی چھوٹی سی جگہ میں تیس آدمی اور کچھ کم عمر لڑکے کام کرتے ہیں۔ یہاں قالین بانی ہوتی ہے۔ بڑے افراد میں سے اکثر سگریٹ پیتے ہیں۔ یہاں روشنی بہت کم ہے اور کام کرنے کی جگہ کا فرش ٹوٹا پھوٹا ہے۔ اس جگہ پر بہت کم تازہ ہوا آتی ہے اس لئے یہاں بیشتر وقت گھٹن رہتی ہے۔

بچوں کے ہاتھ تیزی کے ساتھ قالین بننے میں مصروف ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی تیزی اکثر اپنے بڑوں سے بڑھ جاتی ہے۔ یہاں پر کام کرنے والے ایک بچے نے ہمیں بتایا کہ کم روشنی کے باعث گذشتہ ڈیڑھ برس میں اس کے ہاتھوں کی انگلی کئی مرتبہ کٹ چکی ہے۔ ہم نے دیکھا تو اس کی انگلی کا زخم خاصا گہرا تھا۔ یہاں کام کرنے والے اکثر بچوں کی عمر آٹھ برس سے کم ہے۔ البتہ کچھ کی عمریں بارہ برس اور اس سے زیادہ بھی ہیں۔ اس کارخانے کے مالک رئیس نے ہمیں بتایا کہ ایسے اکثر کارخانے فیکٹری ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ نہیں ہوتے چنانچہ یہاں کام کرنے والے بچوں کے حقوق کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ تاہم کچھ انسپکٹر صاحبان ان کارخانوں کی جانچ پڑتال کے لئے آتے ہیں مگر یہ ایک خانہ پوری کا عمل ہے۔

یہاں کام کرنے والے بچوں کے کپڑے بے حد معمولی ہیں، ان کے چہروں پر وحشت اور پیلاہٹ چھائی ہوئی ہے۔ وہ صاف ستھرے اجلے کپڑوں میں کھیلتے کودتے اور یونیفارم پہن کر اسکول جاتے ہوئے بچوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں۔

بچوں کی جیل

بورسٹل جیل میں اس وقت ۶۳۸ کم سن مجرم موجود ہیں۔ ان مجرموں کی عمریں ۱۲ سے ۲۲ برس کے درمیان ہیں۔ یہ مجرم یہاں ہیروئین فروشی، چوری، قتل اور ناجائز اسلحہ رکھنے جیسے جرائم کر کے یہاں آئے ہیں۔ ہر بیرک میں موجود مجرموں کی تعداد ۶۰ سے ۷۰ کے درمیان ہے۔ ہر مجرم پر روزانہ ۳ روپے خرچ ہوتے ہیں۔

ان میں کچھ ایسے مجرم بھی شامل ہیں جن کا تعلق دوسرے ممالک سے ہے۔ ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو ناجائز طور پر پاکستان میں داخل ہوئے ہیں ان بچوں کی رہائی کی صرف ایک صورت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان ممالک کے سفارت خانے جیل کے حکام سے رابطہ کر کے ان کی رہائی کے لئے کوشش کریں۔ معلوم نہیں بچوں کے یہ سنگین مسائل کب حل ہونگے؟ کیا ہمارے بڑے اس کا کوئی جواب دے سکتے ہیں؟

کون بتلائے گا یہ پہچان کر
اس میں ہیں پوشیدہ کتنے جانور

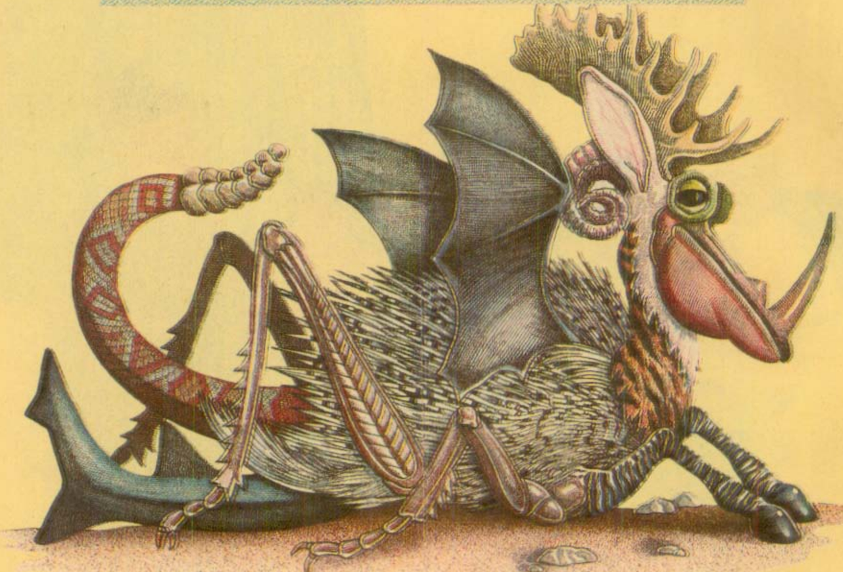

ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ نے آج تک ایسا جانور نہیں دیکھا ہو گا۔ دیکھا ہو تو دکھائیے۔ سُنا ہو تو بتائیے۔ یہ عجیب و غریب جانور مصوّر کے تخلیقی ذہن اور مشّاق ہاتھوں کا کمالِ فن ہے۔ ذرا غور سے دیکھ کر تو بتائیے کہ اس ایک جانور کو بنانے کی خاطر کتنے جانوروں کے حصّے بخرے کرنے پڑے ہوں گے؟

اپنے جوابات مکمل نام پتے کے ساتھ ۲۰ جنوری ۹۱ء تک بھجوا کر تین ساتھی قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کر سکتے ہیں۔

محمد پرویز آرائیں

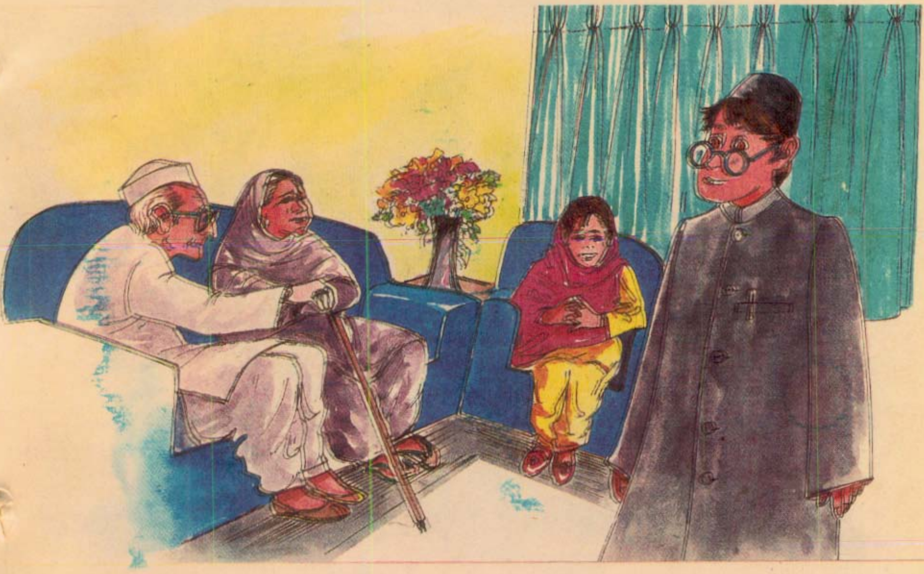

(ڈرامہ)

منظر...... (ڈرائنگ روم کے بیچ میں تخت بچھا ہوا ہے تخت کے آس پاس کچھ کرسیاں رکھی ہوئیں ہیں۔ تخت پر گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے ایک طرف حقہ رکھا ہے۔ دیواروں پر کچھ تصویریں آویزاں ہیں۔ اکرم، اسلم اور بلقیس کسی بات پر ہنستے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں۔)

بلقیس...... ارے سچ بڑا مزہ آئے گا۔ مگر بھیا تم میک اپ ایسا کرنا کہ دادا اور دادی جان بالکل نہ پہچان سکیں۔

اکرم...... ارے تم دیکھو گی ایسا میک اپ کروں گا کہ تم بھی مشکل سے پہچان پاؤ گی۔

اسلم...... بھائی جان مجھے بھی ساتھ لے لو نا۔ میں تمہارا کمپاؤنڈر بن جاؤں گا۔

اکرم...... نہ...... نہ...... نہ...... اسلم تم توبس دادی جان کے ساتھ چپکے رہو ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔

بلقیس تم بھی ذرا بھانڈا پھوٹنے نہ دینا۔

بلقیس...... میری طرف سے تو آپ اطمینان رکھئے یہ اسلم کہیں بھانڈا نہ پھوڑ دے ہنسی رکتی نہیں کم بخت کی۔

اسلم...... واہ...... جیسے تم تو ہمیشہ روتی ہی رہتی ہو نا۔ خود تو یہ لمبے لمبے دانت نکال کر ہنستی رہتی ہے۔

بلقیس...... (بگڑ کر) تو میرے دانت لمبے دانت ہیں۔ دیکھا بھیا اس اسلم کے بچے کو۔

اکرم...... آرڈر...... آرڈر پلیز...... اس وقت جھگڑا شروع ہوا تو سرکس کا پروگرام بس غارت ہی سمجھو

اسلم : اچھا بھئی لو ہم چپ ہو گئے۔

اکرم...... شاباش...... اچھا تو پھر میں جاتا ہوں میک اپ روم میں۔ بلقیس تم دادی اماں کو یہاں لے آؤ۔

اسلم تم بھی دادی اماں کو میرے حکیم ہونے کا یقین دلاتے رہو۔

بلقیس...... مگر بھیا علاج کے لئے جو پیسے ملیں گے اس میں ہمارا برابر کا حصہ۔

اکرم...... حصہ کیسا؟ بس تمہیں سرکس دکھا دیں گے۔

اسلم...... اور جو دادی کو دوائی نہ ملی تو؟

اکرام...... ارے بدھو میاں ڈرتے کیوں ہو...... کہہ دینا کہ حکیم صاحب پیسے لے کر کہیں چمپت ہو گئے۔

بلقیس...... مگر بھیا یہ تو کھلا دھوکا ہوا نا؟

اکرم...... دھوکا کیسا...... الّو کی دُم فاختہ۔ اسی کا نام ترکیب اور عقل مندی ہے۔

اسلم...... ابا اور امی تک اگر یہ بات پہنچ گئی تو؟

اکرم...... ان سے بھی کہہ دیں گے کہ کوئی چار سو بیس قسم کے حکیم صاحب آئے تھے اور پیسے لے کر چلتے بنے۔

بلقیس...... نہیں بھیّا...... اتنی ڈھٹائی ٹھیک نہیں جب ہمیں جیب خرچ کے لئے پیسے مل جائیں گے تو ہم دادی اماں کے پیسے لوٹا دیں گے۔

اکرم...... (طنز سے) اور لوٹاتے وقت پیٹ بھر کر جوتے بھی کھائیں گے۔
بلقیس...... ان سے کیوں کہا جائے کہ ہم نے دھوکہ کیا ہے ان سے تو بس یہی کہا جائے گا کہ ہم حکیم صاحب کی تاک میں بیٹھے تھے۔ اچانک مل گئے تو بری طرح گت بنا کر پیسے واپس لے آئے۔
اکرم...... اچھا بھئی چلو ٹھیک ہے...... سچ مچ تم لوگ بڑے ڈرپوک ہو۔ ارے وہ دیکھو دادی اماں خود ہی ادھر آرہی ہیں۔ میں جاتا ہوں تم دونوں تیار ہو جاؤ...... جب دادی اماں علاج کے لئے تیار ہو جائیں تو مجھے بلا لینا۔

(اکرم جاتا ہے اور دادی ڈرائنگ روم میں آتی ہیں)
دادی اماں...... ارے...... تم لوگ یہاں اس طرح چپ چاپ کیوں بیٹھے ہو؟
اسلم...... ہم لوگ آپ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔
دادی...... میرے بارے میں؟ بھلا کیا باتیں ہو رہی تھیں؟
بلقیس...... آپ کے سر میں ہمیشہ درد رہتا ہے نا؟ اسی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔
دادی...... اچھا...... بھلا آج تمہیں یکایک میرے درد سر کا خیال کیوں آیا؟
اسلم...... آپ ہر وقت سر پر پٹی باندھے رہتی ہیں نا۔ ہمیں اچھا نہیں لگتا۔
دادی...... کیا کروں منّے۔ مجھے تو اس کم بخت سر کے درد نے بالکل دیوانہ بنا دیا ہے سارے حکیم اور ڈاکٹر علاج کر چکے ہیں مگر سب بے کار۔
بلقیس...... (چونک کر) ارے دادی جان۔ مجھے یاد آیا۔ آصفی محلے میں ایک نئے حکیم صاحب آئے ہوئے ہیں۔ بڑے نیک آدمی ہیں۔ بالکل مفت علاج کرتے ہیں ہزاروں لوگ ان سے شفا حاصل کر چکے ہیں۔
دادی...... مفت علاج کرتے ہیں؟...... ایسے بھلے مانس اب بھی ہیں اس دنیا میں؟
اسلم...... کل اسکول جاتے ہوئے میں نے خود دیکھا۔ ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی ان کے کمرے میں۔
دادی...... بھلا کتنے دن ہوئے انہیں یہاں آئے ہوئے؟
بلقیس...... یہی کوئی چار پانچ دن۔ مگر دادی جان چار ہی دنوں میں انہوں نے سینکڑوں مریضوں کو اچھا کر دیا۔
اسلم...... دادی جان آپ انہیں سے علاج کروایئے۔ بالکل اچھی ہو جائیں گی آپ۔

دادی...... بیٹا میں تو اتنی بھیڑ میں جانے سے رہی۔ اور وہ بیچارے یہاں تک کیوں آنے لگے؟

بلقیس...... پہلے آپ راضی ہو جایئے۔ علاج کے لئے ہمارا ذمہ۔ ہم لے آئیں گے انہیں یہاں تک۔

دادی...... ٹھیک ہے کل ہی میں تمہارے دادا جان سے کہہ کر انہیں یہاں بلاتی ہوں۔

اسلم...... دادا جان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے ہم خود ہی انہیں لے آئیں گے یہاں۔

دادی...... تو کیا...... وہ بالکل پیسے نہیں لیتے؟ پھر گزر بسر کیسے کرتے ہیں؟

بلقیس...... دادی جان...... ہمیں کیا کرنا ہے ان کی گزر بسر سے۔ ہمیں تو بس علاج کروانا ہے۔ جاؤ اسلم اگر وہ فرصت سے ہوں تو اسی وقت انہیں بلا لاؤ۔

دادی...... ارے...... ارے...... اتنی بھی جلدی کیا۔ ذرا تمہارے دادا جان سے تو پوچھ لینے دو...... وہ بھی بے چارے ہر وقت بیمار رہتے ہیں۔

بلقیس...... ہاں...... ہاں تو ہرج ہی کیا ہے۔ حکیم صاحب کو آنے تو دیجئے دادا جان کا بھی علاج ہو جائے گا جاؤ۔ اسلم جلدی جاؤ۔ دیر نہ کرو۔

دادی...... وہ بے چارے نہ معلوم اس وقت کس کام میں مصروف ہوں۔ بے وقت پہنچے تو بگڑ نہ جائیں۔ اتنی جلدی کیا ہے، کل بلا لینا۔

بلقیس...... نہیں دادی جان آج کے کام کو کل پر ٹالنا ٹھیک نہیں۔ شاید کل آپ ٹھیک بھی ہو جائیں۔

اسلم...... دادی جان۔ بس آپ تیار رہئے۔ میں ابھی لے آتا ہو۔ (اسلم جاتا ہے)

دادی...... مگر بیٹا...... یہ حکیم صاحب کو مفت علاج کرنے کی سوجھی کیا؟

بلقیس...... دادی جان وہ جیسے روزہ نماز کی تلقین کرنے والے نکلتے ہیں نا...... اسی طرح یہ بے چارے صحت و صفائی کی تلقین کے لئے نکلے ہیں اپنے شہر میں پچاس ساٹھ حکیم صحت و صفائی کی تلقین کرتے پھر رہے ہیں۔

دادی...... (تعجب سے) اچھا...... تو کیا گاؤں گاؤں حکیم گھوم رہے ہیں؟

بلقیس...... ہاں دادی جان...... بے چارے گھر گھر جاکر دوائیں تقسیم کر رہے ہیں۔

شاباش اسلم...... دیکھئے دادی جان وہ اسلم حکیم صاحب کو لے آیا۔

(اسلم اور حکیم صاحب اندر داخل ہوتے ہیں)

حکیم............ تسلیمات عرض کرتا ہوں دادی جان۔

دادی .... جیتے رہو بیٹا .... خدا تمہیں ہزاروں برس کی عمر عطا کرے۔ بیٹھ جاؤ بیٹا ہمارے اسلم نے تمہیں بے وقت زحمت دی۔

حکیم .... نہیں دادی جان .... بھلا اس میں زحمت کی کیا بات ہے یہ تو ہمارا فرض ہے کہئے آپ کو کیا تکلیف ہے؟

دادی .... تکلیفیں تو بہت سی ہیں بیٹا لیکن اس سر کے درد نے تو بالکل کسی کام کا نہیں چھوڑا۔

اسلم .... دادی جان میں دادا جان کو بھی بلا لوں؟

دادی .... ارے ہاں .... اچھا یاد دلایا۔ جاؤ منے ان کو بھی بلا لاؤ۔ اب یہ بے چارے بھلا بار بار کیوں آئیں گے۔

حکیم .... بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اطمینان رکھئے اگر آدھی رات کو بھی ضرورت پڑے تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔ (اسلم جاتا ہے)

دادی جان .... سنا ہے بیٹا تم مفت علاج کرتے ہو؟

حکیم .... (گھبرا کر) جی .... جی نہیں .... جی ہاں .... بات دراصل یہ ہے کہ (بلقیس کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے) محض خدمت خلق کے لئے یہ کام شروع کیا ہے۔

بلقیس .... دادی جان یہ تو حکیم صاحب کی بڑی مہربانی ہے کہ مفت علاج کے ساتھ ساتھ گھر پر آنے کی بھی فیس نہیں لیتے۔

حکیم .... (بلقیس کو گھور کر دیکھتے ہوئے) جی ہاں .... بالکل .... جی ہاں۔

بلقیس .... (ہنستے ہوئے) لیکن اگر کوئی بہت اصرار کرے تو قبول کر لیتے ہیں۔

حکیم .... (خوش ہو کر) جی ہاں .... بالکل .... جی ہاں .... بس یہی بات ہے۔

دادی .... لیکن بیٹا تمہیں یہ مفت علاج کرنے کی سوجھی کیا؟

حکیم .... جی .... وہ .... کیا عرض کروں .... انسانی ہمدردی۔

(دادا جان اندر سے چیختے چلاتے آتے ہیں)

دادا .... (اندر ہی سے) حکیم .... کون حکیم .... کس نے بلایا ہے ان کو؟

اسلم .... (اندر ہی سے) دادا جان آپ چلئے تو سہی۔ مفت علاج کرتے ہیں۔

دادا .... مفت علاج .... کیوں کرتے ہیں مفت علاج؟

اسلم دادا جان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لاتا ہے حکیم صاحب دادا جان کے تیور دیکھ کر گھبرا جاتے

ہیں)

حکیم .... (گھبراتے ہوئے) میں نے کہا قبلہ السلام علیکم۔

دادا جان .... وعلیکم السلام تشریف رکھئے .... تو گویا آپ ہیں حکیم صاحب؟

حکیم .... جی ہاں .... یہ بچے لے آئے ہیں۔

دادا .... ٹھیک ہے تو گویا آپ مفت علاج کرتے ہیں؟

حکیم .... جی نہیں اگر دوا قیمتی دینا پڑے تو مجبوراً کچھ لینا ہی پڑتا ہے۔

دادا .... مجبوراً .... یعنی کہ جی نہیں چاہتا مگر لے لیتے ہیں۔

دادی .... واہ .... یہ بھی اچھی رہی۔ بے چارے آئے ہیں علاج کرنے کے لئے اور آپ ہیں کہ جرح پر جرح کئے جا رہے ہیں۔

دادا .... ابھی تو نو عمر لڑکے سے ہیں .... کیوں صاحب زادے کیا عمر ہوگی تمہاری؟

حکیم .... یہی کوئی بیس پچیّس سال۔

دادا .... دیکھا .... بھلا اس عمر میں کوئی حکیم کیسے بن سکتا ہے؟ حکمت کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے

حکیم .... اچھا تو قبلہ .... پھر مجھے اجازت دیجئے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچے بغیر پوچھے ہی لے آئے مجھے یہاں؟

دادی .... دیکھ لیا .... ناراض ہوگئے نا۔ بیٹا یہی کٹ حجتی تو ان کی اصل بیماری ہے۔ لیکن اصل بیماری کو چھپا کر نہ معلوم کیا واہی تباہی بیماریوں کے نام لیتے ہیں۔

حکیم .... یہ دراصل ایک قسم کے دماغی فالج کے اثر کا نتیجہ ہے۔

دادا .... (بگڑ کر) سراسر بکواس تمہیں ہوگا دماغی فالج، مجھے نہیں کروانا ایسے نیم حکیموں سے علاج۔

دادی .... اے ہے۔ ذرا دماغی کہہ دیا تو کون سی بری بات ہوگئی اور پھر انہوں نے تو صرف خیال ظاہر کیا ہے۔ پورا معائنہ وغیرہ کہاں کیا ہے؟

دادا .... معائنہ کرنے کے بعد تو ممکن ہے کہ کہہ دیں کہ میرا انتقال بھی ہو چکا ہے۔

حکیم .... معاف کیجئے قبلہ .... یہ میرا صرف اندازہ ہے ممکن ہے غلط نکلے۔

دادا .... (خوش ہو کر) ہاں اب ہوئی نا بات کچھ حکمت میں کبھی دعوے نہیں کئے جاتے۔ اندازے

قائم کئے جاتے ہیں (ایک دم چونک کر) کیوں جی یہ داڑھی بالکل اصلی ہے تمہاری؟
حکیم ...... (گھبرا کر داڑھی دباتے ہوئے) جی .... جی ہاں بالکل اصلی۔
دادی .... (بگڑ کر) تمہاری عقل تو نہیں ماری گئی؟ بھلا نقلی داڑھی کیوں لگانے لگے یہ بے چارے؟
دادا .... حکیم صاحب داڑھی رکھنا ہے تو اسے اچھی طرح رکھنا سیکھئے۔ مجھے ایسی الجھی ہوئی داڑھیوں سے سخت وحشت ہوتی ہے۔
نفیس .... دادا جان آپ تو خواہ مخواہ بال کی کھال نکال رہے ہیں۔
اسلم .... دادا جان مریضوں کو دیکھنے سے فرصت ہی کہاں ہے۔ صبح سے شام تک بھیڑ لگی رہتی ہے
دادا .... خیر کوئی بات نہیں۔ دیکھو صاحب زادے میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کے امراض تمہارے بس کا روگ نہیں ہیں ہمارا تو یہ حال ہے کہ ایک تکلیف رفع ہوتی ہے تو دوسری پیدا ہو جاتی ہے ہر وقت ایک نئی کیفیت ایک نئی مصیبت صبح کو سر میں درد ہے تو دوپہر کو پیٹ میں درد۔ تو شام کو ناک میں تکلیف تو رات کو آنکھوں میں درد۔ کہاں تک کوئی علاج کرائے؟
حکیم .... قبلہ یہ کوئی الگ بیماریاں نہیں ہیں۔ ان بیماریوں کا ایک ہی نام ہے اور ایک ہی علاج یعنی وٹامن بی کامپلیکس
دادا .... لو بھئی .... یعنی گویا سر کا درد اور پیٹ کا درد ایک ہی چیز ہوئے .... اور یہ یونانی دواؤں کے نام انگریزی کیسے؟
نفیس .... دادا جان انہوں نے یونانی طب انگریزی میں پڑھی ہے۔
دادا .... طب انگریزی میں پڑھی۔ بھلا تمہیں کیسے معلوم ہوا؟
حکیم .... جی .... وہ میں یونانی اور ڈاکٹری دونوں کے علاج کرتا ہوں۔
دادا .... یعنی کہ .... گویا .... آدھا تیتر اور آدھا بٹیر۔
دادی .... تم علاج کراؤ گے یا تیتر بٹیر پکڑتے رہو گے؟
حکیم .... (گھبرا کر) قبلہ........... وٹامن بی کامپلیکس کو یونانی طب میں تخم گاؤ زبان عنبری جواہر والا کہتے ہیں
دادا .... (حیرت سے) تخم گاؤ زبان یعنی کہ تخم .... ؟ یہ کیا بات ہوئی؟

دادی .... ہوگی کچھ ہاں تو گویا اس دوا سے تمام بیماریاں اچھی ہو جائیں گی .... کیوں بیٹا (حکیم صاحب کی مونچھ اور داڑھی ڈھیلی ہو کر لٹک جاتی ہے بلقیس اور اسلم ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہیں)

دادا .... یہ بھلا کون سا موقع ہے ہنسنے کا؟ کیوں جناب یہ مونچھ اکھڑ کیوں رہی ہے؟

حکیم .... (گھبراتے ہوئے) معاف کیجئے قبلہ۔ اچانک ایک مریض کی یاد آگئی ہے بے چارا مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے۔

دادی .... ارے بیٹا ذرا بات تو پوری کر لیتے۔

حکیم .... آپ اطمینان رکھئے میں پھر آجاؤں گا۔ اور آپ کا علاج ضرور کروں گا۔ اس وقت معافی چاہتا ہوں۔

دادا .... یا وحشت ذرا جو مونچھ ٹیرھی ہو گئی تو گھبرا گئے علاج کرو یا نہ کرو .... مگر بات تو پوری کرو۔

حکیم .... (داڑھی دباتے ہوئے) جی نہیں قبلہ اس وقت تو بس معاف رکھئے پھر کبھی آجاؤں گا۔

(حکیم صاحب کھسک لیتے ہیں۔ ان کے جانے کے انداز پر بچے کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔ دادا اور دادی جان حیرت سے انہیں دیکھتے ہیں) (پردہ گرتا ہے)

نشانہ

جنگ کوریا میں امریکی لائن ڈویژن کا کمانڈنگ جنرل ایک روز فوجی معائنے کے لئے نکلا ہی تھا کہ قریب کی پہاڑی سے دشمن کے کسی سپاہی نے اوپر تلے تین فائر کر ڈالے۔ گولیاں سنسناتی ہوئی جنرل کے اوپر سے گزر گئیں، جنرل بدحواس ہو کر مورچے میں کود گیا۔ وہاں ایک سارجنٹ رائفل سنبھالے بیٹھا تھا۔ "اس شخص کا پتا لگاؤ جس نے فائرنگ کی ہے۔" جنرل نے حکم دیا۔

"سر! ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے" سارجنٹ نے سکون سے جواب دیا۔

"پھر تم نے اسے شوٹ کیوں نہیں کیا؟" جنرل غصے سے چلّایا۔ نوجوان سارجنٹ نے جنرل کو بے وقوف سمجھ کر اسی لہجے میں جواب دیا۔

"یہ شخص چھ ہفتے سے ہم پر فائرنگ کر رہا ہے مگر اب تک ہمارے کسی آدمی کو زخمی نہیں کر سکا ہم نے اس خطرے کے پیش نظر کہ اگر ہم نے اسے شوٹ کر دیا تو بعد میں دشمن اچھے نشانے والا آدمی بھیج دے گا اسے کچھ نہیں کہا۔

سراج احمد سعودی عرب

قالین کی صفائی میں سب سے اعلیٰ

ٹپ ٹاپ

ڈرائی کلینرز

فون : ۴۱۴۴۶۴

۴۳۷۱۴۳

علامہ اقبال روڈ

پی ای سی ایچ ایس

حسن اپارٹمنٹس
۴۴۰۷۴۰

ڈیفنس سوسائٹی
۵۴۲۱۶۳

کلفٹن
۵۳۰۲۶۹

ناظم آباد
۶۱۳۸۱۶

اسکاؤٹنگ

بچوں کی عالمی تنظیم

امتیاز جلیل

دنیا کی ہر تحریک، تنظیم اور انجمن کی کوئی نہ کوئی تاریخ ضرور ہوتی ہے اسی طرح اسکاؤٹنگ کی بھی تاریخ ہے، اس تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بانی کے بارے میں معلومات حاصل ہوں۔

اسکاؤٹ تحریک کے بانی کا پورا نام لارڈ ماؤنٹ اسٹیفن اسمتھ بیڈن پاول آف گل ول تھا جنہیں پیار سے اسکاؤٹ بی پی (BP) کہہ کر پکارتے ہیں۔

بی پی ۲۲ فروری ۱۸۵۷ء کو لندن کے ایک مقام گل ول پارک میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایچ جی بیڈن پاول آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر اور پادری تھے۔ بی پی کی ابتدائی تعلیم لندن کے ایک مشن اسکول چارٹر ہاؤس میں ہوئی ان کی زندگی کو ہم تین اہم حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

بچپن کا زمانہ، فوج کا زمانہ، اسکاؤٹنگ کا زمانہ،

بچپن کا زمانہ۔

بی پی کو بچپن ہی سے شکار کھیلنے، بندوق چلانے، کشتی رانی کرنے اور کھلی فضا میں زندگی گزارنے کا شوق تھا۔ ان کو اپنی ضرورت کی چیزیں خود کرنے کی عادت تھی، وہ بہت اچھے طالب علم تو نہ تھے مگر فٹ بال کے اچھے کھلاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ ڈراموں میں حصہ لینے کے شوقین اور شوقیہ مصور بھی تھے۔

فوج کا زمانہ۔

۱۹ برس کی عمر میں بی پی سب لیفٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے اور پھر اپنی محنت و بہادری کے باعث لیفٹنٹ جنرل کے عہدے تک ترقی کی، ان کی فوجی زندگی کا زیادہ حصہ ہندوستان، افغانستان اور جنوبی افریقہ میں گزرا۔

۱۸۹۹ء میں جب کرنل ہوگئے تو جنوبی افریقہ میں گڑبڑ ہو رہی تھی۔ برطانیہ اور ٹرانسوال کی سلطنت کے درمیان کشیدگی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ کسی بھی وقت جنگ چھڑنے کا احتمال تھا۔ بی پی کو دوستوں کے ساتھ میفکنگ بھیج دیا گیا، میفکنگ جنوبی افریقہ کے درمیان میں واقع ہے، جنگ چھڑی تو بی پی نے ۱۳ اکتوبر ۱۸۹۹ء سے ۲۱۷ دن تک محاصرہ میں آئے ہوئے میفکنگ کو دشمن سے

بچائے رکھا دشمن یہ سمجھتا رہا کہ یہاں کے لئے بہت بڑی فوج ہے مگر درحقیقت انگریزی فوج بہت کم تھی ۔بی پی نے اس شہر کے اسکولوں کے بچوں کو مختلف کاموں پر لگایا مثلاً زخمیوں کی مرہم پٹی، تیمار داری، پیغام رسانی اور کھوج لگانا وغیرہ۔

ان کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا اور بچے کھیل ہی کھیل میں مختلف کام انجام دیتے رہے اس تجربہ کا فائدہ یہ ہوا کہ ملک و قوم کے لئے بچے آئندہ مفید ثابت ہوئے اگرچہ بی پی کی تعلیم زیادہ نہ تھی مگر اللہ نے ان کو سنجیدہ دماغ اور غور و فکر کرنے کا مادہ دیا تھا وہ بچوں کی تربیت کے لئے نت نئی باتیں سوچتے رہتے تھے۔

اسکاؤٹنگ کا زمانہ۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ تربیت کا یہ طریقہ درست ہے یا نہیں ۱۹۰۷ء کے موسم گرما میں بی پی نے انگلستان کے ایک جزیرے براؤن سی میں ایک تجرباتی کیمپ لگایا جس میں ۲۰ اسکاؤٹس نے شرکت کی دنیا میں اسکاؤٹنگ کا یہ پہلا کیمپ تھا جو کامیاب رہا اور لارڈ پاول کو یقین ہو گیا کہ اگر لڑکوں کو اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت دی جائے تو کھیل کھیل میں تربیت پا کر وہ ملک و قوم کے اچھے شہری ثابت ہو سکتے ہیں اس تحریک کو ابتداء ہی سے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اور یہ تمام دنیا میں پھیل گئی بی پی ۱۹۱۰ء میں فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد اس تحریک کے سلسلے میں کام پر لگ گئے ۱۹۱۲ء میں انگلستان کی حکومت نے ایک قانون کے ذریعے اس تحریک کو منظور کر لیا جسے رائل چارٹر کہتے ہیں اس وقت دنیا میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ اسکاؤٹ ہیں۔ بی پی کا ۸ جنوری ۱۹۴۱ء انتقال ہوا اور وہ کینیا میں دفن ہوئے۔

پاکستان میں اسکاؤٹنگ

۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بوائے اسکاؤٹ کے سیکریٹری مسٹر جلال الدین شجاع نے تمام صوبوں اور ریاستوں کو مراسلہ بھیجا کہ لوگوں کا پاکستان میں اسکاؤٹنگ شروع کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یکم دسمبر کو پہلی پاکستان بوائے اسکاؤٹس کانفرنس منعقد ہوئی ۲۲ دسمبر ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے پاکستان کے پہلے چیف اسکاؤٹ ہونے کا حلف اٹھایا۔ ۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو پاکستان بوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن ورلڈ بیورو سے رجسٹرڈ ہوئی جو بین الاقوامی اسکاؤٹنگ کا ادارہ ہے ۲۹ جولائی ۱۹۵۹ء کو ایک آرڈیننس کے ذریعے اسکاؤٹنگ کو پاکستان میں سرکاری حیثیت حاصل ہوئی۔

ملک کا صدر چیف اسکاؤٹ ہوتا ہے، ملک میں اسکاؤٹنگ نیشنل ہیڈ کوارٹر (N.H.Q) کے ذریعے منظم کی جاتی ہے اور تمام امور نیشنل کونسل کے مشورے سے انجام پاتے ہیں کونسل کا ایک سیکریٹری ہوتا ہے۔ تربیتی امور کی نگرانی نیشنل ٹریننگ کمشنر کرتا ہے نیشنل کونسل کا سربراہ برائے انتظامی امور چیف کمشنر ہوتا ہے۔

☆ ☆

خوش نصیب شہزادہ

حارث بن صغیر

بادشاہ کی فوجیں میدان جنگ میں شکست کھا چکی تھیں۔ سلطنت ہاتھ سے جاتی رہی اور اب وہ خود اپنی جان بچانے کے لئے دربدر پھر رہا تھا۔ پنجاب کے میدانوں، سندھ کے ساحلوں اور جیسلمیر کے ریگستانوں نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ زمین تنگ ہو گئی تھی اور آسماں دشمن۔ سکھ کی چھاؤں اور آرام کا سایہ اس سے روٹھ گیا تھا۔ جدھر جاتا نامراد لوٹتا۔ بُرے دن کیا آئے تھے کہ اپنوں نے بھی آنکھیں پھیر لی تھیں۔ رشتہ داروں نے ہمدردیاں اور ماتحتوں نے طرفداریاں بدل لی تھیں۔ ایسے میں صرف ملکہ اس کی مونس و غم خوار تھی یا پھر چند جاں نثار۔ جو دریا دریا اور صحرا صحرا اس کے ساتھ تھے۔ بدنصیب بادشاہ جب جودھ پور سے لوٹ کر سندھ آیا تو اپنی ملکہ کو امرکوٹ میں چھوڑ دیا۔ اسی پریشانی اور بے سروسامانی کے عالم میں ایک دن ملازم نے خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو چاند سا بیٹا دیا۔
خوشی سے بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل میں سوچا کہ کیسے دن آئے ہیں۔ شہزادہ کی ولادت ہوئی ہے۔ مگر کوئی خوشی منانے والا نہیں۔ کہیں شہنائی اور شادیانے نہیں بجے۔ کوئی مٹھائی نہیں بٹی کوئی جشن برپا نہیں ہوا۔ اور تو اور ایسے بھی حالات نہیں کہ رواج کے مطابق خوشی کی خبر لانے والے کو

کچھ انعام ہی دیا جاسکے۔ تمام مصاحب بادشاہ کے حالات سے واقف تھے۔ سو مبارکباد کہنے اور خوشی کے کلمات ادا کرنے کے بعد چپ ہی رہے۔ بادشاہ جو خود بہت نازو نعم سے پلا تھا اور تمام آداب شاہی سے واقف تھا بڑا پریشان ہوا۔ ادھر ادھر دیکھا مگر کچھ نہ پایا۔ آخر یاد آیا کہ لباس میں ایک مشک نافہ موجود ہے۔ بس اسی کو نکالا اور توڑ کر ذرا ذرا سا مشک سب کو دیا کہ شگون خالی نہ جائے۔

اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ایسے بے سروسامان بادشاہ کا نومولود بیٹا ہندوستان کا سب سے جلیل القدر بادشاہ بنے گا۔ جی ہاں یہ نومولود اکبر تھا...... شہنشاہ ہمایوں کا بیٹا جلال الدین اکبر۔ اس کی ماں کا نام حمیدہ بانو بیگم تھا۔

اکبر کی پیدائش ۹۴۹ھ میں ہوئی۔ علم نجوم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جس وقت اکبر پیدا ہوا نہایت ہی مبارک گھڑی تھی۔ اتنا مبارک وقت شاید ہی کسی خوش نصیب کو نصیب ہوا ہو۔ ہمایوں خود ہیت اور نجوم کا ماہر تھا۔ وہ اکبر کا زائچہ دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ وہ کئی باتوں میں امیر تیمور سے بھی زیادہ مبارک ہے۔ بلکہ بعض خاص مصاحبوں کا کہنا ہے کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ہمایوں اکبر کا زائچہ دیکھتے دیکھتے اٹھ کھڑا ہوتا۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتا اور بچوں کی طرح تالیاں بجاتا اور خوشی سے ناچنے لگتا۔

اکبر کے بچپن کے حالات بہت زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ لیکن جتنے بھی معلوم ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اس نے کس قدر غیر معمولی حالات میں اپنا بچپن گزارا۔ اس کے حالاتِ زندگی پڑھتے ہوئے فوراً ذہن میں وہ ضرب المثل تازہ ہو جاتی ہے کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔" یعنی بڑے اور قابل آدمی کے آثار پہلے ہی سے نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ ابھی اکبر ماں کے پیٹ ہی میں تھا کہ ایک دن اس کی ماں بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ یکایک اسے کچھ خیال آیا اور اس نے سوئی سے اپنی پنڈلی کو گودا اور اس میں سرمہ بھرنے لگی۔ اسی وقت ہمایوں باہر سے آیا۔ اس نے جب اپنی بیوی کو یہ عجیب و غریب حرکت کرتے دیکھا تو اس کی وجہ پوچھی۔ بیوی نے کہا کہ اس کی خواہش ہے کہ ایسا ہی نشان اس کے بیٹے کی پنڈلی پر بھی ہو۔ اور حیرت کی بات ہے کہ جب اکبر پیدا ہوا تو وہ سرمئی نشان اس کی پنڈلی پر موجود تھا۔

○ ○ ○

ہمایوں اپنا تاج و تخت واپس لینے کے لئے پورا زور لگا رہا تھا۔ مگر قسمت کی دیوی اس پر مہربان نہیں تھی۔ آخر مصاحبوں سے صلاح مشورے کے بعد ایران جانے کا ارادہ کیا کہ وہاں جا کر کچھ فوج جمع کرے

اور دوبارہ قسمت آزمائے۔ ایران کے راستے میں بلوچستان سے گزرتے ہوئے ہمایوں کو خیال آیا کہ ایران تو بہت دور ہے کیوں نہ وادیٔ بولان سے ہوتا ہوا قندھار چلا جائے جہاں اس کا بھائی عسکری مرزا حکومت کرتا تھا۔ ہمایوں کا خیال تھا کہ عسکری مرزا جب اپنے بھائی کو ایسی پریشانی کی حالت میں دیکھے گا تو ضرور برادرانہ محبت جوش مارے گی۔ اور وہ ہمایوں کی اچھی خاطر تواضع کرے گا۔ لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس...... جب عسکری مرزا کو معلوم ہوا کہ ہمایوں قندھار آرہا ہے تو وہ ہمایوں کو گرفتار کرنے کی نیت سے خود قندھار سے باہر چلا آیا۔ لیکن ہمایوں کو بروقت اطلاع مل گئی اور وہ بڑی عجلت میں وہاں سے فرار ہو گیا۔

منزل دور تھی اور راستہ دشوار۔ شیر خوار اکبر کو ساتھ ساتھ لئے پھرنا بہت مشکل تھا۔ اس لئے ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم نے دل پر پتھر رکھا اور اکبر کو میر غزنوی خواجہ سرا اور ماہم اتکہ کے حوالے کر کے خدا کے سپرد کیا۔ اور خود ایران چلے گئے۔ عسکری مرزا جب اس جگہ پہنچا جہاں ہمایوں کا پڑاؤ تھا تو اسے معلوم ہوا کہ ہمایوں فرار ہو چکا ہے۔ اس نے اکبر کے بارے میں استفسار کیا۔ اسے بتایا گیا کہ اکبر موجود ہے۔ اگلی صبح جب عسکری مرزا اکبر سے ملنے کے لئے پہنچا تو عجب منظر تھا۔ میر غزنوی اور ماہم اتکہ کا مارے پریشانی کے خون خشک ہو رہا تھا۔ ننھا سا معصوم بچہ تھا اور ظالم چچا۔ جس نے باپ کو پناہ نہ دی وہ بیٹے کو کیا پناہ دے گا۔ ممکن ہے آتے ہی وہ بچے کو تلوار کی نوک پر پرو دے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم کو کیا جواب دیں گے۔ ایسے ہی وسوسے اور پریشان کن خیال ان کے دماغوں میں آرہے تھے۔ لیکن کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اللہ جب موسیٰؑ کی پرورش خود فرعون کے ہاتھوں کروا سکتا ہے تو اکبر کو عسکری مرزا کیوں نہیں پال سکتا۔ چچا آیا۔ بچے کو دیکھا تو سو جان سے قربان ہو گیا۔ اسے اپنے ساتھ محل میں لے گیا اور اپنی بیوی کو کہا کہ اس بچے کی اچھی طرح پرورش کی جائے۔ بیوی بھی اکبر کے ساتھ بہت محبت اور شفقت سے پیش آئی۔

اکبر کا حافظہ بچپن ہی سے بہت تیز تھا۔ ترکوں کی ایک رسم ہے کہ جب بچہ پاؤں چلنے لگتا ہے تو باپ دادا یا چچا وغیر جو بھی بزرگ موجود ہو وہ اپنے سر سے عمامہ اتار کر بچے کو چلتے ہوئے مارتا ہے۔ اس طرح بچہ گر پڑتا ہے اور خوب خوشی منائی جاتی ہے۔ اکبر کی عمر جب سوا سال کی ہوئی اور وہ پاؤں چلنے لگا تو ماہم نے مرزا عسکری سے کہا کہ یہاں تم ہی اکبر کے بزرگ ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ یہ رسم ادا کر لی جائے۔ سو رسم ادا کی گئی۔ اکبر جب بڑا ہوا تو اکثر کہا کرتا تھا کہ ماہم کا اس رسم کی ادائیگی کے لئے کہنا، عسکری مرزا کا عمامہ پھینکنا اور اپنا گرنا وہ ساری صورت حال مجھے اب تک یاد ہے۔ انہیں دنوں قندھار میں

مجھے بابا حسن کی درگاہ پر حاضری کے لئے لے جایا گیا وہ منظر بھی مجھے یاد ہے۔ واضح رہے کہ ذہین بچے بڑے ہو کر بھی اپنے بچپن کے حالات نہیں بھولتے۔ بو علی سینا کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ وہ جب بہت چھوٹا سا تھا، اتنا چھوٹا کہ بات چیت بھی نہیں کر سکتا تھا تو ایک شخص نے اس کی ٹوپی چرالی۔ جب یہ بڑا ہوا تو ایک دن راہ چلتے اس شخص کو پہچان لیا اور اس پر چوری کا الزام لگایا۔ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پہنچا اور بالآخر چور نے چوری کا اعتراف کر لیا۔

.... ○ .... ○ .... ○ ....

ہمایوں کی قسمت نے پلٹا کھایا اور جب وہ ایران سے ایک لشکر جرار لے کر واپس آیا تو افغانستان میں اس کی آمد کی دھوم مچ گئی۔ اس وقت کابُل پر مرزا کامران کی حکومت تھی۔ اس نے عسکری مرزا کو لکھا کہ اکبر کو میرے پاس بھیج دو۔ چنانچہ اکبر کابل پہنچ گیا۔ اگلے دن شب برات تھی۔ کامران مرزا نے دربار کو خوب سجایا تھا اور اکبر کو بھی دیکھنے کے لئے بلایا گیا۔ وہاں رسم تھی کہ بچے شب برات کو چھوٹے چھوٹے نقاروں سے کھیلتے تھے۔ مرزا کامران نے اپنے بیٹے مرزا ابراھیم کے لئے بہت ہی خوبصورت رنگین نقارہ منگوایا تھا۔ اکبر نے اسے دیکھا تو مچل گیا کہ یہ نقارہ میں لوں گا۔ چچا کو بہت برا لگا۔ دل میں یہ خیال تو نہ آیا کہ معصوم بچہ ماں باپ سے دور ہے اس لئے اس سے شفقت کرے البتہ یہ کہا اچھا دونوں مقابلہ کر لو۔ جو بھی کشتی میں دوسرے کو پچھاڑے گا، نقارہ اسی کا ہو گا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا عمر اور طاقت میں زیادہ ہے آسانی سے اکبر کو ہرادے گا۔ لیکن جب مقابلہ ہوا تو اکبر نے حیرت انگیز طور پر ابراھیم کو اٹھا کر پٹخ دیا۔ سارا دربار اکبر کی اس بہادری پر واہ واہ کرنے لگا۔ کامران مرزا شرمندہ ہوا اور نقارہ اکبر کے حوالے کر دیا۔

اکبر کی عمر اس وقت دو سال آٹھ ماہ تھی جب ہمایوں نے کابل فتح کیا۔ اکبر کو ماں باپ سے بچھڑے ہوئے دو سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ وہ بہت چھوٹا تھا جب ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم اسے چھوڑ کر ایران چلے گئے تھے۔ مگر جب بیسیوں بیگمات کی موجودگی میں اکبر سے کہا گیا کہ جاؤ ماں کی گود میں جا بیٹھو تو اکبر بغیر کسی جھجک کے سیدھا اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ ماں مدت سے اپنے لخت جگر سے دور تھی۔ فوراً اسے سینے سے لگایا اور پیار کیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ نکلے۔ اس ننھی سی عمر میں اکبر کی سمجھ اور پہچان دیکھ کر لوگوں نے اس سے بڑی بڑی امیدیں باندھ لیں۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ ہمایوں کابل سے باہر تھا اور اکبر کابل میں کہ کامران مرزا نے بغاوت کر

دی۔ ہمایوں اس کی سرکوبی کے لئے آیا۔ کامران مرزا قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ ہمایوں نے اس کے قلعے پر گولہ باری شروع کی تو سنگ دل چچا نے ننھے اکبر کو قلعہ کی فصیل پر بٹھا دیا۔ اس گولہ باری میں کوئی بھی گولہ اکبر کی جان لے سکتا تھا۔ لیکن ہمایوں کو جلد ہی صورت حال کا پتہ چل گیا اور یوں اکبر کی جان بچ گئی۔

۹۶۱ ہجری میں ہمایوں ہندوستان کو فتح کرنے کی نیت سے بڑھا۔ اکبر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کی عمر اس وقت تقریباً بارہ سال تھی۔ یہ اکبر کی سپاہیانہ زندگی کا آغاز تھا۔ اس نے مختلف جنگوں میں شرکت کر کے فنون جنگ میں مہارت حاصل کی۔ جالندھر میں ہمایوں نے سکندر سوری کو شکست دی لیکن وہ وہاں سے ہٹ کر سرہند پر جم گیا۔ اس کی سرکوبی کے لئے ہمایوں نے بیرم خان کو فوج دے کر بھیجا۔ اکبر اس فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس وقت بھی وہ عمر کے تیرھویں سال میں تھا۔ لیکن میدان جنگ میں اس نے بہادری اور جنگی حکمت عملی کے وہ نمونے دکھائے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ اسی عمر میں پنجاب کے گورنر کو خود سری کے جرم میں معزول کر کے اکبر کو گورنر بنایا گیا۔

اکبر سکندر سوری سے مقابلہ کر رہا تھا جب یہ بری خبر پہنچی کہ ہمایوں لائبریری کی چھت سے گر کر ہلاک ہو گیا ہے۔ اس طرح تاج شاہی بہت کم عمری میں اکبر کے سر پر آگیا۔ اکبر کی تاج پوشی ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ ہجری کو ہوئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ معصوم بچہ کہ جس کے سر پر باپ کا سایہ بھی نہیں، مشکل سے ہی حکومت کر سکے گا۔ لیکن اکبر نے اپنی خداداد صلاحیت اور اپنے باوفا مشیروں کی مدد سے یہ بھاری ذمہ داری بہت خوبی سے ادا کی۔ ہمایوں کی وفات کے وقت سلطنت کا انتظام بھی ابتر تھا۔ ملک میں ہر روز کہیں نہ کہیں سے بغاوت کی خبر مل جاتی تھی۔ معاشی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن اکبر نے ان سب مشکلات پر قابو پایا۔ اس نے پورے ملک میں تجارتی ٹیکس ختم کر دیا۔ جس سے عوام کو ایک بڑے بوجھ سے نجات ملی۔ نوجوان بادشاہ کا دل رحم کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے سامنے باغیوں اور غداروں کو لایا جاتا تو وہ ان پر ترس کھا کر انہیں چھوڑ دیا کرتا۔ کسی کی سزا قتل سے عمر قید میں بدل دیتا۔

اکبر کی بادشاہت کا زمانہ تاریخ ہند میں عدالت اور انصاف کا سنہری زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ بچپن میں اپنے حالات کی وجہ سے اکبر بالکل بھی نہ پڑھ سکا تھا۔ لیکن اس نے اپنی عقل اور سمجھ داری سے ایسے کام کئے کہ بڑے بڑے عالم حیران رہ جاتے تھے۔ البتہ اکبر نے اپنے باپ کی خواہش پر تھوڑی بہت مصوری ضرور سیکھی تھی۔ بلا شبہ مغل بادشاہوں میں اکبر کا زمانہ ترقی اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔

"مقابلہ"

جو دل ناتواں نے خوب کہا

دنیا بھر میں آئے دنوں اسکول کے بچوں کے مابین مختلف نوعیت کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ ان مقابلوں میں اکثر بہت ذہین بچے نظر آ جاتے ہیں مگر ایسا ذہین بچہ جس نے دس لاکھ بچوں سے مقابلہ کر کے کوئی انعام جیتا ہو واقعی اسکی صلاحیت قابل رشک ہو گی۔

ان تصاویر میں جن بچوں کو آپ دیکھ رہے ہیں انہوں نے نیشنل جیو گرافک سوسائٹی کے تحت ہونے والے ذہانت اور معلومات کے ایک مقابلے میں لاکھوں بچوں کو مات دے کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔

یہ مقابلہ جو جغرافیائی معلومات سے متعلق تھا ۸۲ ہزار اسکولوں کے دس لاکھ بچوں کے درمیان امریکہ میں منعقد ہوا۔ اور امریکہ بھر کے تعلیمی اداروں نے اس میں بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا

اس مقابلے کا مقصد بچوں میں جغرافیہ کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور ان میں اس مضمون کی دلچسپی کو بڑھانا تھا۔

کتنے ذہین
لاکھوں میں تین

نیلام گھر کا نہیں نیشنل جیوگرافک کے مقابلۂ معلومات کا منظر

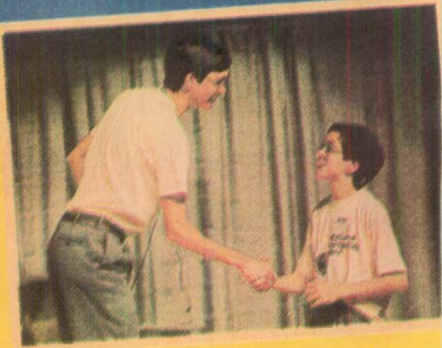

اوّل انعام پانے والا "جیک" سوم آنے والے "کیولیو" سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

۲۵۰ ہزار ڈالر کا اعزازی چیک خوشی سے دکھاتے ہوئے نو عمر جیک۔

ممکن ہے آپ یہ سمجھ رہے ہوں کہ اس مقابلے میں جیتنے والوں کو کچھ کتابیں کاپیاں، یا کلر بکس تحفے میں ملے ہوں، جی نہیں یہ سن کر آپ کے منہ حیرت سے کھلے رہ جائیں گے پہلا انعام تھا، دو سو پچاس ہزار ڈالر یعنی پاکستانی کرنسی میں تقریباً ۵۸ لاکھ روپے۔ دوسرا انعام پانے والے کو ۱۵ ہزار ڈالر اور تیسرا انعام حاصل کرنے والے کو دس ہزار ڈالر ملے جو بچے علم کی دولت سے مالا مال تھے وہ دیکھتے ہی دیکھتے ڈالر کی دولت سے بھی مالا مال ہو گئے ہے۔ نا حیرت کی بات؟

(شعبہ تحقیق و تلاش ماہنامہ آنکھ مچولی)

فاروق عادل

مسٹر بروس امریکہ کے ممتاز ماہر معاشیات ہیں، انہوں نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں دنیا بھر کے سفر کئے اور بہت کچھ دیکھا اور سیکھا، انہوں نے اپنے مشاہدات میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کے لئے کچھ عرصہ قبل اپنی یاد داشتیں شائع کیں جس کا ایک حصہ امریکہ کے معروف ماہنامے "ریڈرز ڈائجسٹ" میں شائع ہوا، جس میں ایک بچے کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس نے مسٹر بروس کی مدد سے ایک چھوٹے کاروبار کا آغاز کیا اور ایک دن وہ اپنے ملک کا کامیاب صنعت کار بن گیا۔

پیرو کے شہر لیما کی شامیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ ان میں آدمی کا خواہ مخواہ دل چاہتا ہے کہ وہ ہوٹل سے (یا گھر سے) باہر نکلے اور گھومے۔ ایک ایسی ہی شام کو میں بھی ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ پہلے کشادہ سڑکوں پر چہل قدمی کرتا رہا پھر تنگ بازاروں کی طرف آنکلا۔ اس غریب ملک کے بازاروں میں اس وقت زندگی عروج پر ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ کھانے پینے کا سامان خریدنے کے لئے بازاروں میں آتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ لوگ انہیں دیکھنے کے لئے آنکلتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک میں بھی تھا۔

مجھے گھومتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ اور اب میں کچھ تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ میں لیما کے لوگوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے سے ریستوران کی تلاش میں تھا۔ کہ ایک آواز سن کر چونکا، کوئی کہہ رہا تھا۔ "سینور! (سر) ایک مفلس لڑکے کے لئے آپ کے پاس سو سول کا کوئی کام ہوگا۔" (سول مقامی کرنسی کا نام ہے اور ایک سول امریکہ کے ۲۲ سینٹ کے برابر ہوتا ہے) میں نے گردن موڑ کر دیکھا، دس گیارہ سال کا ایک لڑکا میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے اور اس کی ٹی شرٹ پھٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہوشیاری اور ذہانت کی چمک تھی۔ مجھے متوجہ دیکھ کر اس نے اپنا سوال دہرایا۔ "اچھا تو یہ مجھ سے مخاطب ہے۔" میں نے سوچا۔ تیسری دنیا کے اکثر شہروں کی طرح لیما بھی مفلس بچوں سے بھرا ہوا ہے۔ جن میں سے اکثر خود کو یتیم بتاتے ہیں اور سیاحوں کو سونے کی چڑیا سمجھ کر ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ ایسے بچوں میں سے ایک ہے، لیکن جب میں نے اس کی بات پر غور کیا تو مجھے لگا کہ یہ بچہ کچھ مختلف ہے، اس نے مجھ سے بھیک نہیں، کام مانگا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم تو ابھی بہت چھوٹے ہو، تم میرا کیا کام کر سکتے ہو؟

"اوہ! یہ ٹھیک ہے، مگر بہت سے سیاح مجھ سے کام لے لیتے ہیں، ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔" یہ کہہ کر مڑا اور وہ جانے لگا، مجھے یاد آیا کہ میں ایک اچھے سے ریستوران کی تلاش میں ہوں اور مزید بھٹکنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے واپس جا کر بچے کو بلایا اور بتایا کہ وہ میرے لئے کیا کر سکتا ہے۔ اب وہ بہت خوش تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ مجھے لیما کے بہترین ریستوران میں لے جا سکتا ہے جو یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ چند منٹوں کے بعد وہ واقعی مجھے ایک اچھے ریستوران میں لے گیا۔ اتنی جلدی میں یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا کیوں کہ لیما کے بھول بھلیوں جیسے بازاروں میں راستہ تلاش کرنا اتنا آسان نہیں۔

میں اقتصادی ترقیات کا ایک بین الاقوامی ماہر ہوں اور اس حیثیت سے میں نے دنیا بھر کی سیر کی ہے۔ میں نے اس طرح کے مفلس بچوں کو ہر جگہ دیکھا ہے، جو بھیک بھی مانگتے ہیں۔ مگر مجھے یہ بچہ ان بچوں سے بہت مختلف محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اس کا دل جوش و جذبے سے معمور ہے اور وہ زندگی سے محبت کرتا ہے۔ میں نے اس کے لئے بھی چائے بنائی اور پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے"؟ "ڈیوڈ" اس نے قدرے پرجوش ہوتے ہوئے بتایا۔ "میرا نام بروس ہے۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ "اچھا تو آپ سینور بروسے ہیں۔" ڈیوڈ نے بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے میرے امریکی نام کو اسپینی نام بنا دیا۔ میں کچھ دیر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اور پھر پوچھا۔ "ڈیوڈ! تم کیا کرنا چاہتے ہو" یہ سوال میں نے اس سے اس لئے پوچھا کہ وہ کم از کم اسکول تو نہیں جاتا تھا۔ جیسا کہ اس کے سراپا سے ظاہر تھا، لیکن مجھے اس کی بعد کی گفتگو سے پتہ چلا کہ اس کے پاس انگریزی ناول اور ایک انگریزی اسپینی ڈکشنری بھی ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی کہ وہ پڑھنا جانتا تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا "میں جوتے پالش کرنے کا اپنا ذاتی کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے جواب میں ایک بھرپور اعتماد تھا، جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور یہ کہ جو وہ کہہ رہا ہے کر کے دکھائے گا، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس کاروبار شروع کرنے کے لئے رقم ہے تو اس نے اپنی پرانی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو سول کا ایک بنڈل نکال کر مجھے دکھایا۔ پیرو جیسے غریب ملک میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے پاس اتنی رقم کا ہونا بڑی بات تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ رقم تم نے کہاں سے حاصل کی۔ "سیاحوں سے" اس نے مختصر جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مزید وضاحت کی "اسی طرح جس طرح میں آپ کی سروس کر رہا ہوں" اس کا خیال تھا کہ سیاح سونے کی چڑیا ہوتے ہیں۔ اور ان کے معمولی کام کر کے کافی کچھ کمایا جا سکتا ہے۔

"ڈیوڈ! میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو اس کی کٹورا سی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور ٹشو سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ میں نے کہا۔ "تم مجھے اپنے کاروبار میں سرمایہ دار کے طور پر شریک کر لو، اگر تم نے مجھے اپنی آمدنی میں شریک رکھا تو جتنی رقم کی تمہیں ضرورت ہوگی وہ میں تمہیں دے دوں گا، کیا یہ ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "کیوں کہ سرمایہ داری تو ایک لعنت ہے۔"

میں اس کے بے ساختہ جواب پر حیران نہیں ہوا کیوں کہ پوری تیسری دنیا میں امریکیوں پر اس طرح کے جملے کسے جاتے ہیں۔ اور یہ لڑکا بھی چوں کہ سیاحوں کے ساتھ رہتا تھا اس لئے اس نے بھی ملک ملک کے لوگوں کی باتیں سن کر یہ جملہ سیکھ لیا ہو گا۔ البتہ یہ جواب سن کر مجھے ڈیوڈ کے بھولپن اور معصومیت پر پیار آگیا۔ اور میں نے اسے سمجھایا کہ اس طرح کی سرمایہ داری کوئی بری بات نہیں۔ پھر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ مجھے اپنے کاروبار میں شریک کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے کہا، ''لیما میں اس طرح جوتے پالش کرنے والے بے شمار لڑکے ہوں گے۔ تم اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان اپنے نئے کاروبار کو کیسے جما سکو گے؟'' میری بات سن کر ایک لمحے کے لئے اس نے میری طرف دیکھا اور پھر بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں ان سب سے بہتر ہوں۔'' میں اس کے اعتماد سے متاثر ہوا اور اسے مشورہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اگر تم ان سب سے بہتر ہو تو تم زیادہ اچھی سروس دے کر زیادہ معاوضہ طلب کر سکتے ہو۔'' ''واقعی!'' اس نے مسرت اور خوشی کے ساتھ سوال کیا۔ میں نے نرمی کے ساتھ اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کی اور اسے یقین دلایا کہ ''ہاں واقعی۔'' پھر ہم نے اس کے لئے جوتے پالش کرنے کا سامان خریدا۔ اور ایسی جگہ کا انتخاب کرنے کے لئے جہاں ڈیوڈ کو کاروبار شروع کرنا تھا ٹیکسی میں بیٹھ کر مختلف جگہوں پر گھومتے رہے اور بالآخر شیرٹن ہوٹل کے سامنے کی جگہ منتخب کی، اس دوران ہم نے بہت سی باتیں کیں اور یہ طے کیا کہ کسی بھی کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ ''قابلیت محنت اور بہتر سروس۔'' شیرٹن ہوٹل کے سامنے جوتے پالش کرنے والے دیگر چند لڑکوں کی طرح جب ڈیوڈ بھی اپنا سامان سجا چکا تو وہ چونک کر کھڑا ہو گیا اور بولا، ''میں تو بھول ہی گیا تھا سینور! اس کاروبار میں آپ کا حصہ کیا ہو گا .... کیا نصف؟''

میں نے اس نو آموز کاروباری کا رویہ جانچنے کے لئے چند لمحے تک کچھ جواب نہ دیا۔ اور جب وہ اسی طرح سوال بنا کھڑا رہا تو میں نے ہولے سے کہا۔ ''نہیں .... ایک فیصد۔'' اس کا چہرہ فرط مسرت سے چمک اٹھا اور وہ چلایا، ''سینور! آپ تو واقعی کسی ملک کے شہزادے ہیں۔''

اب میں اس کا بزنس پارٹنر تھا۔ اور اس کے کاروبار کی ترقی سے مجھے بھی دلچسپی تھی، میں نے ہوٹل کی لابی میں ایک انگریز سیاح سے بات کی جس کے جوتے بہت گندے ہو رہے تھے اور شائد وہ اپنے جوتے پالش بھی کرانا چاہتا تھا۔ وہ اس شہر کے موچیوں سے سخت نالاں تھا جو بہت گھٹیا پالش استعمال کرتے تھے۔ اس نے منہ پھلا کر کہا کہ ''ان کم بختوں نے تو میری پینٹ کا بھی ناس مار دیا ہے۔'' اس نے پائنچہ اٹھا کر

مجھے اس پر لگی ہوئی پالش بھی دکھائی، میرے کہنے پر وہ ڈیوڈ کے پاس چلنے پر آمادہ ہوگیا، میں نے اس موقع پر انگریز سیاح سے بات کرتے ہوئے اپنے نوخیز پارٹنر کی طرف غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر پختہ کاروباریوں جیسی سنجیدگی تھی، لیکن اس کے باوجود میں نے اس سے کہا، "دیکھو ڈیوڈ! اگر تم نے گندی پالش استعمال کی جس نے ان کی پینٹ کو بھی خراب کر دیا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا اور پھر ہماری دوستی اور پارٹنر شپ بھی ختم ہو جائے گی۔" ڈیوڈ نے ایک عزم کے ساتھ میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ یہی اس کا جواب تھا اور شاید یہی بہتر جواب بھی تھا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے انگریز سیاح کے جوتے کو بالکل نیا روپ دے دیا۔ انگریز سیاح نے خوش ہو کر کہا "تم نے تو کمال کر دیا، میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا" (جب انگریز نے کہا کہ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا تو مجھے لگا کہ اس انگریز کو شاید بڑی بڑی باتیں کرنے کی عادت ہے لیکن بعد میں مجھے اس کی یہ بات بہت اہم لگی۔) ڈیوڈ نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا، اس نے اپنے کیریئر کا آغاز بڑی کامیابی سے کر لیا تھا میرا خیال تھا کہ ڈیوڈ اس کام کا معاوضہ تین سو سول طلب کرے گا جو عام ریٹ سے چھ سینٹ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن انگریز سیاح نے اسے پانچ سو سول کا نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ "بہترین کام کا بہترین معاوضہ ہوتا ہے، میں اپنے اور دوستوں کو بھی تمہارے پاس بھیجوں گا، اچھا خدا حافظ۔" انگریز بے حد خوش تھا۔

معاوضہ وصول کرتے ہوئے ڈیوڈ کی آنکھیں بھیگ گئیں اس نے جب انگریز سیاح کا شکریہ ادا کیا تو اس کی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی۔ کیوں نہ ہوتی یہ اس کی پہلی کمائی تھی، وہ ٹکٹکی باندھ کر اس رقم کو دیکھتا رہا، یہ خوشی کے لمحات تھے، یہ لمحے اس سے چھین لینا بڑا ظلم ہوتا، میں نے کوئی مداخلت نہ کی اور اس پر ایک نظر ڈال کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

میں کمرے میں آکر اس کے بارے میں سوچتا رہا، اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بالکونی میں آتا اور اپنے پارٹنر پر ایک نظر ڈال لیتا، تھوڑی دیر پہلے میں اس پر نظر ڈال کر اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور آواز آئی I am Zee (The) best سینور! اور ساتھ ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہوٹل کا کوئی آدمی کہہ رہا تھا کہ ابھی دروازہ نہ کھولوں کیوں کہ ایک آوارہ لڑکا میرے کمرے میں گھسنا چاہتا ہے۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میں نے اسے بتایا کہ وہ "آوارہ" لڑکا میرا بزنس پارٹنر ہے۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو ڈیوڈ کے ہاتھوں میں بہت سارے نوٹ تھے اور وہ خوشی سے کپکپا رہا تھا اور اس کے منہ سے بے خودی کے عالم میں طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ بولا "مجھے نہیں معلوم کہ

اتنے بہت سارے پیسوں میں سے آپ کے پیسے کتنے ہیں یہ پیسے جتنے بھی ہوں مجھے آپ کو ضرور دینے ہیں' پھر اس نے میرے نو ڈالر ادا کرنے کے بعد پیسے گنے تو ابھی اس کے پاس تین ڈالر تھے اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے بہت کمالیا ہے۔ پھر وہ جانے کے لئے اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا، "سینور! ایک دن آئے گا کہ میرے پاس بہت سارے پیسے ہوں گے اور میں آپ سے ملنے امریکہ آؤں گا۔" میں نے اس کا مصافحہ کے لئے بڑھایا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبالیا اور کہا "یہ بہت خوبصورت خیال ہے، لیکن یاد رکھو کہ تمہیں اپنے پیرو کے لئے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔"

میں بوڑھا ہو چکا ہوں، اب میں دنیا میں نہیں گھومتا، صرف اپنے گھر میں رہتا ہوں اور اپنی یادیں دہراتا رہتا ہوں، مجھے پیرو کا ڈیوڈ نامی بچہ بہت یاد آتا ہے جو جوتے پالش کیا کرتا تھا۔ اور جسے انگریز سیاح نے کہا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا اور میں نے سوچا تھا کہ انگریز کچھ زیادہ جذباتی ہو گیا ہے۔ وہ ڈیوڈ پیرو کے ایک بہت بڑے کارخانے کا مالک ہے جہاں بوٹ پالش تیار ہوتی ہے۔ اس کے کارخانے میں ڈیوڈ جیسے بہت سے بچے اور لڑکے کام کرتے ہیں جو پہلے ڈیوڈ ہی کی طرح سڑکوں پر گھومتے تھے۔ بچوں کا کارخانے میں کام کرنا زیادہ اچھا نہیں سمجھا جاتا، لیکن پیرو جیسے ملکوں میں اسے زیادہ برا بھی نہیں سمجھا جاتا۔ ڈیوڈ نے اپنے پیرو کے لئے بہت کچھ کیا ہے، اس نے میری نصیحت یاد رکھی، اس انگریز سیاح کو پتا نہیں اپنی بات یاد ہے یا نہیں مگر مجھے ڈیوڈ ہمیشہ یاد رہے گا۔

عزت

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کو بچپن میں بحری فوج میں داخل ہونے کا شوق پیدا ہوا اور اسے ایک خدمت سپرد کی گئی۔ سمندر کا سفر اختیار کرنے سے پہلے وہ اپنے گھر میں خدا حافظ کہنے آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی ماں اپنے بیٹے کے جدا ہو جانے کے خیال سے رو رہی ہے۔ اپنی ماں کو اس حالتِ رنج و غم میں دیکھ کر وہ سیدھا جہاز کی طرف گیا اور نوکروں سے کہا کہ تمام سامان جہاز سے اتار لیا جائے اور یہ کہتے ہوئے اس روز سفر کا ارادہ ترک کر دیا کہ "میں اپنی خاطر اپنی پیاری ماں کو دریائے غم میں نہیں ڈبونا چاہتا۔" اس پر اس کی ماں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہنے لگی "پیارے جارج! خدا ان بچوں پر اپنی برکت نازل کرتا ہے جو اپنی ماؤں کی عزت اور فرمانبرداری کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خدا تمہیں اس محبت اور عزت کا ضرور اجر دے گا۔"

بچوں کی ہو گئی ہے حکومت جہان پر

شاہنواز فاروقی

کل رات ہم نے دوستو دیکھا عجیب خواب
دیکھا کہ سب بڑوں کی ہے حالت بہت خراب
سر درد ہے کسی کو، کسی کو بخار ہے
رنجیدہ ہے کوئی، تو کوئی شرمسار ہے
ہر سمت ایک بھیڑ ہے، ہر سمت شور ہے
اک واقعہ ہر ایک جگہ زیرِ غور ہے
فقرہ یہی رواں ہے ہر اک کی زبان پر
بچّوں کی ہوگئی ہے حکومت جہان پر
سارے جہان میں ہے یہی ایک رائے عام
بچّے بڑوں سے لیں گے بڑا سخت انتقام
برعکس اس کے خیر سے بچّے ہیں سب نہال
اتنے نہال گال ہیں سب کے خوشی سے لال
اتراتے پھر رہے ہیں خوشی سے ادھر ادھر
آتا ہے راستے میں بڑا جب کوئی نظر

سب مل کے ایک ساتھ لگاتے ہیں قہقہے
اور چیختے ہیں مل کے "بُرے دن چلے گئے"
بچّوں کے جھرمٹوں میں ہے بس گفتگو یہی
بدلے گی اب جہان میں بچّوں کی زندگی
اسکول اب کُھلیں گے جہاں میں کبھی کبھی
اور ٹافیاں ملیں گی ہر اک ملک میں فری
محروم ہوں گے ووٹ کے حق سے سبھی بڑے
بچّے ہُوا کریں گے الیکشن میں اب کھڑے
اس مرحلے پہ خواب کے ایکدم مجھے لگا
آکر مرے پلنگ پہ بادل کوئی ہنسا
آنکھیں کھلیں تو ہم نے یہ فوراً سمجھ لیا
کوئی ہمارے جسم پہ لوٹا اُلٹ گیا
کھلتے ہی آنکھ پھر سے حقیقت ہوئی بحال
ہونے لگا خراب بہت میرے دل کا حال
تب میں نے کی دعا یہ خدا کی جناب میں
بچوں کی زندگی ہے نہایت عذاب میں
کر دُور تو ہماری سبھی مشکلات کو
یاپھر دکھا یہ خواب ہمیں روز رات کو!

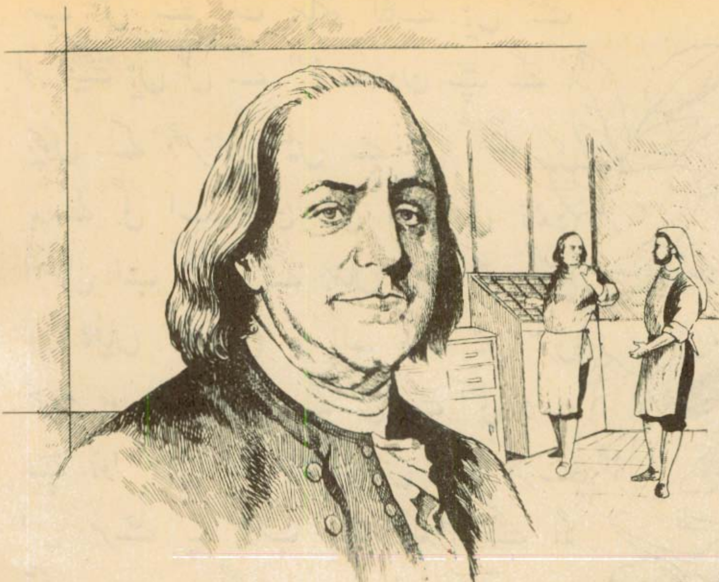

ہم لڑکپن کیسے گزاریں؟

ترتیب و نظر ثانی

م۔ الف راشد

بنجمن فرینکلن کے بچپن کے قصے

بنجمن فرینکلن مشہور امریکی مدبر، سائنس دان اور مصنف تھا۔ وہ ۱۷۰۶ء میں امریکہ کے ایک علاقہ بوسٹن میں پیدا ہوا۔ اس کے ماں باپ انتہائی غریب تھے۔ لیکن اس نے اپنی خداداد صلاحیت اور محنت سے دنیا میں بہت نام پیدا کیا۔ شروع میں وہ چھاپہ خانہ میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ۱۷۴۹ء تک چھاپہ خانہ کے ذریعے اس نے کافی دولت کمائی اور پھر سائنس کے تجربات میں منہمک ہو گیا۔ اس نے ثابت کیا کہ آسمانی بجلی دراصل زمینی بجلی ہی کا حصہ ہوتی ہے۔ اس نے بجلی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے فرق کو واضح کیا۔ ان انکشافات سے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

اسمبلی کا ممبر منتخب ہو کر فرینکلن نے ۱۷۵۴ء میں پہلی بار امریکن نو آبادیات کی فیڈریشن کا منصوبہ پیش کیا۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۷۷۱ء تک انگلستان میں رہ کر اس نے سٹیمپ ایکٹ کو ختم کرنے کے لئے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا۔ امریکہ واپس جاکر فرینکلن نے اعلان آزادی کا مسودہ تیار کرنے میں مدد دی اور ۱۷۷۴ء سے ۱۷۸۵ء تک فرانس میں سفیر کی حیثیت سے اس نے فرانس اور برطانیہ سے صلح کی بات چیت کی۔ ۱۷۸۵ء سے ۱۷۸۸ء تک وہ پنسلوانیہ کا صدر بنا رہا اور امریکہ کا آئین بنانے میں مدد دی۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس نے خود اپنی سوانح عمری لکھی۔

اوپر کی سطروں میں بنجمن فرینکلن کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے اور مضمون کے شروع میں ہم نے لکھا تھا کہ فرینکلن ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ ایک غریب بچہ شہرت اور عظمت کی ان بلندیوں پر کیسے پہنچا۔ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ اپنے حالات کی وجہ سے فرینکلن کو بچپن میں پڑھنے کا بالکل موقع نہ ملا اور اسے کم عمری ہی سے محنت مزدوری کرنا پڑی۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے چھاپہ خانے میں مزدوری کرتا تھا۔ حالات ناموافق ہونے کے باوجود فرینکلن کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اور اسے جیسے ہی موقع اور وقت ملتا وہ کچھ نہ کچھ مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ چھاپہ خانہ کے مزدور دوپہر میں کھانے کے لئے چھٹی کیا کرتے تو بہت سا وقت آنے جانے میں صرف ہو جاتا۔ فرینکلن نے اپنے بھائی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ کھانے کا نصف معاوضہ اسے نقد ادا کر دیا کرے تاکہ وہ اپنا کھانا یہیں چھاپہ خانہ میں منگوا کر کھا لیا کرے۔ بھائی یہ بات مان گیا فرینکلن خشک روٹی اور کشمش وغیرہ خشک میوے اپنے ساتھ لے آتا اور وہیں چھاپہ خانہ میں پانی کے ساتھ کھا لیا کرتا۔ اس طرح وہ جو وقت بچاتا اسے مطالعے میں صرف کرتا۔ فرینکلن نے اس ترکیب سے پڑھنے لکھنے میں کافی سمجھ بوجھ حاصل کر لی۔

بنجمن فرینکلن کا بھائی طبعاً ذرا سخت مزاج تھا۔ اس لئے بنجمن کی اس کے ساتھ زیادہ نہ نبھ سکی اور وہ بوسٹن کو چھوڑ کر نیویارک آ گیا۔ نیویارک تک کا کرایہ اس نے اپنی کتابیں بیچ کر حاصل کیا۔ لیکن یہاں اسے کوئی کام یا مزدوری نہ مل سکی اور اسے نیویارک سے فلاڈلفیا جانا پڑا۔ جب وہ فلاڈلفیا پہنچا اس کی جیب میں صرف تین پیسے تھے جن سے اس نے روٹی خریدی اور کھالی۔ یہاں جلد ہی اسے ایک چھاپہ خانے میں سیسے کے حروف جوڑنے کی ملازمت مل گئی اور اس نے کئی دوست بھی بنا لئے۔ بعد میں اپنا چھاپہ خانہ کھول لیا۔

بنجمن فرینکلن کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کی

غور و فکر اور ہر کام کو منظّم طریقے سے کرنے کی عادت ہے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں وہ اپنے بچپن کے واقعات بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک بار جب اس کی عمر چھ سات سال تھی تو وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک شخص آیا جس کے پاس ایک کلہاڑی تھی۔ اس چالاک شخص نے بنجمن کی خوشامد اور تعریف کر کے کلہاڑی کی دھار لگانے کے لئے اس سے سان گھموائی۔ بنجمن لکھتا ہے کہ یہ کام میرے لئے بہت مشکل تھا لیکن اس آدمی نے جس طرح میری تعریفیں کی تھیں اس کے پیش نظر میں نے یہ انتہائی محنت طلب کام کر دیا۔ لیکن جیسے ہی اس آدمی کا کام نکلا اس نے تعریفیں بند کیں اور الو کا پٹھا کہتے ہوئے وہاں سے بھگا دیا۔ بچپن کا یہ واقعہ بنجمن کے ذہن پر ساری عمر نقش رہا اور اس کے بقول وہ جب بھی کسی سیاستدان کو جھوٹے دعوے کرتے دیکھتا یا کسی شخص کو خوشامد کرتے پاتا تو سمجھ جاتا کہ لوگوں کو بے وقوف بنایا جارہا ہے اور کام نکلنے کے بعد یہ شخص لوگوں کو سوائے دھکوں کے اور کچھ نہ دے سکے گا۔

فرینکلن کو بڑا آدمی بنانے میں اس کی منظّم شخصیت کا بڑا دخل تھا۔ ایک منظّم شخصیت بننا بذات خود ایک مشکل اور تکلیف دہ عمل ہے لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ جو شخص اس عمل سے گزرا اس نے دنیا میں ضرور نام پیدا کیا۔ اپنے بچپن میں تعلیم سے محرومی کی کمی کو پورا کرنے کے لئے فرینکلن نے بہت محنت کی۔ اور ایک ایسا طریقہ کار اپنایا کہ جس پر چل کر وہ اس اعلیٰ مقام تک پہنچا جہاں ایک عالم نے اس کی عظمت کو تسلیم کیا۔ اپنی سوانح عمری میں اس نے وہ طریقہ بھی درج کیا ہے تاکہ بعد میں آنے والے طلبہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ آنکھ مچولی کے قارئین کے لئے بلند مقام حاصل کرنے کا یہ آزمودہ نسخہ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

حدیث نبویؐ ہے کہ:

''وہ شخص گھاٹے میں رہا جس کا آج اس کے گزشتہ کل سے بہتر نہیں۔''

اس حدیث کا آسان مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے روز مرہ کام کا جائزہ لینا چاہئے کہ اس نے ایک دن میں کیا کیا کام بھلائی کے کیئے اور کون کون سے گناہ اس سے سرزد ہو گئے ہیں۔ اگر ہر رات کو سونے سے پہلے انسان اپنے پورے دن کی کارگزاری کا حساب کرے اور جو جو کوتاہیاں اس سے سرزد ہو گئی ہوں اگلے دن ان کے تدارک کی کوشش کرے تو آہستہ آہستہ وہ کامیابی کی منزل کی طرف بڑھتا رہے گا۔

فرینکلن نے بالکل یہی طریقہ کار اپنایا تھا۔ اس نے تیرہ ایسی نیک عادات کو چنا کہ جنہیں وہ

پورے طور پر اختیار کرنا چاہتا تھا۔ ان عادات کا نام اور وہ کیفیت جو ان سے مراد تھی درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	نام	مطلب کی مختصر تفصیل
۱	پرہیز	اتنا مت کھاؤ کہ ست ہو جاؤ۔
۲	خاموشی	ایسی باتیں کرو جو تمہارے اور دوسروں کے لئے فائدہ مند ہوں۔ فضول گفتگو سے پرہیز کرو
۳	باقاعدگی	تمہاری ہر چیز کے لئے جگہ معین ہونی چاہئے اور چیز کو اپنی جگہ پر ہونا چاہئے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہو اور ہر کام مقررہ وقت پر ہو۔
۴	ارادہ	جو کام ضروری ہے اس کے پورا کرنے کا ارادہ کرو اور جس کا ارادہ کر لو اس کو ضرور پورا کرو۔
۵	کفایت شعاری	وہ خرچ کرو جس سے تم کو یا دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ یعنی فضول خرچ مت بنو۔
۶	محنت	وقت بالکل ضائع نہ کرو۔ ہر وقت کسی مفید کام کے کرنے میں مشغول رہو تمام غیر ضروری کاموں کو چھوڑ دو۔
۷	سچائی	کسی کو دھوکہ نہ دو۔ نیکی اور انصاف کے ساتھ غور کرو۔ اور جب بولو تو اس کے مطابق بولو۔
۸	انصاف	کسی آدمی کو تکلیف پہنچا کر یا ان حقوق کو فراموش کر کے جو تمہارا فرض ہیں، بے انصافی مت کرو۔
۹	اعتدال	حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اور اگر لوگ تکلیفیں پہنچائیں تو جہاں تک برداشت کر سکتے ہو اسے برداشت کرو۔
۱۰	صفائی	جسم یا کپڑے یا گھر میں کسی میلی چیز کے روادار مت بنو۔
۱۱	تحمل	چھوٹی چھوٹی باتوں پر یا ایسی باتوں پر جو لا علاج ہوں غصہ مت کرو۔

۱۲ پاک دامنی ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی کوشش کرو۔

۱۳ انکسار حضرت عیسٰی اور سقراط کی پیروی اور نقل کرو۔

(نوٹ :۔ ہم مسلمان ہیں اس لئے اپنے پیارے نبیؐ کی پیروی ہمارا فرض ہے۔) (ادارہ)

اس کے بعد اس نے ان تیرہ صفات کی مشق اس طرح کرنی شروع کی کہ ایک چھوٹی سی ڈائری کے ہر صفحہ پر ان تیرہ صفات کو لکھ کر ان کے مقابل ہفتہ کے دنوں کا جدول کھینچ دیتا اور ہر شام کو اپنی دن بھر کی کارروائی کو دہرا کر وہ دیکھتا کہ کس کس نیک بات کو اس نے دن میں پورا نہیں کیا۔ اور اس دن میں اس صفت کے خانے کے مقابل میں وہ ایک (※) نشان لگا دیتا جس سے ہفتہ کے بعد اسے ایک نظر دیکھ لینے سے معلوم ہو جاتا کہ اس ہفتہ میں اس نے اپنے نیک ارادوں میں کوئی معقول ترقی کی ہے یا تنزلی کا شکار رہا ہے۔ یا پہلی ہی حالت میں رہا ہے۔ ہفتہ بھر کا نقشہ بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔

نام اوصاف	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
پرہیز							
خاموشی	※	※		※	※		
باقاعدگی	※	※			※	※	※
ارادہ		※				※	
کفایت شعاری		※				※	
محنت			※				
سچائی							
انصاف							
اعتدال							
صفائی							

تحمل
پاک دامنی
انکسار

فرینکلن کے اس نقشہ کی مدد سے آج بھی جو سعادت مند بچہ اور نوجوان چاہئے ان نیک صفات کو اپنا سکتا ہے۔ کیونکہ جو عادتیں بچپن میں ڈالی جائیں وہ عمر بھر نہیں بدلتیں بلکہ طبیعت ثانی ہو جاتی ہیں۔

فرینکلن نے ان نیک صفات کو جس محنت اور جان فشانی سے اپنی طبیعت کا حصہ بنایا ان میں سے صرف ایک کی مثال بیان کرتے ہیں۔

اس نے اپنے وقت کو بالکل ٹھیک استعمال کرنے کے لئے دن کے چوبیس گھنٹوں کو اس طرح تقسیم کیا

وقت	گھنٹہ	کام
صبح سوال:۔ آج کے دن میں کیا نیک کام کروں گا۔	۵ ۶ ۷	جاگنا۔ غسل کرنا۔ عبادت کرنا۔ دن کا کام تجویز کرنا اور ارادہ کرنا مطالعہ اور ناشتہ۔
قبل دوپہر	۸ ۹ ۱۰ ۱۱	کام
دوپہر	۱۲ ۱	پڑھنا یا اپنا حساب دیکھنا اور کھانا کھانا
تیسرا پہر	۲ ۳ ۴ ۵	کام

شام آج میں نے کون سانیک کام کیا ہے	٦ ٧ ٨ ٩	چیزوں کو اپنی جگہ پر رکھنا۔ رات کا کھانا۔ موسیقی یا دل بہلانا یا گفتگو، دن بھر کا امتحان
رات	١٠ ١١ ١٢ ١ ٢ ٣ ٤	سونا۔

وقت کی پابندی کی عادت جتنی ضروری ہے اتنی ہی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس کے فائدے ان مشکلات سے کہیں زیادہ ہیں جو اسے اختیار کرنے میں پیش آتی ہیں۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ میں جب لڑکا تھا تو میں اکثر بہت سستی کرتا تھا پڑھتے وقت اور سست لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ایک دن استاد نے ہمیں کہا کہ لڑکو تم کو سست نہیں ہونا چاہئے۔ اپنی کتابوں پر خوب دھیان لگاؤ۔ جو لڑکا کسی دوسرے لڑکے کو غافل دیکھے فوراً مجھ کو اطلاع دے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اب فلاں لڑکے سے جو نہایت کاہل اور سست ہے بدلہ لینے کا خوب موقع ہاتھ آیا ہے۔ میں اس کی تاک میں رہوں گا اور جب اس کی نظر کتاب سے اٹھی ہوئی دیکھوں گا تو فوراً استاد سے کہہ دوں گا تھوڑی ہی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ اس لڑکے کی نظر کتاب سے ہٹی ہوئی ہے۔ میں تو تاک لگائے بیٹھا ہی تھا فوراً میں نے استاد سے جاکر کہہ دیا۔ استاد نے کہا کہ "بھلا تم کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکا غافل تھا"؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تب استاد نے کہا کہ "کیا اس وقت تمہاری آنکھ کتاب پر تھی جب تم نے اسے غافل دیکھا؟" میں اس کا جواب نہ دے سکا اور سب لڑکے ہنسنے لگے اس دن سے میں نے بالکل غافل لڑکوں کی فکر نہیں کی بلکہ ہمیشہ کتاب پر نظر رکھتا ہوں۔

مستقبل اِن بچوں کا

ظفراللہ ضیا

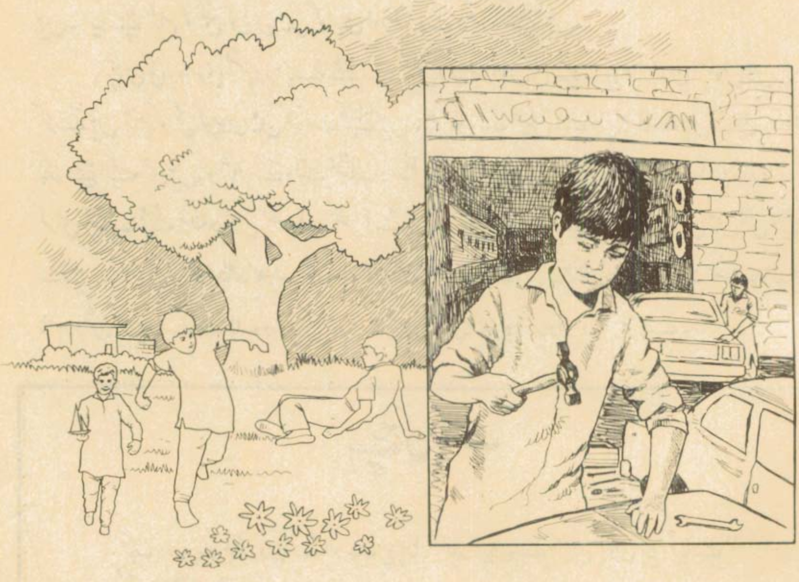

میں پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر کمالیہ کا باسی ہوں۔ یہ شہر فیصل آباد ڈویژن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ایک تحصیل ہے۔ قالین بافی، پولٹری فارم اور مشہور زمانہ کھدر بنانے میں اس شہر کا اپنا مقام ہے۔ میں شہر کے وسط میں صدر بازار سے ملحقہ محلے میں رہائش پذیر ہوں۔ میں نے اسی محلے میں آنکھیں کھولیں اور اپنے

بچپن کے دن گزارے۔ اب جبکہ میں لڑکپن کی منزلیں طے کر رہا ہوں۔ گلی کوچوں میں کھیلتے بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن اور بچپن کے دن بڑی شدت سے یاد آجاتے ہیں میرے محلے میں جو لوگ آباد ہیں۔ ان میں تاجر، ملازم، مزدور اور زمیندار غرض ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ اور ان سب کے بچے شام کے وقت گلی کوچوں میں کھیلتے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سوائے چند گھروں کے، اکثر بچے اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ اور جو بچے بعض وجوہات کی بناء پر تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں وہ قالین بافی کا کام کرتے ہیں۔ ان کے غریب والدین ان کا تعلیمی خرچ برداشت کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ اب مہنگائی کی وجہ سے تعلیم بھی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ اور ایک مزدور کی اجرت میں ایک گھر کا چولہا گرم ہو جائے یہی غنیمت ہے، یہ تعلیمی اخراجات کہاں سے پورے کریں۔ اس لئے یہ بچے قالین بافی کی کھڈیوں پر کام کرتے ہیں۔ قالین بننے کا ہنر سیکھتے ہیں اور جو کچھ ادھر سے ملتا ہے والدین کے ہاتھوں پر لاکر رکھ دیتے ہیں۔ یہ بچے شام کو گلی کوچوں میں گولیاں اور اخروٹ وغیرہ کھیلتے ہیں۔

بچوں کی دوسری قسم درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی ہے۔ وہ سارا دن اسکول میں پڑھائی کرتے ہیں شام کو گلی کوچوں میں کرکٹ کھیلتے ہیں یا پھر ہاکی کے کھیل سے دل بہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ بچے ایسے بھی ہیں جو شام کے وقت مختلف رسائل، کتب یا بچوں کے اخبارات تھامے اپنے دروازے پر کرسی بچھائے بیٹھے مطالعہ میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ بچے شہر کی لائبریری میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان بچوں کو مطالعہ کا بہت شوق ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہی بچے کل پڑھ لکھ کر نہ صرف والدین کا نام روشن کریں گے بلکہ ملک و قوم کی خدمت میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے۔

پتے کی بات

ایک دن چند جانوروں نے اُلّو سے پوچھا "اللہ میاں نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے"
اُلّو نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا
"اللہ میاں نے ہمیں اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم سوچیں کہ اللہ میاں نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے؟"

احمد
ایپل جیلی
NATURE
Product of Pakistan
AHMED
APPLE
JELLY
Manufactured by
AHMED FOOD INDUSTRIES (PVT) LTD
D - 112, S.I.T.E. KARACHI - 16
قدرت نے ذائقہ دیا۔ احمد نے محفوظ کیا
جیلی کا بہانہ
ایک سیب روزانہ

جو تم مسکراؤ تو سب مسکرائیں

نتائج مقابلہ مسکراہٹ

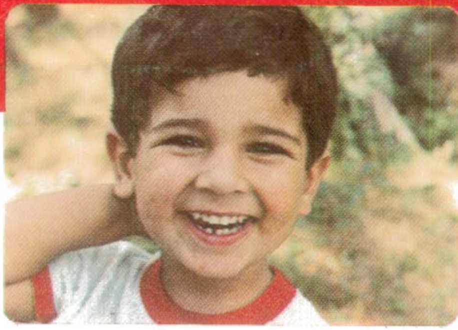

اول ... تمیز الدین محمد ... پشاور

افشین زمان ... پشاور کینٹ

دوم ... روداب حسین ... کراچی

سوئم ... امان حسن ... کراچی

مہوش ... شہر کا نام نہیں لکھا

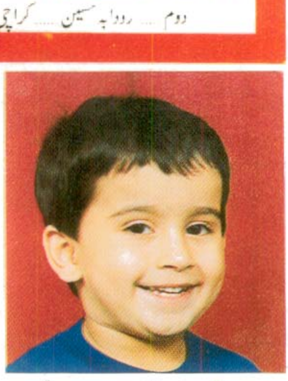

حسن ناصر عباسی ... دوحہ قطر

فاطمہ سارہ صدیقی ... کراچی

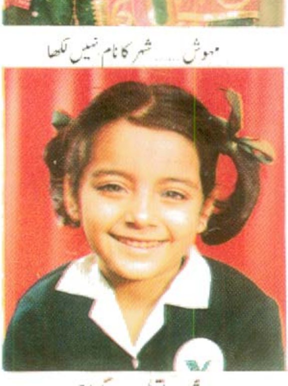

شازیہ اقبال ... کراچی

سُنا ہے پھُول برستے ہیں مسکرانے سے

ہم نے آپ کو مقابلہ مسکراہٹ میں شرکت کی دعوت دی اور آپ اپنی خوبصورت تصاویر کے ساتھ اس مقابلے میں شریک ہوگئے۔ سینکڑوں مسکراتی تصاویر کو دیکھ کر طبیعت باغ و بہار ہوگئی۔

بچوں کو مسکراتا دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا۔ سینکڑوں تصاویر میں سے چند کا انتخاب بہت مشکل کام تھا مگر اس مشکل کو کسی طور حل تو کرنا ہی تھا۔ لہٰذا ہم نے پہلے مرحلے میں تو ان تصاویر کو مقابلے سے خارج کر دیا جو بالکل ناقص، مدہم یا غیر واضح تھیں۔ بقایا تصاویر کو منصفین کے سامنے رکھ دیا گیا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے منصفین کا تعلق دانتوں کی مصنوعات بنانے والے مختلف اداروں سے ہے جن کے ناموں کا اعلان ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ منصفین کی علیحدہ علیحدہ آراء کو یکجا کر کے ہم نے فیصلہ مرتب کیا اور آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ممکن ہے آپ سوچتے ہوں کہ یہ فیصلہ یوں نہیں یوں ہوتا تو اچھا تھا۔ یا آپ کے خیال میں فلاں تصویر فلاں سے بہتر ہے...... تو یہ آپ کی ذاتی پسند یا ناپسند ہو سکتی ہے۔ آپ کی رائے بہت قابل احترام ہونے کے باوجود جیوری کی رائے پر مقدم تو نہیں ہو سکتی۔ یہ تو آپ بھی مانیں گے۔

اگر آپ ہم سے پوچھیں تو ہم تو یہی لکھیں گے کہ تمام تصاویر ایک دوسرے سے بڑھ کر حسین اور سب بچے یکساں پیارے لگ رہے ہیں ان سب میں تمیز کرنا بہت مشکل کام ہے۔

اول، دوم اور سوم کے علاوہ بقیہ پانچ بچوں کو خصوصی انعام کے لئے موزوں قرار دیا گیا ہے...... اب آپ یہ کیجئے کہ جلدی سے خط لکھ کر اپنا مفصل پوسٹل ایڈریس ہمیں بھجوا دیجئے تاکہ آپ کے خوبصورت تحائف جلد از جلد آپ کو بھجوائے جا سکیں۔ ہم منتظر ہیں۔ (ادارہ)

ہم اور ہمارے دانت

شاہد غنی

ہمارے ایک دوست میں عجیب ہی عادت تھی۔ جب بھی ہنستے تھے تو ہنستے ہوئے منھ پر ہاتھ رکھ لیا کرتے تھے۔ بہت دنوں تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ پھر ایک دن جب ہم نے ان سے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے آہستگی سے میرے کانوں میں بتایا کہ بھئی بات یہ ہے کہ میرے دانت خراب ہیں۔ جب میں ہنستا ہوں تو بہت برے لگتے ہیں۔ ہمارے ان دوست کے دانت اس لئے خراب ہوئے کہ انہوں نے اپنے دانتوں کی صحت کا کبھی خیال نہیں رکھا۔ اس مضمون میں ہم آپ کو یہ بتائیں گے کہ دانت خراب کیسے ہو جاتے ہیں اور انہیں صاف و شفاف رکھ کر چمکیلا کیسے بنایا جا سکتا ہے تاکہ آپ اسے پڑھ کر اپنے دانتوں کا خیال رکھیں اور آپ کو بھی ہنستے ہوئے اپنے منھ پر ہاتھ نہ رکھنا پڑے۔

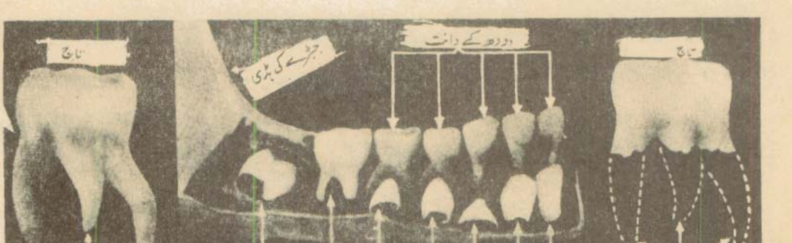

چھ سال کی عمر کے مخصوص دانت، وہ دودھ کے دانت یا پسِ زیر کہلاتے ہیں۔ اور مستقل دانت جو کہ دیکھئے کس طرح دودھ کے دانت کی جڑیں تحلیل ہوتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ عام طور پر بچوں میں ڈھائی سال کی عمر میں اٹھارہ سے بیس دانت نکل آتے ہیں جنہیں دودھ کے دانت کہا جاتا ہے لیکن زیادہ تر والدین اپنے بچوں کے ان دودھ کے دانتوں کی طرف سے لاپرواہو جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آخر کار ان دانتوں کو گرنا ہے یہ خیال بالکل غلط ہے اور بچوں کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے اگر دودھ کے دانتوں میں کیڑا لگا ہو گا تو ظاہر ہے بچہ ہر وقت درد میں مبتلا ہو گا اور اس کو کھانا چبانے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا اور بچے میں یہ ڈر پیدا ہو جائے گا کہ جب بھی وہ کچھ کھانے کی کوشش کرے گا تو اس کے دانتوں میں درد ہو گا اس لئے وہ کھانے سے ہر ممکن پرہیز کرے گا جس سے وہ وزن کی کمی اور کمزوری کا شکار ہو سکتا ہے۔ کیڑے لگے دانتوں کو نکلوانا بھی نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ بعد میں جو دانت نکلتے ہیں آگے کو مڑنا شروع ہو جاتے ہیں اور اس مڑنے کی وجہ سے دانت ہلنا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر جلد ہی خراب ہو جاتے ہیں۔ دانتوں کو بیماریوں سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ درج ذیل احتیاط کی جائے۔

۱۔ بچوں کو برش سے دانت صاف کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ رات سونے سے پہلے اور صبح ناشتے کے بعد۔

۲۔ بچوں کو کثرت سے چاکلیٹ ٹافیاں وغیرہ نہ دی جائیں۔

۳۔ بچوں کی خوراک میں کچی سبزیاں اور پھل مثلاً گاجر، مولی، گنا، سیب وغیرہ شامل کی جائیں اس سے جبڑے کی ہڈیوں کی مناسب نشوونما ہوگی۔

۴۔ ٹوتھ برش کو استعمال کے بعد خشک جگہ پر رکھنا چاہیئے۔

۵۔ نشاستہ دار، نرم اور روغن والی خوراک مثلاً ڈبل روٹی، چاکلیٹ، ٹافی، مشروبات وغیرہ کے استعمال کے بعد لازماً برش کرنا چاہیئے۔

۶۔ ہر چھ ماہ بعد دانتوں کے ڈاکٹر سے معائنہ کرایا جائے۔

دانت میں کیڑا کیوں لگتا ہے ؟

عام طور پر دانتوں میں کیڑا لگنے کی تین وجوہ ہوتی ہیں۔ ایک نظریئے کے مطابق خوراک میں موجود نشاستے پر جرثومی لیس دار مادہ حملہ آور ہوتا ہے اور تیزاب بناتا ہے اور یہ تیزاب دانتوں کے انیمل پر حملہ

آور ہوتا ہے۔ دانت کا انیمل ڈینٹل کریز یعنی کھوڑ، عام طور پر بہت سے جراثیم مٹھاس یا میٹھی چیزوں کو تیزاب میں تبدیل کرنے کے ذمہ دار ہیں جو کہ ایک خاص قسم کا جرثومہ ہوتا ہے وہ تیزاب بناتا ہے تیزاب میں رہتا ہے۔ یہی جراثیم اس کے زیادہ تر ذمہ دار ٹھہرائے جاتے ہیں دوسرے نظریئے کے مطابق انیمل کے ڈینٹن کے نباتاتی حصے میں سب سے پہلے کیڑا لگتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لحمیات پر جرثومی لیس دار مادہ میں موجود رطوبت جس کو (Proteolytic Emzymes) کہتے ہیں، حملہ آور ہوتے ہیں اور لحمیات کی توڑ پھوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ یاد رکھئے زیادہ تر گندے منھ اور گندے دانتوں میں زیادہ کیڑا لگتا ہے اور ہم جتنا زیادہ جرثومی لیس دار مادہ منھ میں بننے دیں گے اتنا ہی زیادہ کیڑا لگے گا ہوتا یہ ہے کہ منہ کا لعاب یا Saliva جس میں لیس دار مادہ پایا جاتا ہے اور منہ میں جس کی مقدار چوبیس گھنٹوں میں مختلف ہوتی ہے خصوصاً رات کو سونے کے دوران اس کی مقدار کم ہو جاتی ہے اور یہی کمی کیڑا لگنے کے مواقع پیدا کرتی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے رات سونے سے پہلے دانت ضرور صاف کرنے چاہئیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے دانت ہمیشہ ٹھیک رہیں تو آپ کو اپنے دانتوں کی حفاظت اوپر بتائے ہوئے طریقوں پر کرنی چاہئے۔ اگر آپ کے منھ میں دانت صحیح سلامت ہیں تو اس سے آپ خوبصورت لگیں گے اور آپ میں خود اعتمادی آئے گی اور ویسے بھی آپ کو معلوم ہے کہ ”صفائی نصف ایمان ہے“۔

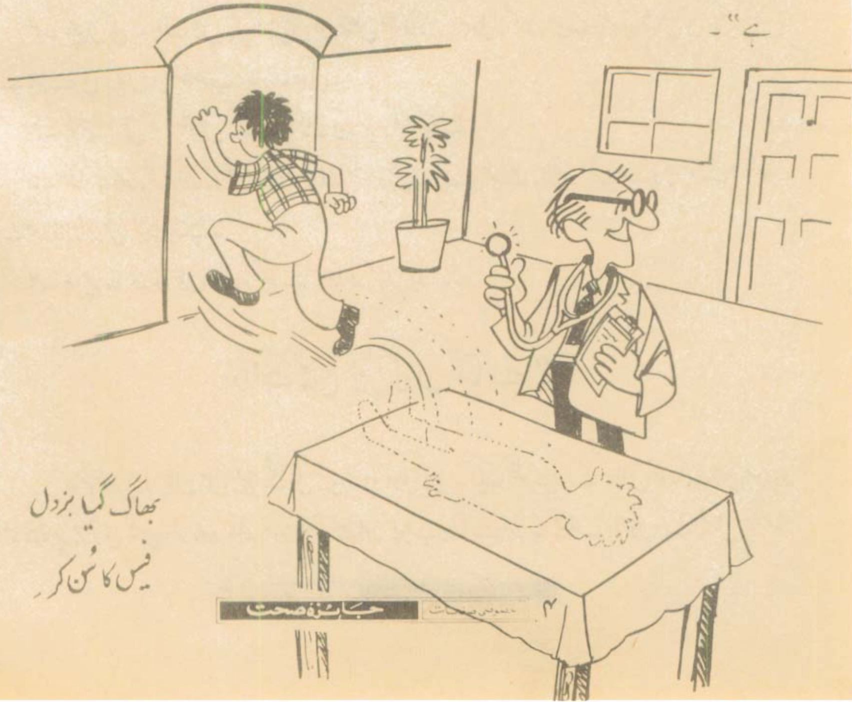

بھاگ گیا بزدل
فیس کا سن کر

جائزہ صحت

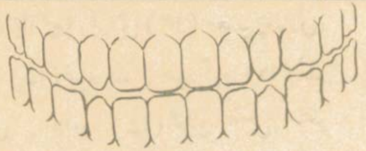

آنکھ مچولی کے گذشتہ شماروں میں ہم دانتوں کی صحت و صفائی سے متعلق بچوں کے رجحان کو جاننے کے لئے مسلسل ایک کوپن شائع کرتے رہے ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ پانچ ہزار سے زائد ساتھیوں نے یہ کوپن پر کر کے ہمیں بھجوایا۔ گو کوپن کی آمد کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے مگر ۱۵ دسمبر کے بعد موصول ہونے والے سینکڑوں کوپن ہم اپنے جائزے میں شامل نہیں کر سکے۔ جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

کوپن کے ذریعہ لئے جانے والے جائزہ کے بعض حصوں کو شائع کرنا خود دانتوں کی مصنوعات بنانے والے اداروں کے نقطہ نظر سے مناسب نہیں، تاہم اس کے بعض دلچسپ اور معلوماتی حصوں کو ہم آئندہ اشاعت میں ضرور جگہ دیں گے۔

یہاں ہم اپنے وعدے کے مطابق ان ۲۵۰ قارئین ساتھیوں کے نام شائع کر رہے ہیں جنہیں قرعہ اندازی کے ذریعہ تحائف کا حق دار سمجھا گیا۔ یہ تحائف کیا ہوں گے ؟ اور کب تک آپ کے ہاتھوں میں پہنچیں گے۔ اس کے لئے آپ کو فروری کے شمارے تک انتظار کرنا ہو گا۔ توقع ہے کہ انتظار کی یہ گھڑیاں خاصی پُر تجسس ہوں گی۔ لیجئے خوش نصیب ساتھی اپنے نام پڑھ لیں۔ ضروری ہے کہ آپ سب ساتھی ہمیں اپنے پوسٹل ایڈریس سے جلد از جلد مطلع کریں تاکہ انعام آپ کو روانہ کیا جا سکے۔

(ادارہ)

قرعہ اندازی کے ذریعہ انعامات حاصل کرنے والے ساتھیوں کے نام

(۱) احمد فواد سعیدی، اسلام آباد (۲) منان خرم بٹ، سعودی عرب (۳) سعدیہ امین، گوجرانوالہ (۴) شمائلہ جاوید، کراچی (۵) شیخ اختر شہزاد، قصور (۶) محمد ارشد رضا عابد، کراچی (۷) فیصل ارشاد، کراچی (۸) سارا، قطر (۹) میر حسن، سرگودھا (۱۰) ناہیدہ خانم، کراچی (۱۱) محمد اسد اللہ، لاہور (۱۲) مریم یوسف، اسلام آباد (۱۳) انیلا سمیرا، کراچی (۱۴) سعدیہ چوہدری، کراچی (۱۵) ضیاء اللہ، حیدر آباد (۱۶) شاہد رمضان، لاہور (۱۷) عمران اجمل، بھکر (۱۸) فواد ظفر، بہاولپور (۱۹) فوزیہ مصباح، خوشاب (۲۰) عدنان ستار، کراچی (۲۱) فارینہ منصوری، حیدر آباد (۲۲) حسیب حسن، لاہور (۲۳) فائزہ عنبر فاروقی، قطر (۲۴) احمد رضا قریشی، لاہور (۲۵) کامران یعقوب، رحیم یار خان (۲۶) نادیہ ادریس، دوہا قطر (۲۷) عالیہ اسد، دوہا قطر (۲۸) قرۃ العین محمدی، کراچی (۲۹) صائمہ عباس، کراچی (۳۰) رفعت سجان، حیدر آباد (۳۱) علی حیدر سید، ملتان (۳۲) نور العین اشرف، کوئٹہ (۳۳) عاصم احمد، کراچی (۳۴) رضوان راحت، رحیم یار خان (۳۵) حنا سیف غزنوی، پشاور (۳۶) نادیہ ذکاء، لاہور (۳۷) فرح اجمل، کراچی (۳۸) محمد وسیم عباسی، خیرپور (۳۹) محمد دادا پیر، سعودی عرب (۴۰) امان اللہ خان، سرگودھا (۴۱) محمد اشفاق، کراچی (۴۲) سلطان اصغر، سیالکوٹ (۴۳) الطاف، تربت (۴۴) محمد فہیم افضال، ضلع کرک (۴۵) غیاث الدین، پشاور (۴۶) ظاہر احمد، ساہیوال (۴۷) احمد گل، ڈیرہ اسماعیل خان (۴۸) ماہرہ خاتون، میرپور خاص (۴۹) عبدالفہیم، کراچی (۵۰) ذیشان اظہر، رحیم یار خان (۵۱) محمد سلیم، راولپنڈی (۵۲) احمد خالد، قطر (۵۳) محمد طاہر خان، حیدر آباد (۵۴) ہما عنبر فاروقی، دوہا قطر (۵۵) محمد ذیشان قریشی، کراچی (۵۶) عمران خان، کراچی (۵۷) رمیش کمار، حیدر آباد (۵۸) حسیب احمد، کراچی (۵۹) یاسر عرفان، پشاور (۶۰) میر بابر مشتاق، گجرات (۶۱) سید ارتضےٰ علی، اسلام آباد (۶۲) سید عامر گیلانی، گجرات (۶۳) شیراز حسین، کراچی (۶۴) جان محمد، کراچی (۶۵) عمر فاروق، کراچی (۶۶) عارف سراج، کراچی (۶۷) سید قیصر عباس زیدی، کراچی (۶۸) شامیر جاوید، ڈیرہ اسماعیل خان (۶۹) محمد شبیر ممالک، سکھر (۷۰) محمد عرفان بشیر، کوئٹہ (۷۱) فہد پرویز، لاہور (۷۲) نوید ارشد، ملتان (۷۳) زائد حسین انجم، سبی (۷۴) حماد شفیع، اسلام آباد (۷۵) عمار الرحمان خان، راولپنڈی (۷۶) احمد فیصل انجم، کراچی (۷۷) سعید احمد، حیدر آباد (۷۸) فیصل مختار صدیقی، دادو (۷۹) افتخار احمد اعوان، ٹھٹھہ

(۸۰) محمد احسان الرحمٰن ، ڈیرہ غازی خان (۸۱) لبنیٰ اقبال، راولپنڈی (۸۲) اللہ وسایا ، قصور (۸۳) عمران بشیر، راولپنڈی (۸۴) صفیہ جارس، ایبٹ آباد (۸۵) فرحین منیر ڈار، گجرات (۸۶) سمیرا اسلم، لاہور (۸۷) عتیق الرحمٰن ، بھکر (۸۸) عاطف شہزاد ، اٹک (۸۹) احسن حبیب، فیصل آباد (۹۰) محمد نعیم قریشی، حیدر آباد (۹۱) وحید الر حمان، قطر (۹۲) محمد جنید شاہد، لاہور (۹۳) محسن الرحمٰن ، کراچی (۹۴) یاسر مسعود، نواب شاہ (۹۵) عنبرین رضا، لاہور (۹۶) رملہ ناصر، لاہور (۹۷) امجد اسلام، کراچی (۹۸) معظم نظامی، راولپنڈی (۹۹) خرم پرویز، قطر (۱۰۰) تبسم امیر، لاہور (۱۰۱) شفیق احمد رند ، دادو (۱۰۲) محمد ریحان اسلام آباد (۱۰۳) مصباح بشیر، بھاولپور (۱۰۴) ایلیا شاہ، کراچی (۱۰۵) ساجد محمود، جہلم (۱۰۶) محمد طاہر، سعودی عرب (۱۰۷) نوید فاروق، گجرات (۱۰۸) وحاصل جمیل، کراچی (۱۰۹) حنا رشید (۱۲۰) روبینہ عبدالشکور، نواب شاہ (۱۲۱) صنوبر سلیم، کراچی (۱۲۲) ر حمان خان آفریدی، حیدر آباد (۱۲۳) محمد اسلم ناگوری، کراچی (۱۲۴) احمد جنید، ساہیوال (۱۲۵) راہیر بے بی، کوہاٹ (۱۲۶) مریم اعجاز، لاہور (۱۲۷) محمد نوید ندیم، کراچی (۱۲۸) عمر سفیان، گجرانوالہ (۱۲۹) مسرت علی، کراچی (۱۳۰) فیصل قمر، کراچی (۱۳۱) ذین الہدیٰ صابر، خانیوال (۱۳۲) محمد سلیم بھٹی، سکھر (۱۳۳) عماد الدین، سکھر (۱۳۴) عبدالرشید خان، کراچی (۱۳۵) عمران خان، لاہور (۱۳۶) طوبے شیرازی، ساہیوال (۱۳۷) ثمرینہ صدیقی، کراچی (۱۳۸) محمد رفیع اللہ، خیر پور (۱۳۹) وحید احمد بٹ، نارووال (۱۴۰) محمد جنید، پشاور (۱۴۱) امیر محمد خان نیازی، اسلام آباد (۱۴۲) محمد اعجاز عباسی، سکھر (۱۴۳) محمد رضوان، حیدر آباد (۱۴۴) محمد فیصل ابراہیم، کراچی (۱۴۵) ایس ایم کامران، کراچی (۱۴۶) امتیاز حسین، مظفر گڑھ (۱۴۷) عبدالرافع شیخ، لاڑکانہ (۱۴۸) مبین واحد علی، قطر (۱۴۹) صبا غالب، ملتان (۱۵۰) شہناز اختر، اوکاڑہ (۱۵۱) ندیم محمود، لاہور (۱۵۲) محمد عثمان، بنوں (۱۵۳) عصمت اقبال، قطر (۱۵۴) منیر احمد خان، لیہ (۱۵۵) سمیرا ر حمانی پراچہ، کراچی (۱۵۶) محمد ذیشان، راولپنڈی (۱۵۷) صبا بشیر، لاہور (۱۵۸) عبدالغفور، کراچی (۱۵۹) حنا کیانی، کراچی (۱۶۰) خاور ندیم، جہلم (۱۶۱) فیصل امین فاروقی، کراچی (۱۶۲) شاہد محمود، تھر پارکر (۱۶۳) وقاض بابر، سیالکوٹ (۱۶۴) توصیف دلشاد، لاہور (۱۶۵) امداد سلیمان، مورو (۱۶۶) اسد حماد، ملتان (۱۶۷) عامر یوسف، کراچی (۱۶۸) محمد جنید، سوات (۱۶۹) فیصل غلام محمد، کراچی (۱۷۰) نادیہ قیصر، کراچی (۱۷۱) حفیظ الر حمان، سرحد (۱۷۲) عمران خالد، کراچی

(۱۷۳) ہمایوں ریاض، خانیوال (۱۷۴) کاشف میر، اسلام آباد (۱۷۵) صائمہ ابرار خان، کراچی (۱۷۶) فیاض احمد قریشی، کراچی (۱۷۷) عمر خطاب، اٹک (۱۷۸) ذوالفقار علی، کراچی (۱۷۹) نگہت فاطمہ، کراچی (۱۸۰) محمد نصیر مرزا، گجرانوالہ (۱۸۱) محمد انجم مبین، ڈیرہ اسماعیل خان (۱۸۲) حسین فاروق، لاڑکانہ (۱۸۳) عبدالغفار ، عبدالغنی، کراچی (۱۸۴) محمد نعیم یونس، ملتان (۱۸۵) رضوان الحسن، کراچی (۱۸۶) زوہیب، کراچی (۱۸۷) نوید حفیظ، سعودی عرب (۱۸۸) ندیم حاجی ہارون، کراچی (۱۸۹) رخسانہ سحر، گوجرانوالہ (۱۹۰) افشین زمان، پشاور (۱۹۱) صفیہ علی بخاری، حیدر آباد (۱۹۲) محمد علی ریاض، راولپنڈی (۱۹۳) نوید شہزاد، ساہیوال (۱۹۴) ملک اظہر حسین بھٹہ، راجن پور (۱۹۵) سید شیزان احمد ذکریا، لاہور (۱۹۶) سید منور یز احمد واسطی، لاہور (۱۹۷) قرۃ العین، کراچی (۱۹۸) عثمان ایثار، گجرات (۱۹۹) عبدالرب الصمد، قطر (۲۰۰) یاسر اقبال، کراچی (۲۰۱) عمران، کے ایس اے (۲۰۲) اسماء سعید، لاہور (۲۰۳) عادل راحیل، لاہور (۲۰۴) شکیل احمد، لاہور (۲۰۵) عرفان قمر، لاہور (۲۰۶) عمر رحمان، راولپنڈی ۔ (۲۰۷) اختر خواجہ، ملتان (۲۰۸) عثمان احمد باجوہ، لاہور (۲۰۹) الحمزہ ملک، راولپنڈی (۲۱۰) مقصود حسین، رحیم یار خان (۲۱۱) محمد طارق منیر، کراچی (۲۱۲) پشمیم گل خان، دادو (۲۱۳) محمد عالم بلوچ، جعفر آباد (۲۱۴) اطہر احمد صدیقی، پشاور (۲۱۵) زہرا علی، کراچی (۲۱۶) کمال حمید، پشاور (۲۱۷) بلال نعیم، لاہور (۲۱۸) عبید رضا، سکھر (۲۱۹) راشد، کراچی (۲۲۰) ممتاز احمد عمر، راولپنڈی (۲۲۱) محمد محفوظ، بھاول نگر (۲۲۲) عالیہ افضل، کراچی (۲۲۳) فرحان محمود، کراچی (۲۲۴) محمد برھان الحق، کراچی (۲۲۵) محمد شریف قادری، کراچی (۲۲۶) نعیم احمد، گجرات (۲۲۷) نجمہ ناز، حیدر آباد (۲۲۸) سمیر صابر، کراچی (۲۲۹) لبنیٰ رشید، اسلام آباد (۲۳۰) عفت النساء، کراچی (۲۳۱) عابدہ، حیدر آباد (۲۳۲) اختر رضا، میرپور خاص (۲۳۳) تہمینہ عابد، کراچی (۲۳۴) محمد عمران شاہ، چکوال (۲۳۵) امجد علی، ڈیرہ غازی خان (۲۳۶) فرخ اخلاق، لاہور (۲۳۷) محمد عمران قادر، ٹنڈو آدم (۲۳۸) آمنہ عاصم، کوئٹہ (۲۳۹) عتیق الرحمن خان، بہاولپور (۲۴۰) حسن فرخ، لاہور (۲۴۱) عرفان محمود، کراچی (۲۴۲) شگفتہ شاہین، پشاور (۲۴۳) محمد عمران، نواب شاہ (۲۴۴) قاسم علی خرم، ملتان (۲۴۵) نوید رضا، راولپنڈی (۲۴۶) احمد سعید، لاہور (۲۴۷) ابرار عنایت، گجرات (۲۴۸) عبدالرؤف اجمیری، سکھر (۲۴۹) اکبر علی ذیشان، کراچی (۲۵۰) ندیم قیوم، گوجرانوالہ

(نوٹ) ۱۰۰ نام آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

بچے ہمارا مستقبل ہماری امید

عافیہ سلام

بچے مستقبل کی امید ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہماری دنیا کے ایک تہائی سے زیادہ بچوں کے لئے ان الفاظ کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ تقریباً پچیس لاکھ چھوٹے بچے ہر ہفتے محض بھوک اور معمولی بیماریوں کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ گویا مرنے والے بچوں کی تعداد کراچی شہر کی "تقریباً" ایک تہائی آبادی کے برابر ہے اور بیماریاں بھی ایسی جن پر بہت ہی کم خرچ سے قابو پایا جاسکتا ہے، مثلاً دست، تشنج، کالی کھانسی اور خسرہ وغیرہ۔

اس صورتحال کو بدلنے کے لئے نہ صرف ان بیماریوں کے خلاف بلکہ جہالت کے خلاف بھی جنگ کرنی ہوگی۔ کیونکہ اکثر بیماریاں اور مسائل جہالت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ بہتر مستقبل ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ لہٰذا سیاستدانوں کو اس بات کا احساس کرنا ہوگا کہ وہ اپنی توجہ اور توانائیاں جنگ و جدل سے ہٹا کر بچوں کی بہتری کی طرف لگائیں۔

دس برس کی طویل کوششوں کے بعد آخر کار بچوں کے حقوق کا عالمی کنونشن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں منعقد کیا گیا جس میں بچوں کے حقوق کو قانونی طور پر طے کیا گیا ہے۔ اور دنیا کے ہر ملک سے کہا گیا

ہے کہ چاہے جنگ ہو یا امن، تنگی ہو یا خوشحالی، بچوں کی فلاح و بہبود کو ہر حالت میں ترجیح دی جائے گی کیونکہ یہی انسانیت کا مستقبل ہیں۔۔

یہ احساس مختلف اقوام میں جڑ پکڑ چکا ہے اور اس کی مثال ہمارے سامنے نکاراگوا، سری لنکا اور افغانستان کے ممالک کی صورت میں ملتی ہے جو پچھلے کئی برسوں سے ایک خوفناک خانہ جنگی میں مبتلا ہیں۔ اس کے باوجود وہاں بھی بچوں کو اتنی اہمیت دی گئی کہ دونوں فریقین نے "امن کے دن" مقرر کر لئے اور اس دوران ریڈ کراس کے کارکنان جنگ میں گھرے ہوئے بچوں کو خوراک اور دوائیاں مہیا کرتے رہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے، یونیسکو نے بھی اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ جو بچہ آج پیدا ہوا ہے اسے خوراک، دوا، اچھا ماحول اور تعلیم و تفریح کے مواقع کی ضرورت ہو گی۔ بچوں کی یہ تمام ضروریات جنگ ختم ہونے کا انتظار نہیں کر سکتی ہیں اور نہ معاشی حالات کے بہتر ہونے کا۔ اگر دنیا کے بڑے بڑے ممالک اس حقیقت کو تسلیم کر کے بچوں کو ان کا حق فوری طور پر دلوانے کے لئے کوششیں شروع کر دیں تو بہت سی مشکلات کا حل کل کے بجائے آج ہی مل جائے گا۔ ویسے بھی نئی نسل اب اس قابل ہو چکی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی ان کو حل کر سکے۔ "اپنی مدد آپ" کی یہ شاندار مثال یوگینڈا میں بچوں نے قائم کی۔ وہاں ۸ ہزار اسکولوں میں صحت کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے جس کے تحت وہاں اسکول کے بچوں کو صحت و صفائی کے اصولوں کے متعلق باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ نہ صرف اپنے ماحول کی صفائی کا خیال رکھ سکیں بلکہ ایسی بیماریوں کی بھی روک تھام کر سکیں جو گندگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک اور مثال زمبابوے کی ہے جس نے اپنی آزادی کے صرف دس سال کے اندر اندر اپنے ملک کے تمام بچوں کو پرائمری کی تعلیم سے آشنا کر دیا اور وہ بھی بالکل آسان اور کم خرچ طریقوں سے اور وہاں کی ضروریات کے عین مطابق مثلاً ...... حساب کتاب سکھانے کے لئے پتھروں اور ڈنڈیوں سے کام لیا جاتا ہے اور تمام اسکولوں کے بچوں کو ایسے زمین کے پلاٹ دیئے گئے ہیں جن پر وہ کاشتکاری کرتے ہیں اور اسی سے اسکول کا خرچ چلاتے ہیں۔

پاکستان میں بھی ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بچوں میں زیادہ سے زیادہ اس بات کا احساس پیدا کریں تاکہ وہ نہ صرف اچھے مستقبل کے لئے کام کر سکیں بلکہ اپنی ہی نسل کے ان بچوں کو بھی ایسی باتیں سکھا سکیں جنہیں ان باتوں کا علم نہیں ہے۔

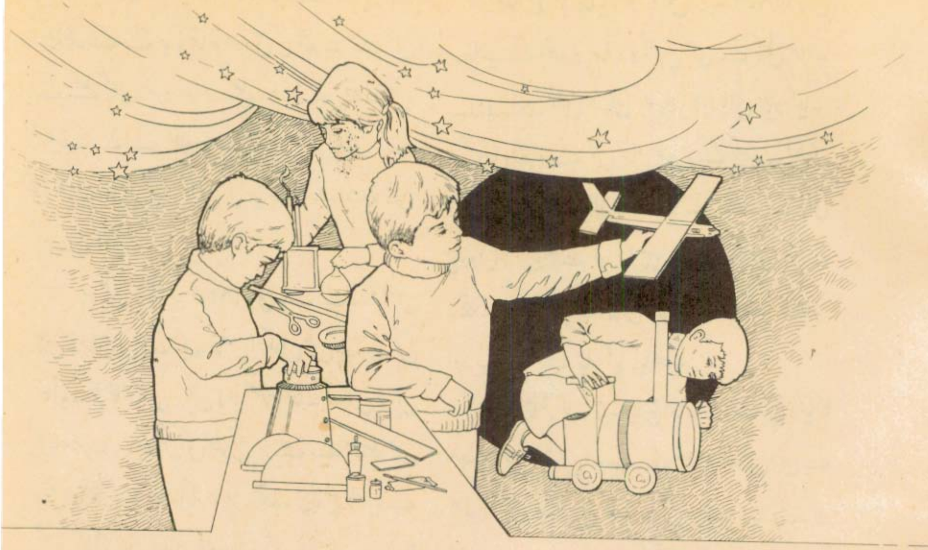

سلمیٰ سلیم

یہ چیزیں بچوں نے ایجاد کیں

بڑی عمر کے موجدوں کے بے شمار ناموں سے آپ واقف ہوں گے۔ لیکن شاید آپ موجد بچوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ ایسے بچوں سے جنھوں نے کم عمر ہی میں کئی ایسی چیزیں ایجاد کیں جو دنیا بھر میں استعمال ہو رہی ہیں۔ آیئے ہم آپ کو بعض ایسی ہی چیزوں اور ان کے موجدوں سے ملائیں۔

کھانا ٹھنڈا کرنے والا آلہ :۔ ۱۹۸۲ء میں بیلجئم کے چودہ سالہ ایرک وین نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس کی مدد سے گرم کھانے کو بہت جلد ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔ اس نے یہ آلہ خاص طور پر ان بچوں کے لئے ایجاد کیا جو گرم کھانا نہیں کھا سکتے۔ اس آلے میں ربر کی ایک نالی فٹ ہے۔ اس نالی کے اوپر ربر سے بنی ہوئی ایک بلب نما چیز لگی ہے۔ اس بلب نما چیز کو دبانے سے ہوا ٹیوب کے ذریعہ آلے کے اندر رکھے ہوئے کھانے تک جاتی ہے جس کے ذریعہ کھانا جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

کان ڈھانپنے والا آلہ :۔ ۱۸۷۳ء کی

بات ہے امریکہ کا پندرہ سالہ چیسٹر گرین ووڈ اسکیٹنگ کے لئے جاتا تھا تو سردی کی شدت سے اس کے کھلے کان سرد ہو کر نیلے پڑ جاتے تھے۔ اس تکلیف نے اسے کان ڈھانپنے والا آلہ ایجاد کرنے کی طرف مائل کیا۔ اس کی یہ ایجاد ۱۸۷۷ء میں پٹینٹ ہوئی۔

بریل :۔ یہ ۱۸۲۵ء کی بات ہے۔ فرانس میں نابینا بچوں کے ایک خاص اسکول میں پندرہ برس کا ایک لڑکا لوئیس بریل زیر تعلیم تھا۔ لوئیس بریل کو دوسرے نابیناؤں کی طرح پڑھنے کے سلسلے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس نے تحریر کا ایک ایسا نظام ایجاد کیا جس کی مدد سے نابینا افراد کے لئے پڑھنا بے حد آسان ہو گیا۔ لوئیس کا ایجاد کیا ہوا یہ طریقہ ابھرے ہوئے الفاظ کا ایک نظام تھا۔ لوئیس کے نام کے مناسبت سے اس نظام کا نام ''بریل'' رکھا گیا۔ آج دنیا کے لاکھوں نابینا افراد بریل کے نظام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اب تو دنیا میں بریل گھڑیاں بھی ایجاد ہو چکی ہیں۔

انسان کا بنایا ہوا ڈائی :۔ ۱۸۵۶ء میں برطانیہ کے اٹھارہ سالہ ولیم پرکن نے پہلی مرتبہ سنتھیٹک یعنی انسان کا بنایا ہوا ڈائی تیار کیا۔ پرکن کی ایجاد سے قبل تمام طرح کے کپڑے فطری ڈائی کی مدد سے ڈائی کئے جاتے تھے۔ یہ ڈائی پودوں، حیوانات اور زمین سے حاصل ہوتے تھے۔ پرکن کا پہلا کیمیکل ڈائی اودے رنگ کا تھا۔ اور یہ کولتار سے تیار کیا گیا تھا۔

کھلونا ٹرک :۔ پانچ سالہ رابرٹ پیچ دنیا کا معلوم کم عمر ترین موجد ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس کے کھلونا ٹرک کو امریکی حکومت کی جانب سے پٹینٹ سرٹیفکیٹ ملا۔ (جب کوئی شخص کوئی چیز ایجاد کرتا ہے تو وہ ایک سرکاری ادارے سے اسے پٹینٹ کرا لیتا ہے تاکہ اس ایجاد پر کوئی شخص اپنا دعویٰ نہ کر سکے۔) اس ٹرک کے مختلف حصوں کو علیحدہ کر کے دوبارہ آپس میں جوڑا جا سکتا ہے۔ اس ٹرک کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس ٹرک سے کئی اقسام کے ٹرک بنائے جا سکتے ہیں۔

ایک عورت اپنے بچے کو آداب سکھا رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''بیٹے اگر آپ بازار جا رہے ہوں اور ایک شخص گر جائے تو آپ کیا کریں گے؟''

بیٹا :۔ ''امی میں اس کو اٹھا دوں گا۔''

ماں :۔ ''اگر وہ تمہیں پانچ روپے انعام دے پھر؟''

بیٹا :۔ ''میں اسے دوبارہ گرا دوں گا۔''

قادر بخش شاد بلوچستان

تاریک مستقبل کے بے آسرا بچے

محمّد صالح ارشاد

آج ہم آپ کو دینا کے چند بڑے اہم شہروں میں بسنے والے ایسے بچوں کے بارے میں بتارہے ہیں جو بنیادی ضروریات زندگی کے بغیر انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ بچے کھلونوں سے کھیلنے یا اسکول جانے کے بجائے صبح سے شام تک چند روپوں کی خاطر کولھو کے بیل کی طرح محنت کرتے ہیں ان کے بچپن شرارتوں سے خالی اور ان کے چہرے مسکراہٹوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

دنیا بھر میں لاکھوں بچوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اس بات کا اندازہ ٹائم میگزین میں چھپنے والے ان اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) روزانہ پانچ سال سے کم عمر کے ۶۰،۰۰۰ بچے غذا کی کمی کے باعث مر جاتے ہیں۔

(۲) ۱۵۰ ملین بچوں کو اچھی خوراک نہیں ملتی ہے۔

(۳) ۱۰۰ ملین بچوں سے زائد بچے جن کو اسکول جانا چاہیے، اسکول نہیں جاتے۔

(۴) تین کروڑ و بچے سڑکوں پر رہتے ہیں۔
(۵) ۷۰ لاکھ بچے جنگ اور قحط کی وجہ سے مہاجرین کی زندگی گزار رہے ہیں۔

آیئے اب دنیا بھر میں بسنے والے لاکھوں غریب اور محنت کش بچوں میں سے چند ایک سے ملاقات کرتے ہیں۔

(۱) انڈیا......

کیمرے کی طرف دیکھتی ہوئی معصوم سی بچی کسی دلچسپ کھیل میں مصروف نہیں ہے۔ یہ بچی آتش بازی بنانے کے کارخانے میں بم کے فلیتوں پر مصالحہ لگا رہی ہے۔ اس بچی کی عمر آٹھ سال ہے۔ یہ روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرتی ہے۔ انڈیا کے آتش بازی بنانے کے کارخانوں میں ۴۵،۰۰۰ بچے کام کرتے ہیں۔ انڈیا میں ۱۰۰ ملین سے زائد بچے کان کنی اور . . . . . . شیشہ سازی کے دوران کبھی کبھی نہ صرف اپنی جان سے جاتے ہیں.... بلکہ ان کی اکثریت تپ دق اور دیگر خطرناک بیماریوں میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔

اب ملئے بالو سے، بالو ۱۲ سال کی عمر کا کمزور مگر محنتی بچہ ہے۔ یہ دن میں ۱۱ گھنٹے کام کرتا ہے۔ اس کا کام پہاڑیاں توڑنا ہے۔ ۱۱ گھنٹے شدید محنت کرنے کے بعد صرف ۱۸ روپے ملتے ہیں۔

اس کے باپ نے اس کی پڑھائی صرف اس لئے چھڑادی کہ یہ کام کر کے پیسے کمائے۔ بالو کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر انجینئر بنے۔

پہاڑوں سے مضبوط اور اونچے عزائم رکھنے والا یہ بچہ ان لاتعداد بچوں میں شامل ہے جن کا بچپن اسکول کی چار دیواری سے نکال کر بہت تھوڑے پیسوں کے عوض فروخت کر دیا گیا۔

میکسیکو......

میکسیکو شہر میں پیدا ہونے والا تمام کوڑا شہر سے باہر پھینکا جاتا ہے۔ کوڑے کرکٹ کے ان بڑے بڑے ڈھیروں میں ۵۰،۰۰۰ بچے اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان بچوں کا کام کوڑے کے ڈھیر سے ایسی اشیاء کو تلاش کرنا ہے جو دوبارہ استعمال ہو سکیں۔ مثلاً شیشہ ٹین، ڈبے، ہڈی اور کاغذ وغیرہ۔ ان بچوں کی تمام زندگی ایک چھوٹے سے مکان میں گزر جاتی ہے۔ دن بھر یہ بچے کوڑے میں گزارتے ہیں اور رات کو معمولی کھانا کھا کر سو جاتے ہیں۔

ایتھوپیا......

تصویر میں نظر آنے والی بچی کی عمر ۱۱ سال ہے یہ ایتھوپیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں کاموس واہ

میں رہتی ہے۔ اس علاقے میں گزشتہ تین سالوں سے بارش نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی فصل نہ اگ سکی۔ یہ بچی دن بھر وہاں کی زمین میں اگنے والی ایک خاص قسم کی پیاز جمع کرتی ہے اور شام کو جب ڈبہ بھر جاتا ہے تو تھکے تھکے قدموں سے گھر لوٹ جاتی ہے۔ دن بھر جمع کی گئی پیاز کو ابال کر یا تل کر استعمال کیا جاتا ہے۔

صبح اٹھ کر اسکول جانا یا دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھیلنا اس کی قسمت میں نہیں ہے۔ اس کے ہرے رنگ کے کپڑے اس خیمہ کے کپڑے سے بنائے گئے ہیں جو ریڈ کراس والوں نے کسی زمانے میں اس کے علاقے میں لگایا تھا یہ بچی اس امید کے سہارے زندہ ہے کہ کبھی تو دنیا کے بچوں اور لوگوں کو اس کا خیال آئے گا اور اسے بھی دوسرے بچوں کی طرح اچھا کھانے اور پہننے کو ملے گا۔

بنگلہ دیش......

بنگلہ دیش دنیا کا غریب ترین ملک ہے یہاں بسنے والے غذا کی کمی، سیلاب، غربت اور بیماریوں کا شکار رہتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے یہاں بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی محنت کرنا پڑتی ہے۔ کام کرنے والے بچوں کی تعداد یہاں بہت زیادہ ہے۔

تصویر میں آگ کے پاس کھڑا ہوا بچہ ایک لوہار خانہ میں کام کرتا ہے۔ اس بچہ کی عمر صرف ۱۲ سال ہے۔ اتنی سی عمر میں یہ شدید محنت کرتا ہے تاکہ زندہ رہ سکے۔ یہ تمام بچے صرف اس امید پر زندہ ہیں کہ کبھی تو دنیا میں بسنے والے دیگر دوسرے بچوں اور لوگوں کو ان کا خیال آئے گا اور ان کے مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے۔

ان بچوں سے ملتے جلتے کتنے ہی بچے ہمارے ملک میں بھی ہیں۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالئے آپ کو گیراجوں اور مختلف قسم کے کارخانوں میں کام کرتے ہوئے کتنے ہی بچے ملیں گے جو اسکول جانے کے بجائے تھوڑے سے پیسوں کے لئے مزدوری کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ جھڑکیاں اور گالیاں بھی کھاتے ہیں کیا پائلٹ انجینئر اور ڈاکٹر بننا ان کا حق

نہیں ہے۔

آپ سب مل جل کر ایسے بچوں کے لئے آواز اٹھائیں۔ اپنے والدین اور اساتذہ کو اس مسئلے کے حل کے لئے راضی کریں۔ کام کرنے والے بچوں کو ان کے پاس جاکر انہیں پڑھائی کی طرف راغب کریں۔ تاکہ یہ بچے بھی اپنے مستقبل کو آپ کی طرح روشن بنا سکیں۔

جڑواں بہنوں کے جوڑے

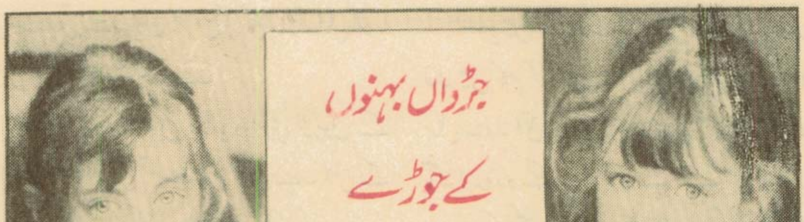

برطانیہ کی چار سالہ جڑواں بہنیں لیزا (بائیں) اور لینی اپنی ایک ماہ کی دو جڑواں بہنوں کو گود میں لیے ہوئے۔

عظیم لوگوں کا بچپن

بشریٰ اشفاق

آپ نے بے شمار جینئس یا ذہین ترین لوگوں کا نام سنا ہو گا جنھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دے کر دنیا کو حیران کر دیا۔ ہم آپ کو ان لوگوں کے بچپن کے بارے میں بتائیں گے۔ آپ البرٹ آئن اسٹائن سے تو واقف ہی ہوں گے۔ انہیں جب اسکول میں داخل کیا گیا تو وہ اپنی درسی کتاب میں قطعی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ البتہ ان کی توجہ کا مرکز وہ کتابیں تھیں جو فلکیات کے موضوع پر تھیں یا توانائی کے موضوع پر۔ وہ جماعت میں سوچتے رہتے اور جب کبھی اپنے استادوں سے کچھ پوچھتے تو وہ درسی کتب سے غیر متعلق بات ہوتی۔ نتیجتہً انھیں بے پروا اور نالائق سمجھا جاتا تھا۔ لیکن تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے اپنی علمی استعداد سے اپنے والدین اور اساتذہ کو حیران کر دیا۔ یہاں تک کہ علمی تحقیق پر انہیں نوبل انعام

جارج اسٹیفن کا شمار بھی ایسے ہی بچوں میں ہوتا ہے گو کہ وہ اپنا درسی کام روز مکمل کرتے تھے تاہم ان کا زیادہ وقت اس غور و فکر میں صرف ہوتا کہ کیتلی میں بننے والی بھاپ آخر کس طرح اس کے ڈھکنے کو اٹھانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس موضوع پر اپنی علمی استعداد بڑھاتے گئے بالآخر بھاپ کا انجن بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

ابراہام لنکن بہت غریب تھے اس لئے سات سال کی عمر میں وہ اخبار تقسیم کیا کرتے تھے۔ سردی کے زمانے میں اکثر ان کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہ ہوتا تو وہ چولہے کی گرم راکھ میں اپنے پیر رکھ کر سوتے تھے۔ اخبارات کے ذریعے انہوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا اور آخر کار ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پہلے منتخب جمہوری صدر بنے۔

حافظ سعدی رحمتہ اللہ علیہ جن کی گلستان و بوستان کی فارسی حکایتوں کے ترجمے اکثر آپ پڑھتے رہتے ہیں چار سال کی عمر میں قرآن ناظرہ کی تعلیم لینے کے لئے استاد کے پاس بھیجے گئے۔ ان کے استاد نے حروف تہجی کا قاعدہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے اسے پڑھنے سے انکار کر دیا اور قرآن کریم کی فرمائش کی۔ ان کے استاد نے بچے کے شوق اور خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن کریم کھول کر ان کے سامنے رکھا تو وہ بڑی روانی سے ڈھائی پارے بغیر غلطی کے پڑھتے چلے گئے۔ استاد حیران تھے۔ لیکن یہ سعدیؒ کی ذہانت تھی کہ جب وہ اپنی والدہ کو تلاوت کرتے سنتے تو عالم شیر خواری ہی میں تمام پارے ازبر کرتے چلے گئے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب تو پرانی کہانیاں ہیں۔ لیکن آج بھی آپ کو بے شمار مثالیں ایسی نظر آتی ہیں۔ بہت زیادہ نہیں چند سال پہلے ہی کی بات ہے جب ٹیلی ویژن کے پروگرام نیلام گھر میں ایک بچے نے ریاضی کی بڑی سے بڑی جمع تفریق چند لمحوں میں کر کے تمام حاضرین کو حیران کر دیا تھا۔ اس بچہ کی عمر محض پانچ سال اور کچھ ماہ تھی۔

پاکستان کے بلکہ آپ ہی کے شہر کراچی کے ایک اور بچے نے مارشل آرٹ کے شائقین، کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ نونہال سید شیراز حیدر شاہ ہے۔ جس کی عمر اس وقت صرف چھ سال ہے۔ یہ دوسری جماعت میں زیرِ تعلیم ہے۔ اور اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ اس نے "طائی کراٹے سینٹر" میں ڈھائی ماہ قبل داخلہ لیا۔ اور ۳۳ دن کی قلیل مدت میں انتہائی ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک مقابلے میں ٹرافی حاصل کر کے طائی کراٹے سینٹر کے تمام اساتذہ طلبہ اور شائقین کو حیران کر دیا۔ سید شیراز

حیدر شاہ مستقبل میں مزید کارناموں کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اس کا کہنا ہے کہ میں تعلیمی میدان اور کھیلوں میں انشاءاللہ نئے ریکارڈ قائم کروں گا۔ جس کی وجہ سے میرے والدین اور استاد مجھ پر فخر کریں گے۔

برطانیہ میں ایک ہندو لڑکے نے غیر معمولی ذہانت کا نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس لڑکے کا نام گنیش سیتا سلیپم ہے وہ دنیا بھر میں اور برطانوی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں پہلا طالب علم ہے۔ جو صرف گیارہ برس کی عمر میں کسی برطانوی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ گیارہ سالہ بچہ تو چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھ سکتا ہے وہ چودہ یا سولہ جماعت کیسے پاس کر سکتا ہے۔ اس کا جواب ہم بتاتے ہیں کہ گیارہ سالہ گنیش کو اس کی غیر معمولی ذہانت کے باعث گلفورڈ یونیورسٹی میں براہ راست سال دوم میں لے لیا گیا ہے۔ وہ ریاضی کا طالب علم ہے اس کے ہم جماعتوں کی عمریں انیس یا بیس برس ہیں۔ اس کے پینتالیس سالہ والد ارجن برطانیہ میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور بینکار رہیں۔ جب گنیش کی عمر چھ برس تھی تو اسے جینئس یا ذہین ترین قرار دیا گیا تھا۔ اس نے سات برس کی عمر میں جونیئر امتحان الیون پلس (11 +) میں کامیابی حاصل کی۔ آٹھ برس کی عمر میں اس نے ریاضی کا اولیول امتحان گریڈ اے میں پاس کیا۔ اور نو برس کی عمر میں ریاضی میں Aلیول کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اب وہ گیارہ سال کی عمر میں یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ اس سے قبل ایک چودہ سالہ برطانوی بچی روتھ لارنس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ریکارڈ قائم کیا تھا۔ جو اب گنیش نے توڑ دیا ہے۔ اور آئندہ ممکن ہے کہ مستقبل کا کوئی اور جینئس بچہ گنیش کے ریکارڈ کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے۔

ایک اور ذہین ترین بچی برازیل کی ٹی وی آرٹسٹ اور ٹاویو آگسٹو کی صاحب زادی مانویلا ہے۔ جسے لاڈ سے سب مانو کہتے ہیں۔ اس نے صرف سات برس کی عمر میں ایکالوجی (ECOLOGY) کے کازکی وضاحت کر کے ساری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ جبکہ عام طور پر اس عمر کے بچے ایکالوجی کے مفہوم سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔

۹ مئی ۱۹۸۴ء کو برازیل میں پیدا ہونے والا بچہ آکیلا بھی ایک جینئس ہے وہ شروع ہی سے ہوشیار اور جوش وولولے سے بھرپور ہے۔ جب وہ دو برس کا ہوا۔ تو اس کے والدین نے یہ غیر معمولی بات محسوس کی کہ آکیلا جب ان کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا ہے۔ تو وہ اشتہارات میں دیئے گئے ٹیلیفون نمبر زبانی یاد کر لیتا ہے۔ ہندسوں سے آکیلا کی یہ غیر معمولی دلچسپی کچھ دن کے بعد اس صورت میں سامنے آئی کہ ڈھائی سال کی عمر میں وہ سڑکوں کے نام اور سائن بورڈ پڑھنے لگا۔ اس کے والدین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بغیر کسی مدد کے اس نے پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ تین سال کی عمر میں اس نے شطرنج جیسا مشکل

کھیل کھیلنا شروع کیا۔ اور جلد ہی وہ بالغ افراد کو مات دینے میں کامیاب ہونے لگا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ان سب کاموں میں اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور اس نے کسی رہنمائی اور مدد کے بغیر خود بخود لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اس کا بہترین مشغلہ زبانی جمع وتفریق کرنا تھا۔ اور وہ بچوں کے قاعدہ کو بہت آسان سمجھتا تھا۔ پانچ برس کی عمر میں اس نے ذہانت کے امتحان میں ایک سو اکہتر نمبر حاصل کر کے کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اگرچہ پانچ برس کی عمر میں اس کی ذہنی سطح ساڑھے آٹھ سالہ بچے کے برابر ہے۔ تاہم وہ عام زندگی میں ایک نارمل بچہ بھی ہے۔

ساتھیو! آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ جینئس یا ذہین ترین بچے بس ہر وقت غور وفکر میں مشغول رہتے ہیں۔ یا پھر ضعیف لوگوں کی طرح ایک جگہ بیٹھ کر سوچوں میں مگن رہتے ہیں۔ نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ بھی آپ کی طرح شرارتیں کرتے ہیں۔ آئیس کریم اور پاپ کورن کھاتے ہیں۔ کھیلتے کودتے اور دوست بناتے ہیں۔ ٹی وی دیکھتے ہیں۔

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ذہین افراد تو پیدائشی ہوتے ہیں۔ ہم بھلا کہاں ذہین بن سکتے ہیں۔ تو آپ غلطی پر ہیں۔ گو یہ بات درست ہے کہ بعض اعلیٰ ذہین ترین افراد پیدائشی ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے ذہین لوگ بھی آپ کو تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں۔ جنھوں نے انتھک محنت اور جدوجہد سے ذہین لوگوں کے درجہ میں اپنا مقام بنایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انتہا درجہ کی محنت کا دوسرا نام ذہانت ہے۔ اس ضمن میں بچوں ہم آپ کو تین باتوں کا مشورہ ضرور دیں گے۔ (واضح رہے کہ یہ نصیحت نہیں ہے کیونکہ نصیحت ناکارہ لوگوں کے لئے ہوتی ہے اور آپ سب ماشاءاللہ اعلیٰ کارکردگی رکھنے والے ہیں۔) ہاں تو وہ تین باتیں ہیں (۱) وقت کی اہمیت کو محسوس کیجئے اور ہر کام وقت پر مکمل کر لیجئے۔ (۲) ہر بات میں غور وفکر کی عادت ڈالیں اور جو کچھ آپ کتابوں میں پڑھتے ہیں اسے محض رٹیں نہیں بلکہ عام زندگی میں ان کا مشاہدہ بھی کریں۔ (۳) اور تیسرے یہ کہ اپنے بزرگوں استادوں اور دوسرے قابل لوگوں سے ملتے جلتے رہئے۔ ان سے سوال پوچھتے رہئے اس طرح آپ کے علم میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ عطر کی دکان میں بیٹھنے سے اگر عطر حاصل نہ بھی ہو تو خوشبو خود بخود مل جاتی ہے۔

اور غبی اور وقت ضائع کرنے والے ناکارہ بچوں سے تو آپ خود ہی دور رہتے ہوں گے۔ کیونکہ

یہ بھی بزرگوں کی ایک کہاوت ہے کہ لوہار کی بھٹی کے پاس بیٹھنے والوں کو ہر وقت چنگاری سے جلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

مونیکا سیلس

سید کاشان جعفری

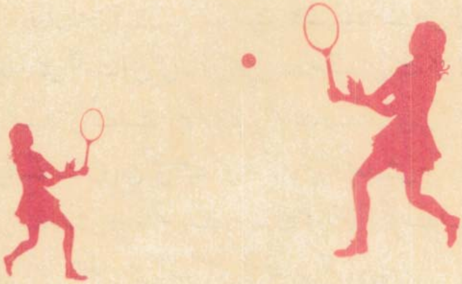

بات بہت زیادہ پرانی نہیں، فرنچ اوپن شروع ہونے سے صرف ایک ہفتہ قبل کی ہے۔ یوگوسلاویہ کے ایک رسالے کے سرورق پر ایک نو عمر لڑکی کی تصویر شائع ہوئی۔ وہ لڑکی اپنی ہی ہم عمر لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان گھری ہوئی انہیں آٹو گراف دے رہی تھی ...... اپنے ہم عمر لڑکے، لڑکیوں کو آٹو گراف دیتے ہوئے اس کے لبوں پر بڑی دلفریب سی فاتحانہ مسکراہٹ بھی تھی ...... وہی مسکراہٹ اس وقت بھی دیکھنے میں آئی جب اس نو عمر لڑکی نے ٹینس کی دنیا کی چیمپئن اور ناقابل شکست فاتح سمجھی جانے والی ۲۰ سالہ کھلاڑی سٹیفی گراف کو شکست سے دوچار کر دیا۔ یہ نو عمر لڑکی تھی مونیکا سیلس ۔ اور اس کی عمر صرف سولہ سال تھی۔

فرنچ اوپن مقابلوں میں خاتون ٹینس کا اعزاز اور خطاب جیتنے والی مونیکا سیلس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں میں کپ تھام کر ناظرین کی طرف فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھا تو فضا فلک شگاف والہانہ تالیوں سے گونج اٹھی۔ مونیکا کی فاتحانہ مسکراہٹ خاموش زبان سے کہہ رہی تھی کہ ہمت کرے انسان تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔

مونیکا سیلس نے فرنچ اوپن کپ جیتنے کا اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عالمی ٹینس کی زندگی کا پہلا گرینڈ سلیم اعزاز بھی حاصل کیا۔ ساتھ ہی فرنچ اوپن ٹینس کی تاریخ میں سب سے کم عمری میں یہ اعزاز حاصل کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ مونیکا سیلس سے پہلے کرس ایورٹ کو سب سے کم عمر کھلاڑی اور فرنچ اوپن فاتح ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔

گذشتہ دو ماہ کے دوران مونیکا سیلس نے اپنے ریکٹ سے صف اول کی تمام خاتون ٹینس کھلاڑیوں کو کسی نہ کسی میدان میں شکست دی تھی۔ فرنچ اوپن سے صرف تین ہفتے قبل جرمن اوپن مقابلوں میں مونیکا نے اسٹیفی گراف کو اسی کے اپنے ہوم گراؤنڈ پر شکست دے کر اس کی مسلسل ٦٦ کامیابیوں کا ریکارڈ توڑا تھا۔ یہ فتح مونیکا کے لئے ایسی ہی تھی جیسے کسی خونخوار شیر کو کچھار میں جاکر زیر کر لینا۔ اس فتح کے ٹھیک دس دن بعد اس نے دنیا میں دوسرا نمبر رکھنے والی مارٹینا نورا تیلوا کو اٹلی کے اپنے ٹینس مقابلے میں شکست دی اور یوں خواتین ٹینس مقابلوں میں ایک سنسنی خیز فضا پیدا کر دی۔

اس فتح کے بعد اے۔ پی۔ ٹی یعنی ایسوسی ایشن آف پروفیشنل ٹینس نے مونیکا سیلس کو عالمی رینکنگ میں تیسرے نمبر پر کھڑا کر دیا سیٹفی گراف و آرانتکا سانچیز کے بعد مونیکا سیلس سرفہرست کھلاڑیوں میں شمار ہونے لگی تھی۔ کامیابی کے اس اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لئے مونیکا نے سخت محنت اور جدوجہد کی تھی۔ اس کی اپنی ایک الگ دلچسپ اور نصیحت آمیز کہانی ہے۔

مونیکا آج کامیابی کی جس بلندی پر کھڑی ہے وہاں تک پہنچنے کا سارا کریڈٹ وہ اپنے والد کو دیتی ہے۔ جنہوں نے اس کے اندر چھپی ہوئی کھلاڑی کو پہچانا اور پھر اس کی صلاحیتوں کو ابھارا۔

مونیکا سیلس ۲ دسمبر ۱۹۷۳ء کو "نوواساد" یوگوسلاویہ میں پیدا ہوئی۔ اس کے ابو مسٹر کرولی اپنے پیشے کے لحاظ سے ڈیزائنر اور کارٹونسٹ ہیں۔ وہ خود بھی اپنی ابتدائی عمر میں یوگوسلاویہ میں قومی سطح کے کھلاڑی رہے تھے۔ وہ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کے کھلاڑی تھے۔ اور ڈیزائنر و کارٹونسٹ بننے سے پہلے کچھ عرصے تک کوچ بھی رہے تھے۔

گھر میں اگر کوئی ایک فرد یعنی، ماں، باپ یا بھائی کھلاڑی ہو تو چھوٹے بچوں پر اس کا اثر لازمی ہوتا ہے۔ مونیکا سیلس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مونیکا کو ٹینس سے اس وقت دلچسپی پیدا ہوئی جب اس کے بھائی جالٹن نے اپنے اسکول کے ایک کھیل کے مقابلے میں کپ جیتا۔

اپنے بھائی جالٹن کی فتح اور اس فتح کے بعد اسے حاصل ہونے والی عزت نے مونیکا کو بے حد متاثر کیا۔ اور پھر اس نے بھی چھ سال کی ننھی سی عمر میں ریکٹ تھام لیا۔ مونیکا نے ٹینس سے اپنی دلچسپی کو صرف چار سال کے مختصر سے عرصے ہی میں سب پر ظاہر کر دیا۔ ۱۲ سال کی عمر میں مونیکا سیلس کو یوگوسلاویہ کی اہم ترین چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اور اسے اسپورٹ ویمن آف دی ائیر کا خطاب بھی ملا۔

مونیکا اس طرح یوگوسلاویہ کی پہلی خاتون کھلاڑی تھی جس نے سب سے کم عمری میں یہ خطاب اور اعزاز حاصل کیا تھا۔

بائیں ہاتھ (لیفٹ ہینڈ) سے کھیلنے والی اس نو عمر کھلاڑی کا قد ۶۲.۱ میٹر یعنی تقریباً ۴ فٹ ۹ انچ ہے۔ اور وزن ۴۵ کلو گرام۔ یورپین اسکرٹ میں بارہ سالہ مونیکا کو ٹینس کھیلتے اور میچ جیتتے دیکھ کر ایک امریکی کوچ مسٹر نائک بلیٹیئر بہت متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے مونیکا کو فلوریڈا آکر ٹینس کی تربیت حاصل کرنے کی دعوت دی تھی۔ مسٹر نائک نے اسی وقت مونیکا میں چھپے ٹینس کی عظیم کھلاڑی ہونے کے پوشیدہ جوہر دیکھ لئے تھے۔ نائک بلیٹیئر نے مونیکا کو نہ صرف تربیت دینے کی پیشکش کی بلکہ اسکالر شپ کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی فلوریڈا میں رہائشی سہولت دینے کے لئے کہا۔ اور یوں ۱۹۸۶ء میں مونیکا اپنے چھوٹے سے مختصر خاندان کے ساتھ نوواساد چھوڑ کر فلوریڈا پہنچ گئی۔ نائک بلیٹیئر نے مستقبل کی اس عظیم کھلاڑی کی تربیت دینے کے سلسلے میں ہی اپنے تمام وعدے پورے کئے اور بخوشی نبھائے۔

مونیکا نے بھی مسٹر نائک کو اپنا کوچ ہی نہیں اپنے والد کی جگہ تسلیم کیا اور انہیں ویسی ہی عزت اور احترام کا مستحق خیال کیا جیسے اس کے اپنے ابو ...... نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کی معمولی سی مدت میں مونیکا سیلس نے ٹینس کے کھیل کی تمام باریکیوں کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اور آٹھ۔ آٹھ گھنٹے مسلسل پریکٹس کرکے خود کو عالمی خاتون کھلاڑی منوانے کے لئے جد وجہد کرتی رہی۔

گذشتہ سال کے فرنچ اوپن میں جینا گیریسن نے مونیکا کے ہاتھوں شکست پانے کے بعد کہا تھا جس طرح پیرس میں پھول ناظرین کا دل لبھاتے ہیں اسی طرح مونیکا بھی ایک دن اپنے کھیل کے دلکش انداز سے

ناظرین کا دل موہ لے گی۔ اور ناظرین نے گیریسن کے اس قول کو پیرس کے اس مقام پر بہت جلد حقیقت کا روپ اختیار کرتے دیکھ لیا۔

مونیکا کے پرستاروں کا کہنا ہے اس کی کامیابی کا راز گیند کے پیچھے بھاگنے کے فن میں ہے۔ سیلس دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں اطراف میں شاٹ کھیلنے میں کس قدر ماہر ہو چکی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے اس کا کھیل دیکھا ہے سیلس کی کامیابی میں اس کا قبل از وقت صحیح اندازہ اور اسٹروک کھیلنے کی ٹائمنگ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ سیلس نے فرنچ، جرمن اور اطالوی مقابلوں کو جیت کر اپنے لئے کورٹ کے کھیل کی دلکشی کا احساس دلایا ہے۔

سیلس کے ناقدوں کا کہنا ہے چوں کہ وہ دونوں ہاتھوں سے کھیلتی ہے اس کے گراؤنڈ اسٹروکس کسی بھی قسم کی ندرت نہیں ہوتی۔ بر خلاف اس کے مونیکا کے کوچ مسٹر نائک بلیٹیئر کہتے ہیں کہ جو لوگ سیلس کے کھیل کے متعلق ایسے خیالات رکھتے ہیں وہ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مونیکا کے اسٹروکس میں ندرت کے ساتھ ساتھ انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ کھیل میں ہر کھلاڑی کے کھیلنے کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اور وہی اسے کامیابی و مقبولیت کی طرف لے جاتا ہے۔

مونیکا نے ۱۹۹۰ء کا فرنچ اوپن جیتنے کے بعد کہا تھا کہ میرا کردار ختم نہیں بلکہ اب شروع ہوا ہے۔ اور میں ومبلڈن مقابلے جیتنے کی آرزو رکھتی ہوں۔ اب دیکھنا ہے کہ مونیکا اپنے اس خواب کی تعبیر پانے میں کب تک کامیاب ہوتی ہے

ایک انٹرویو کے لئے چالیس امیدواروں نے دوڑتے بھاگتے اپنے کوائف سے متعلق فارم بھر کر جمع کرا دیئے متعلقہ افسر نے الٹ پلٹ کر سارے فارم دیکھے، پھر کچھ فارم الگ کر لئے جنہیں لے کر وہ ڈائس پر چڑھا اور امیدواروں سے مخاطب ہوا۔ "اب تک میں نے جتنے انٹرویو لئے ہیں ان میں یہ لوگ منفرد ہیں، ان لوگوں نے اپنے فارموں میں جو کوائف درج کئے ہیں ان کی رو سے میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہماری فرم خوش نصیب ہے کہ اس میں ملازمت کے امیدوار ایسے ہیں جن کا نام ہی نہیں ہے، تین بہت ہی شریف آدمی ایسے ہیں جن کا تعلق جنسی اعتبار سے دونوں اصناف سے ہے ایک امیدوار ایسا بھی ہے جو ابھی چند ماہ قبل ہی پیدا ہوا ہے ایک امیدوار تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے ہیں اس سے پہلے کہ میں اپنی تقریر ختم کروں، وہ صاحب ذرا کھڑے ہو جائیں جن کا قد پانچ کلو گرام اور وزن ایک سو پچاس فٹ ہے۔

روبینہ ناز۔ مخدوم پور

بچوں کا گیت

روحی کنجاہی

دھرتی ناچے، دم سے ہمارے
ہم سے رنگیں سارے نظارے
ہم ہیں پھول، ستارے، جگنو
پیار محبت، اپنی خوشبو
ہم سے مہکے گلشن گلشن
ہم سے مہکے آنگن آنگن
ہم ہیں پھول ، ستارے، جگنو
پیار محبت، اپنی خوشبو
مستقبل کے خواب سنہرے
ہم ہی نکلے، ہم ہی ٹھہرے
ہم ہیں پھول، ستارے، جگنو
پیار محبت اپنی خوشبو
گن گائیں گے اپنے وطن کے
کام آئیں گے اپنے وطن کے
ہم ہیں پھول، ستارے، جگنو
پیار محبت، اپنی خوشبو

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں ، ان کی تعداد بے شمار ہے ۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں ، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک ۔ بڑی تعداد میں پہنچتا ہے ۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز ۔ کراچی	فون :- ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال ۔ سرگودھا	فون :- ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی ۔ لاہور	فون :- ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی ۔ بہاولپور	فون :- ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب ۔ راولپنڈی	فون :- ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی ۔ جہلم	فون :- ۵۹۴۱ ۔
مہران نیوز ایجنسی ۔ حیدر آباد	فون :- ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز ۔ رحیم یار خان	فون :- ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی ، چوک یادگار ، پشاور	فون :- ۹۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	سلمان برادرز ۔ نواب شاہ	فون :- ۲۴۱۴
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس ، ملتان	فون :- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی ۔ اخبار گھر ۔ گوجرانوالہ	
فیاض بُک ڈپو ۔ فیصل آباد	فون :- ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی ۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ ۔ اوکاڑہ	
سعید بُک اسٹال ۔ گجرات	فون :- ۴۳۳۱ ۔	مسلم بُک ڈپو ۔ سرائے عالمگیر	

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲ ، نورس روڈ ، سائٹ کراچی ۱۶

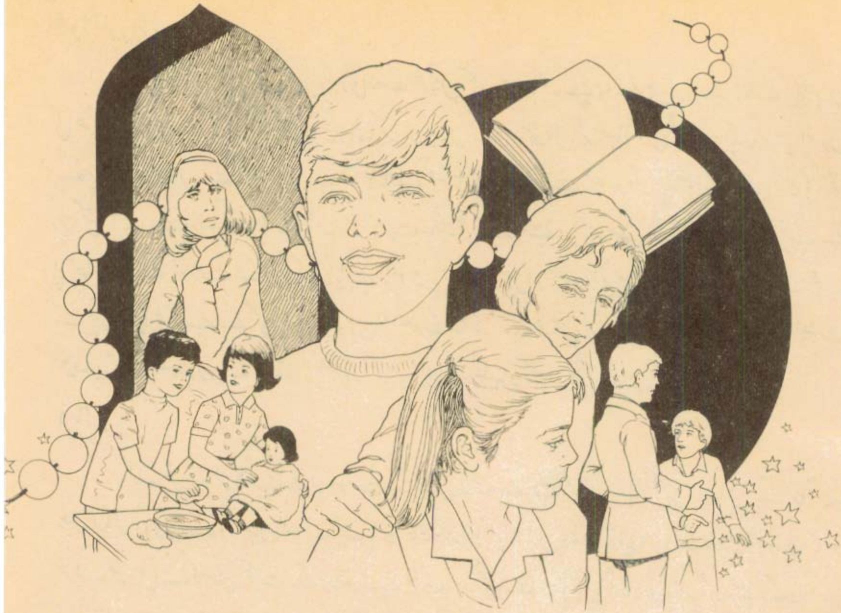

عربی اور فارسی ادب سے ماخوذ

ذہین بچوں کی حاضر جوابیاں

ابوعثمان شیخوپوری

بہترین اور بدترین:۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت لقمان بچپن میں ایک رئیس کے غلام تھے، رئیس نے ایک دن آپ سے کہا کہ بکری ذبح کر کے اس کے جسم میں سے بہترین گوشت پکا کر لاؤ، آپ نے بکری ذبح کر کے دل اور زبان کو بھونا اور پیش کر دیا، ایک دوسرے موقع پر اس نے کہا کہ آج بکری ذبح کرنے کے بعد اس کے گوشت میں سے بدترین چیز پکا کر پیش کرو آپ دوبارہ دل اور زبان پکا کر لے آئے اس نے حیرت سے پوچھا یہ کیا بہترین بھی وہی بدترین بھی وہی. آپ نے جواب دیا کہ دل اور زبان اگر صحیح ہو تو یہ انسانی جسم میں سے بہترین ہیں اور اگر یہی خراب ہو جائیں تو یہ سب سے بدترین ہیں۔

گھوڑا اور پَر:۔

سیدہ عائشہؓ بچپن میں کھیل کود کی بہت شوقین تھیں جیسا کہ بچّے ہوتے ہیں وہ اپنے زمانے کی بچیوں کی طرح پھٹے پرانے کپڑوں کی گڑیا وغیرہ بنا کر سہیلیوں کے ساتھ مل کر کھیلا کرتی تھیں، ایک مرتبہ انہوں نے پرانے چیتھڑوں سے گھوڑے سے ملتا جلتا ایک کھلونا بنایا، اتفاق سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر پڑ گئی آپ نے پوچھا عائشہ! یہ کیا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا یا رسول اللہ! گھوڑا ہے، آپ نے پوچھا یہ تم نے گھوڑے کے اوپر کیا بنایا ہے، عرض کیا کہ پَر ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب سے پوچھا کیا گھوڑے کے بھی پَر ہوتے ہیں؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کیا آپ نے نہیں سنا کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے پَر تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب سن کر مسکرائے۔

فرق:۔

ایک غریب لڑکا اپنے مالدار دوست کے پاس ملنے کے لئے گیا اور بے تکلفی سے اس کے اتنا قریب بیٹھ گیا کہ دونوں کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا۔ اس وقت شاید اس کے مالدار دوست کا موڈ خراب تھا اس نے انتہائی نفرت کے ساتھ اپنے غریب ساتھی سے سوال کیا تمہارے اور گدھے کے درمیان کیا فرق ہے اس نے فوراً جواب دیا "صرف ایک ہاتھ کا فرق ہے۔"

بے گناہ کو کیا ڈر:۔

ایک مرتبہ بچپن میں عبداللہ بن زبیرؓ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے وہاں سے حضرت عمرؓ بن خطاب کا گزر ہوا تو ان کی ہیبت سے سب بچے بھاگ گئے مگر یہ کھڑے رہے۔

حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کیا بات ہے اپنے دوستوں کے ساتھ تم نہیں بھاگے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین! میں نے کوئی جرم تو کیا نہیں تھا کہ ڈر کی وجہ سے بھاگ جاتا اور راستہ اتنا تنگ نہیں کہ مجھے آپ کے لئے جگہ چھوڑنی پڑتی۔

حفاظت اور تحفہ:۔

ثمامہ کا بیان ہے کہ میرا ایک دوست بیمار تھا میں اس کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر گیا اور اپنی سواری کے گدھے کو دروازے کے باہر چھوڑ دیا، میرے ساتھ کوئی نوکر بھی نہیں تھا جو گدھے کا خیال رکھتا، میں فارغ ہو کر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس پر ایک لڑکا بیٹھا ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ تم بغیر اجازت کے میرے گدھے پر کیوں سوار ہوگئے تو اس نے فوراً جواب دیا کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ بھاگ نہ

جائے اور آپ کو خواہ مخواہ تکلیف اٹھانی پڑے میں نے صرف تمہاری خاطر اس کی حفاظت کی، ثمامہ کہتے ہیں مجھے بہت غصہ آیا میں نے اسے لال پیلی آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا اگر یہ بھاگ جاتا تو اچھا تھا تمہیں اس فکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس لڑکے نے جواب دیا کہ اگر واقعی آپ کو اس گدھے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس کے بھاگ جانے کی کوئی پروا نہیں تو آپ سمجھ لیجئے کہ واقعی وہ بھاگ گیا ہے اور اسے مجھے بطور تحفہ کے دے دیجئے میں اس پر دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، ثمامہ کہتے ہیں اس چھوٹے بچے نے مجھے ایسا لاجواب کیا کہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔

فضول خرچی:۔

شام کا ایک شخص کہتا ہے کہ میں مشہور شاعر ابراہیم بن ہرمہ کے ہاں پہنچا وہاں دیکھا کہ گھر کے باہر ایک چھوٹی سی بچی مٹی سے کھیل رہی ہے میں نے اس سے کہا تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں؟ وہ کہنے لگی کہ وہ کسی سردار کے ہاں گئے تھے، انہیں گئے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے اور اب ہمیں ان کے بارے میں کچھ خبر نہیں کہ وہ کس حال میں ہیں، میں نے اس بچی سے کہا تم لوگ ہمارے لئے اونٹنی ذبح کر لو کیوں کہ ہم تمہارے مہمان ہیں، وہ بولی واللہ ہمارے پاس اونٹنی نہیں ہے، میں نے کہا اچھا بکری ذبح کر لو کہنے لگی واللہ ہمارے پاس نہیں، میں نے کہا مرغی ہی ذبح کر لو، بولی واللہ ہمارے گھر میں مرغی بھی نہیں، میں نے کہا چلو انڈا ہی سہی! بولی خدا کی قسم انڈا بھی نہیں ہے، میں نے کہا تو تمہارے ابا نے اپنے اس شعر میں یقیناً جھوٹ بولا ہے جس کا ترجمہ ہے "شدید بارش کے وقت میں نے بہت ساری اونٹنیوں اور اونٹوں کو ذبح کیا ہے اور اپنے ہاں آنے والوں کی مہمان نوازی کی ہے" لڑکی نے فوراً کہا ابا کی یہی تو فضول خرچی تھی جس نے ہمیں اس حال تک پہنچا دیا کہ آج ہمارے گھر میں مرغی کا انڈا تک نہیں۔

حافی:۔

ایک مشہور عالم گزرے ہیں جن کا نام بشر حافی تھا (عربی زبان میں "حافی" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ننگے پاؤں ہو) بشر حافی کہتے ہیں کہ میں اپنے دوست سے ملنے کے لئے اس کے مکان پر گیا میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے پوچھا گیا کون ہے؟ میں نے جواب دیا بشر حافی، تو گھر میں سے ایک چھوٹی سی بچی نے جواب دیا کہ اگر تم تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے جوتے خرید لیتے تو لوگ تمہیں "حافی" تو نہ کہتے۔

اچھا کون؟

ایک مرتبہ وقت کا:۔ شاہ خلیفہ معتصم باللہ اپنے وزیر خاقان کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر گیا، خلیفہ نے خاقان کے معصوم بچے فتح سے پوچھا یہ بتاؤ کہ کون سا مکان زیادہ اچھا ہے تمہارے ابا کا یا بادشاہ کا، فتح نے جواب دیا جب وقت کے بادشاہ میرے ابا کے مکان میں ہوں گے تو میرے ابا کا مکان ہی اچھا ہو گا، خلیفہ نے ہاتھ میں بہت قیمتی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی جس میں انتہائی خوبصورت نگینہ جڑا ہوا تھا، اس نے وہ نگینہ فتح کو دکھاتے ہوئے اس سے سوال کیا کہ کیا تم نے اس نگینہ سے زیادہ کوئی اچھی چیز دیکھی ہے؟ فتح نے جواب دیا ہاں! وہ ہاتھ جس میں یہ نگینہ ہے۔

انتظار:۔

ایک بچہ کچھ لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے بیٹھا لیکن فوراً ہی رونے لگا، انہوں نے پوچھا کیا وجہ ہے کیوں روتے ہو؟ بچے نے کہا کھانا بہت گرم ہے اس لئے روتا ہوں لوگوں نے کہا اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کیوں نہیں کر لیتے؟ اس نے کہا اگر میں ٹھنڈا ہونے کا انتظار کیا تو باقی کیا بچے گا؟ سب کچھ تو آپ لوگ چٹ کر جائیں گے۔

دولت اور حماقت:۔

عربی لغت کے مشہور ماہر اصمعی کہتے ہیں کہ میں نے ایک نو عمر لڑکے سے پوچھا کیا تم اس بات سے خوش ہو سکتے ہو کہ تمہارے پاس ایک لاکھ درہم ہوں اور ان کے ساتھ حماقت ہو، اس نے کہا خدا کی قسم ہرگز نہیں! میں نے کہا کیوں؟ اس نے کہا مجھے ڈر ہے کہ میری حماقت مجھ سے کوئی ایسی حرکت نہ کرا دے کہ مال تو ضائع ہو جائے اور میرے پاس صرف حماقت باقی رہ جائے۔

بچپنا:۔

امام شافعیؒ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ علم سے نوازا تھا وہ بچپن میں ہی بہت بڑے عالم اور استاد بن گئے تھے اور ان سے علم حاصل کرنے والے بڑی عمر کے لوگ ہوتے تھے۔ ایک دن امام شافعیؒ پڑھا رہے تھے سر پر پگڑی تھی، سامنے شاگردوں کی بہت بڑی جماعت تھی، اتفاق سے دو چڑیا آپس میں گتھم گتھا لڑتی بھڑتی فرش پر آ گریں، امام شافعیؒ نے چپکے سے سر سے پگڑی اتاری اور چڑیوں کو پکڑنے کے لئے ان کے اوپر پھینک دی، آپ کے عمر رسیدہ شاگرد حیرت اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ آپ کو دیکھنے لگے کہ یہ ہمارا کم عمر استاد کیا کر رہا ہے؟ آپ نے فوراً فرمایا اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ ابْنُ نَبِیٍّ (بچہ، بچہ ہوتا ہے

اگر چہ نبی کا ہی بیٹا کیوں نہ ہو)

رحمدل کا ہاتھ :۔

حضرت عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے ماتحت ایک ریاست کا ہندو راجہ مر گیا اس کا لڑکا ابھی بہت چھوٹا تھا، اسی لئے اس بات پر غور کیا جارہا تھا کہ حکومت اس کے سپرد کی جائے یا نہیں، عالمگیرؒ نے اسے امتحان لینے کے لئے بلوایا، جب وہ حاضر ہوا تو اس وقت آپ پانی کے تالاب کے کنارے پر کھڑے تھے، آپ نے دل لگی کے طور پر اس بچے کو دونوں بازوؤں سے اٹھا کر تالاب کے اوپر لٹکا کر پوچھا کیا چھوڑ دوں؟ اس نے کہا جس کا ہاتھ آپ جیسے رحمدل بادشاہ کے ہاتھ میں ہو اس کو ڈوبنے کا کیا ڈر ہے، آپ نے یہ عجیب اور برجستہ جواب سن کر حکومت اس کے سپرد کرنے کا فیصلہ فرما دیا۔

ڈر :۔

ایک بزرگ نے ایک بچے کو دیکھا کہ وہ بہت رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا اے اللہ ! مجھے جہنم کے عذاب سے بچانا، اے اللہ اے اللہ ! مجھے دوزخ کی آگ سے بچانا، بزرگ نے اس سے کہا اے معصوم بچے ! تم اتنا کیوں رو رہے ہو تمہیں دوزخ کی آگ کا کیا ڈر ہے تم تو ابھی بہت چھوٹے ہو، بھلا تمہارے جیسے معصوم بچوں کو اللہ تعالیٰ کیوں عذاب دے گا؟۔

بچے نے عجیب جواب دیا، کہنے لگا میں نے اپنی والدہ کو دیکھا ہے کہ جب وہ چولھے میں آگ جلاتی ہیں تو پہلے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھتی ہیں، ان کے اوپر بڑی بڑی لکڑیاں جماتی ہیں پھر آگ لگاتی ہیں، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں قیامت کے دن بھی ایسا ہی نہ ہو!

دو گدھوں کا بوجھ :۔

دو شہزادے شکار کرنے کے لئے جنگل میں جانے لگے تو اپنے نوکر کے بچے کو بھی اپنے ساتھ لے لیا، جب وہ شہزادے گھر سے نکلے تھے اس وقت صبح کا وقت تھا اور سردی تھی اس لئے انہوں نے بھاری بھرکم گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے جب دھوپ میں کچھ تمازت آگئی تو انہوں نے اپنے سارے زائد کپڑے اتار کر اس بچے پر لاد دیئے اور اسے مذاق سے کہا تمہارے اوپر تو اس وقت ایک گدھے کا بوجھ ہے، اس نے فی البدیہہ جواب دیا نہیں جناب ! دو گدھوں کا۔

کچّی اور پکّی قبر :۔

ایک مالدار شخص کا لڑکا اپنے ابا مرحوم کی قبر کے پاس بیٹھا ایک غریب بچے کے ساتھ بحث کرتے

ہوئے کہہ رہا تھا "میرے ابا کی قبر پختہ ہے اس میں سنگ مرمر کا فرش بچھایا گیا ہے اس کی دیواریں قیمتی پتھر سے بنائی گئی ہیں، اس کی تیاری میں منوں کے حساب سے لوہا اور سیمنٹ استعمال کیا گیا ہے اور تمہارے ابا کی قبر تو کچی ہے اس میں ذرا بھی پتھر اور چونا استعمال نہیں ہوا ہے، غریب لڑکا خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا اور آخر میں اس نے انتہائی معصوم انداز میں جواب دیا جی ہاں! تمہاری بات درست ہے۔ لیکن یاد رکھو جب تک تمہارے ابا جان منوں بوجھ تلے بڑی مشکل سے کروٹ بدلیں گے میرے ابا اس وقت تک جنت میں پہنچ چکے ہوں گے۔

دولت خانہ:۔

ایک مہمان نواز بھیڑیئے نے غریب بکری کے بچے سے کہا "مجھے آپ سے بڑی محبت ہے ہر وقت آپ کی ملاقات کے لئے بے چین رہتا ہوں اگر کبھی میرے غریب خانہ میں تشریف لائیں تو ایک دوسرے کو دل کا حال سنائیں بکری کے بچے نے جواب دیا، جناب کی ملاقات کو میرا دل بھی بہت چاہتا ہے اگر آپ کا دولت خانہ آپ کا پیٹ نہ ہوتا تو میں ضرور حاضری دیتا۔"

جیسی ماں:۔

کیکڑے کی ماں نے اپنے بچے سے کہا کیسی بے ڈھنگی چال ہے تیری، تو ایسا ٹیڑھا ترچھا کیوں چلتا ہے؟ سیدھے چلا کرو، لوگ کیا کہیں گے اسے چلنا بھی نہیں آتا، ننھے کیکڑے نے جواب دیا، اماں تم مجھے ذرا سیدھا چل کر دکھا دو، جس طرح تمہیں سیدھے چلتا ہوا دیکھوں گا اسی طرح میں بھی چلنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کو کیسے پتا چلا؟

ایک صاحب اپنے بچے کو نماز پڑھنا سکھا رہے تھے۔ انہوں نے بچے کو اپنے ساتھ کھڑا کیا اور نماز پڑھنے لگے نماز ختم ہونے کے بعد انہوں نے بچے سے کہا کہ بیٹا نماز کے دوران ادھر ادھر نہیں دیکھتے بچے نے کہا لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

سلطانہ خلیل ...... لاہور

بچوں کا پہلا رسالہ

طاہر مسعود

آج جب آپ کسی بھی بک اسٹال پر جاتے ہیں تو وہاں آپ کو بچوں کے رنگ برنگے رسائل نظر آتے ہیں۔ ان میں ایسے رسالے بھی ہوتے ہیں جن میں رنگین تصویریں اور دلچسپ کہانیاں ہوتی ہیں۔ جادوگر اور بادشاہ کی کہانیاں، شہزادے اور پریوں کی کہانیاں اور ایسے رسالے بھی آپ کو دکھائی دیتے ہیں جن میں معلوماتی، سائنسی مضامین اور مہماتی کہانیاں، دلچسپ کھیل اور معمے ہوتے ہیں۔ آپ سوچتے ہیں کہ ان میں سے کون سا رسالہ خریدا جائے۔ پھر آپ وہی رسالہ خریدتے ہیں جو پڑھنے میں مزیدار بھی ہو، فائدہ مند بھی ہو اور جس کے ساتھ آپ کو کوئی تحفہ بھی ملے۔ آپ واقعی خوش نصیب ہیں۔ کیونکہ آپ ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب آپ کو پڑھنے کے لئے طرح طرح کے رسالے مل سکتے ہیں۔ آج سے تقریباً ایک صدی پہلے بچوں کو یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ اس لئے کہ ان زمانے میں بچوں کا کوئی رسالہ ہی نہیں نکلتا تھا۔ بے چارے بچے اپنی امی ابو سے رات کو سوتے ہوئے کہانیاں سن لیا کرتے تھے۔ اور جس رات امی، ابو

یا دادی جان کہانیاں نہیں سناتے تھے تو انہیں اس کے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ کوئی اچھی صورت حال نہیں تھی۔ جب بڑوں کے لئے پڑھنے کے اخباروں اور رسالے نکل سکتے تھے تو بچوں کو بھی اسکول کی کتابوں سے ہٹ کر پڑھنے کے لئے کچھ نہ کچھ ملنا چاہئے تھا۔ پس لاہور کے ایک مشہور صحافی مولوی محبوب عالم نے پہلی بار سوچا کہ کیوں نا بچوں کے لئے بھی ایک رسالہ نکالا جائے۔ اور یوں آپ نے مئی ۱۹۰۲ء میں اردو زبان میں بچوں کا پہلا رسالہ "بچوں کا اخبار" کے نام سے جاری کیا۔ لیکن اس رسالے سے پہلے ہم آپ کو اس کے ایڈیٹر کے بارے میں بتاتے ہیں۔ مولوی محبوب عالم کا شمار اردو کے چند بڑے صحافیوں میں ہوتا ہے۔

انہوں نے تقریباً دس اخبارات نکالے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت "پیسہ" اخبار کو ملی۔ یہ اخبار ایک پیسے میں بکا کرتا تھا۔ لاہور میں اس مقبول اخبار کے نام پر ایک سڑک کا نام پیسہ اسٹریٹ رکھا گیا۔ مولوی محبوب عالم نے بے شمار صحافیوں کی تربیت کی۔ اس لئے آپ کو "ایڈیٹر گر ایڈیٹر" بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخبار میں جتنے صحافیوں نے آکر صحافت کی تربیت حاصل کی۔ انہوں نے پھر بعد میں اپنے اخبارات بھی جاری کئے۔ منشی محبوب عالم ابھی زیر تعلیم تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے آپ کو تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ پھر آپ نے پرائیوٹ "منشی" کا امتحان دیا اور پورے صوبے میں اول آئے اور وظیفہ حاصل کیا۔ مولوی محبوب عالم کے ایک چچا ماسٹر محمد الدین قصور ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ایک ماہانہ رسالہ "کلید امتحان، مڈل وانٹرنس" کے نام سے نکالا کرتے تھے انہوں نے یہ رسالہ نکالنے کی ذمہ داری مولوی محبوب عالم کے سپرد کر دی۔ اس واقعہ نے مولوی صاحب کی زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ رسالے کا انتظام سنبھالتے ہی آپ نے ایک چھوٹا سا پریس کھول لیا۔ اور اس کا نام "خادم التعلیم" رکھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد آپ نے پنجاب کے زمینداروں کے لئے ایک رسالہ "زمیندار و باغبان و بیطار" نکالا جو اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا کیونکہ اس میں صرف زمینداروں کی دلچسپی کی چیزیں چھپتی تھیں۔ اس رسالے کو خاصا پسند کیا گیا۔ پھر تو مولوی محبوب عالم نے تیزی سے رسالے نکالنے شروع کر دیئے۔ آپ نے ۱۸۸۷ء میں ایک ہفت روزہ اخبار "ہمت" نکالا۔ تھوڑے دنوں بعد ہفت روزہ "اسکول ماسٹر" جاری کیا چونکہ آپ ایک اچھے اخبار نویس کے علاوہ بہت اچھا کاروباری ذہن بھی رکھتے تھے۔ اس لئے بہت جلد بھانپ گئے کہ رسالے یا اخبار کو کامیابی سے کس طرح چلایا جاتا ہے۔ اور لوگ کس قسم کے رسالے پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ آپ نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک اخبار "پیسہ" جاری کیا۔ یہ وہی اخبار تھا جس کا نام پہلے انہوں نے "ہمت" رکھا تھا اس اخبار نے بہت ترقی کی۔ اور یہ اتنا مقبول ہوا کہ آگے چل کر ہفت روزے سے

روزنامہ بن گیا۔ اردو صحافت کی ترقی میں اس اخبار نے بہت اہم کردار ادا کیا کیونکہ اس اخبار سے پہلے لوگوں میں اخبار پڑھنے کا اتنا ذوق و شوق نہیں پایا جاتا تھا۔ اخبار پڑھنے کا شوق اسی اخبار نے لوگوں میں پیدا کیا۔ مولوی محبوب عالم اب ہندوستان کے بہت بڑے صحافی بن گئے تھے۔ لیکن ان کی ترقی کا سفر رکا نہیں آپ نے عورتوں کے لئے ایک رسالہ ''شریف بی بی'' بھی نکالا جو عورتوں میں پسند کیا گیا مولوی محبوب عالم اخبار نویس کے علاوہ خود بھی اونچے درجے کے مصنف تھے۔ آپ نے پچاس کتابیں لکھیں اور اپنے پریس سے تقریباً سات سو کتابیں شائع کیں آپ کا ذاتی کتب خانہ بہت بڑا تھا اور اس میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ آپ کی سب سے مشہور کتاب ''سفر یورپ'' ہے جس میں آپ نے یورپ کے سفر کے دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ جب مولوی محبوب عالم نے ہر قسم کے اخبار اور رسالے نکال لئے تو انہیں خیال آیا کہ ملک میں لاکھوں بچے ہیں، ان کے پڑھنے کے لئے بھی ایک دلچسپ اور مفید رسالہ ہونا چاہئے لیکن ساتھ ہی انہیں اندیشہ تھا کہ چونکہ اب تک ہندوستان میں بچوں کے لئے کوئی رسالہ نہیں نکلا ہے اور بچے بھی رسالے پڑھنے کے عادی نہیں ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رسالہ نکالیں اور اسے کوئی خریدنا بھی پسند نہ کرے۔ لیکن پھر انہوں نے سوچا کہ جب یورپ میں بچوں کے رسالے نکلتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے ملک کے بچوں میں ایسا رسالہ مقبول نہ ہو۔ یہ سوچ کر انہوں نے اللہ کا نام لے کر ''بچوں کا اخبار'' جاری کر دیا۔ اس رسالے کے ۴۸ صفحات تھے اور اس کی قیمت ۳ آنے تھی۔ اس زمانے میں چونکہ تعلیم بہت زیادہ نہیں پھیلی تھی اور لوگ اخبار یا رسالے بہت کم خریدتے تھے اسی لئے یہ ساڑھے پانچ چھ سو کی تعداد میں چھپتا تھا۔ اور یہ تعداد اس زمانے کے لحاظ سے اچھی خاصی سمجھی جاتی تھی۔

''بچوں کا اخبار'' نکلا تو ایک دھوم مچ گئی۔ جس نے دیکھا اس کی تعریف کی۔ مولوی محبوب عالم کو مبارک باد اور تعریف و توصیف کے خطوط ملنے شروع ہو گئے۔ جس سے ان کی بہت ہمّت بندھی۔ ''بچوں کا اخبار'' اسی سائز میں چھپتا تھا جس میں آج کل زیادہ تر رسالے چھپتے ہیں۔ اس میں سبق آموز کہانیاں، دلچسپ معلوماتی مضامین، معمے، مزیدار کھیل، ورزش کرنے کے طریقے دنیا کے بڑے لوگوں کے بچپن کے حالات شائع کئے جاتے تھے۔ دیس دیس کے بچوں کے متعلق معلومات بتائی جاتی تھیں۔ بچوں کو مختلف پیشوں سے آگاہ کیا جاتا تھا تاکہ وہ اسی عمر میں فیصلہ کر سکیں کہ انہیں آگے چل کر کیا بننا ہے اور کون سا پیشہ اختیار کرنا ہے۔ ان مضامین کا مستقل عنوان ہوتا تھا۔ ''میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا۔؟'' ایک مستقل سلسلہ ''بچوں کی مجلس'' کے عنوان سے چھپتا تھا جس میں نو عمر بچوں کو عمدہ موضوعات دے کر ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ ان پر مضامین لکھ کر بھیجیں۔ اسی طرح ''اخلاق و آداب'' کے عنوان سے تہذیب و شائستگی پر نصیحت

آموز مضامین چھپتے تھے۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ "بچوں کے اخبار" میں جتنی کہانیاں چھپتی تھیں ان میں کوئی کہانی بادشاہ، شہزادے، شہزادیوں، یا جادوگر، دیو اور پریوں کی نہیں ہوتی تھی۔ ساری کہانیاں سبق آموز ہوتی تھیں اور عام انسانوں کی ہوتی تھیں۔ گویا جادوگر اور دیو کی کہانیاں بعد میں رسالوں میں شائع ہونی شروع ہوئیں۔

"بچوں کے اخبار" میں صرف بچوں ہی کی تحریریں نہیں چھپتی تھیں۔ بلکہ ملک کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اس کے لئے مضامین، نظمیں اور کہانیاں لکھیں۔ مثلاً علامہ اقبال کی مشہور نظم "محنت" پہلی بار اسی رسالے میں چھپی۔ اس کے علاوہ اردو کے ایک بلند پایہ رسالہ "زمانہ" کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم "اور رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر" معروف صحافی منشی محمد دین فوق اور دوسرے بہت سے رسالوں کے ایڈیٹروں نے بھی "بچوں کا اخبار" کے لئے بہت کچھ لکھا۔ گویا اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں نے اس رسالے کی اہمیت محسوس کی اور اس کے لئے وقت نکال کر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے رہے۔

"بچوں کا اخبار" دس سال تک نکلتا رہا۔ اور پھر ۱۹۱۲ء میں نکلنا بند ہوگیا۔ لیکن اس نے ایک ایسی راہ دکھادی جس کے بعد بچوں کے لئے رسالے نکلنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آنکھ مچولی کے اس شمارے میں بنجمن فرینکلن پر جو مضمون آپ پڑھیں گے اسے ہم نے "بچوں کا اخبار" ہی سے لیا ہے۔ اسے پڑھئے اور دیکھئے کہ اس رسالے میں کیسے مفید اور معلوماتی مضامین چھپتے تھے۔ یقیناً اردو پڑھنے والے کروڑوں بچے مولوی محبوب عالم کے شکر گزار ہیں جنہوں نے "بچوں کا اخبار" جاری کرکے اردو صحافت میں ایک نئے رجحان کا اضافہ کیا۔

عجیب و غریب بچے

شیخ عاکف حمید

چنگ اور انگ۔

۱۸۱۱ء میں سیام (تھائی لینڈ) میں ایک چینی نشراد ماہی گیر کے ہاں دو جڑواں لڑکے چنگ اور انگ پیدا ہوئے۔ جو کمر کے حصے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اور انہیں علیحدہ کرنا ناممکن تھا۔ ۱۸۳۹ء میں یہ دونوں بھائی ۲۸ برس کی عمر میں امریکہ گئے۔ اور وہیں کی شہریت اختیار کرلی۔ یہاں انہوں نے سارا اور ایڈلیڈ نامی دو بہنوں سے شادی کرلی۔ چنگ اور انگ جڑے ہونے کے باوجود دوڑ سکتے تھے۔ تیر سکتے تھے۔ قلابازیاں لگا سکتے تھے۔ گھڑ سواری کر سکتے تھے۔ اور بیڈ منٹن کھیل لیتے تھے۔

۱۷ جنوری ۱۸۷۴ء کو چنگ شراب نوشی کے باعث نرخرے کی نالیوں میں ورم ہونے سے مرگیا۔ چنانچہ ڈاکٹر کو بلایا گیا کہ اگر ممکن ہو تو اب انگ کو اپریشن کرکے علیحدہ کردے مگر ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی انگ بھی دم توڑ چکا تھا۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ انہیں علیحدہ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ کیوں کہ ان کا

دوران خون ایک تھا۔

عمر ۸ سال، وزن ۳۴۹ پونڈ!

برٹش میڈیکل جرنل نے اپنی فروری ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں ایک ایسے بچے کا ذکر کیا ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ تیزی سے بڑھنے والا بچہ تھا۔ یہ میلسن فیرنیپلز (اٹلی) کی مائنکلیا ویلنٹی تھی۔ پیدائش کے وقت اس کا وزن ۷ پونڈ تھا اور ۸ سال کی عمر میں اس کا وزن ۳۲۹ پونڈ تھا۔

سات سالہ بوڑھا

۱۹۲۹ء میں انگلینڈ میں چارلس ورتھ نامی بچہ پیدا ہوا۔ جب اس کی عمر ۴ برس تھی۔ وہ سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا۔ جب وہ سات برس کا ہوا تو انتہائی ضعیف ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ سوکھ گیا تھا۔ سر کے بال اور مونچھیں سفید ہو گئی تھیں۔ جلد پر جھریاں اور شکنیں پڑ گئیں تھیں۔ اور وہ بوڑھوں کی طرح بمشکل چل پھر سکتا تھا۔ ۷ سال کی عمر میں ہی وہ فوت ہو گیا۔

بے مثال ذہانت

چارلس گرینڈ مینج ۱۸۳۵ء میں فرانس میں پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت اس کا وزن ایک پونڈ تھا۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں نہ تھے۔

کئی ہفتے تک اس کی ماں سے پوشیدہ رکھا گیا کہ کہیں وہ اسے دیکھ کر حواس نہ کھودے۔

لیکن ان سب باتوں کی کمی قدرت نے اسے زبردست دماغ دے کر پوری کر دی۔

وہ حیرت انگیز ذہانت کا مالک تھا۔

۱۴ برس کی عمر میں اس نے یورپ کا دورہ کیا۔ وہ لکڑی کے ایک فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے بکس میں رہتا تھا۔ اور ریاضی کے مشکل سے مشکل سوال چٹکی بجاتے حل کر دیتا تھا۔

کم وزن انسان

دنیا کا سب سے کم وزن انسان ہونے کا اعزاز ایک لڑکی لوسیار زیٹ کو حاصل ہے۔

اس کا تعلق میکسیکو سے تھا۔

لوسیار زیٹ ۲ جنوری ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئی تھی۔ اور پیدائش کے وقت اس کا وزن ڈھائی پونڈ تھا۔

اور ۲۰ سال کی عمر میں اس کا وزن ۱۳ پونڈ تھا۔
اس نے ۱۸۸۹ء میں وفات پائی۔

عجیب الخلقت بچہ

۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کو چین کے علاقے ہویان میں ایک عجیب الخلقت بچہ پیدا ہوا۔
اس بچے کے تمام اعضاء صحیح ہیں مگر تمام اعضاء سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ بال مزید لمبے اور گھنے ہوتے جا رہے ہیں۔
صرف بچے کی ناک، ہونٹ، ہتھیلیاں اور پاؤں کے تلوے بالوں سے محفوظ ہیں۔ باقی جسم پر بال ہی بال ہیں اور یوں لگتا ہے۔
اس نے بالوں کا لباس پہن رکھا ہے۔

بچہ جس کا دماغ ہی نہ تھا

۱۹۳۵ء میں نیویارک کے سینٹ ونسنٹ ہسپتال میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوا۔ جس کا دماغ ہی نہ تھا۔
یہ بچہ سائنس کے تمام اصولوں کے برخلاف ۲۷ دن تک نہ صرف زندہ رہا۔ بلکہ عام بچوں کی طرح چیختا چلّاتا اور دودھ پیتا رہا۔

پیدائش کے وقت عمر ۹ ماہ

جاپان جسے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا کا واحد ملک ہے۔ جہاں بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی عمر ۹ ماہ تسلیم کی جاتی ہے۔

احتیاط

پوتا : داداجان! کیا آپ کے منہ میں دانت ہیں؟
دادا : نہیں بیٹا! کیوں کیا کرو گے؟
پوتا : ذرا میرے اخروٹ رکھ لیجئے۔

رضوان لریۂ ملکّت

سوچیئے تو!!
خدانخواستہ جان پر بن آئے
اور خون کے بنا کوئی چارہ نہ ہو
آج آپ
کسی کو خون کا عطیہ دیجئے
کل کوئی
آپ کے کام آئے گا۔
منجانب
جملہ اقسام کی چھپی ہوئی تھیلیاں اور شاپنگ بیگ تیار کرنے والا معروف ادارہ
جیلانی انڈسٹریل کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
F.312 ۔ سائٹ کراچی۔ فون نمبر ۲۹۵۶۷۹،۸۹ ۔ ۲۹۷۱۶۱ ۔ فیکس ۴۱۳۴۴۸

مستقبل کی تلاش میں

محمد بشیر جمعہ

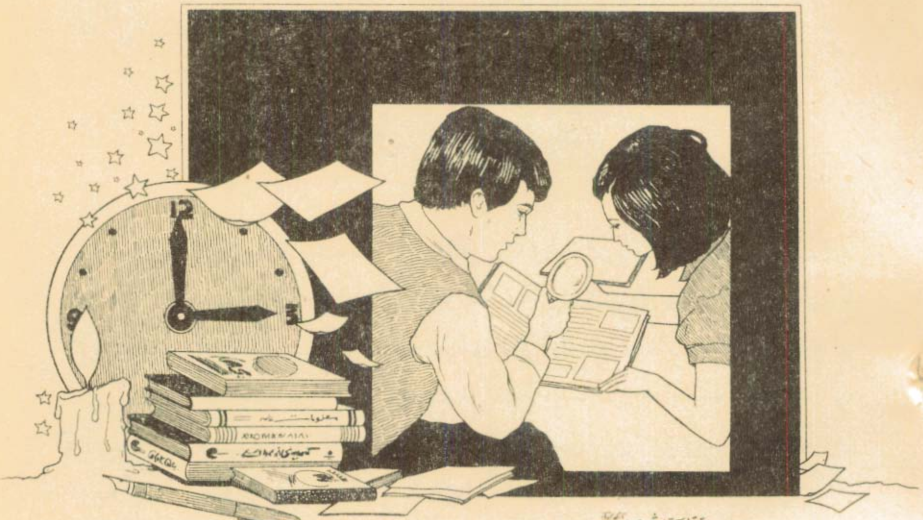

مستقبل کی تلاش میں

تصویر ٹھیک کر لیجئے

ایک صاحب اپنے گھر میں مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کا پانچ چھ سال کا بچہ بار بار پریشان کر رہا تھا۔ صاحب نے کئی بار کوشش کی کہ وہ مطالعہ کے دوران تکلیف نہ دے مگر بچہ ماننے والا کہاں تھا۔ صاحب کو ایک ترکیب سوجھی اپنے بیٹے کو مصروف رکھنے کی، تاکہ بچہ چند گھنٹے تک اپنے والد صاحب کو پریشان نہ کر سکے۔ ترکیب یہ تھی کہ صاحب نے دنیا کا ایک نقشہ لیا اور بیٹے کو بتایا کہ یہاں پر پاکستان ہے، یہاں ہمالیہ،

یہاں بحر الکاہل اور یہاں امریکہ یہ سب بتانے کے بعد صاحب نے نقشے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بیٹے سے کہا کہ اب وہ اسے صحیح ترتیب کے ساتھ بنا کر لائے۔ صاحب کو توقع تھی کہ بیٹا چند گھنٹے لگائے گا اور پھر آئے گا۔ یا پھر ممکن ہے کہ وہ نقشہ دوبارہ بنا ہی نہ سکے۔ ابھی کوئی آدھا گھنٹہ ہی ہوا کہ بچہ خوشی سے دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا ابو! ابو! دنیا کا نقشہ بن گیا۔ ابو جان نے دیکھا۔ ہر چیز اور ہر مقام اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک تھی۔ بیٹے کی ذہانت پر تعجب ہوا اور پوچھا بیٹے یہ کیسے ممکن ہوا۔ بیٹے نے جواب دیا۔ وہ جواب جو سب کے لئے اہم ہے۔ جواب تھا۔ ابو ابو جب آپ نقشہ پھاڑ رہے تھے تو اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے پیچھے آدمی کی تصویر تھی بس میں نے اس تصویر کو ٹھیک کر لیا۔ دنیا کا نقشہ خود بخود ٹھیک ہو گیا۔

اپنی دنیا ٹھیک کر لیجئے

ہر انسان کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ کسی کی دنیا کلاس کا کمرہ، اسکول کے طلبہ، اپنا گھر، دفتر وغیرہ وغیرہ۔ ہر انسان چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا وہ ضرور چاہتا ہے کہ وہ جس دنیا میں رہتا ہے اور جہاں جہاں اس کا تعلق ہے وہ ٹھیک ہو جائے مگر یہ دنیا ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لیتی بلکہ روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے اور ہم ہیں کہ اس دنیا کے مقابلے میں مسلسل تھک رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنی دنیا ٹھیک کب ہو گی۔ اس کا جواب وہی ہے جو بچے نے دیا۔ تصویر ٹھیک کر لیجئے۔ یعنی ہر انسان کو اپنی تصویر ٹھیک کرنی ہو گی۔ اپنی تصویر کو ٹھیک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی شخصیت اور ذات میں جو جو خرابیاں ہیں وہ دور کرنی ہیں اور نئے دور کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مستقبل میں جن جن صلاحیتوں اور قابلیتوں کی ضرورت ہے ان کی تیاری اور اس کے حصول کے لئے منصوبہ بندی اور کوشش کرنی ہے۔ اگر ہم نے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے آج اپنے مقاصد متعین کر لئے اور ان کے حصول کے لئے تیاری شروع کر دی تو ممکن ہے کہ مستقبل ہماری تلاش میں ہو۔ بس اس کے لئے سب سے پہلے آپریشن کی ضرورت ہے۔

آپریشن تھیٹر میں

دیکھئے جب انسان مریض ہوتا ہے اور اس کا علاج کھانے اور پینے والی دواؤں سے ممکن نہیں ہوتا تو

ڈاکٹر مشورہ دیتے ہیں کہ آپریشن کرالیں۔ بعض اوقات ایمرجنسی میں آپریشن کرنے ہوتے ہیں اور بعض اوقات کچھ وقت نکال کر مگر یہ حقیقت ہے کہ چند امراض ایسے ہیں کہ ان کا علاج صرف آپریشن ہی سے ممکن ہے۔ آپریشن جس کمرے میں ہوتا ہے اسے آپریشن تھیٹر کہا جاتا ہے۔ وہاں سرجن ڈاکٹر ہوتا ہے اور اس کے معاون اور آپریشن کی میز پر صرف مریض۔ اس کمرے میں چند مخصوص روشنیاں جلائی جاتی ہیں اور انتہائی احتیاط کے ساتھ آپریشن کیا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے آیئے اپنے آپ کو اس آپریشن تھیٹر میں لے جایئے۔ آپ خود ہی مریض بن جایئے اور خود ہی ڈاکٹر بن جایئے۔ یعنی اپنے آپ کو چند لمحوں کے لئے اس گہما گہمی سے دور کر کے اپنی شخصیت کا آپریشن کیجئے۔ دیکھئے اس وقت آپ آپریشن تھیٹر میں ہیں اور اپنے ضمیر کی روشنی اور اپنے دماغ کی اوزاروں سے اپنے مرض کی تشخیص اور علاج کر رہے ہیں۔ اس آپریشن میں آپ کو دو بیماریاں نظر آ رہی ہیں۔ یعنی آپ کی شخصیت میں بیماریوں کے دو قسم کے جراثیم ہیں ایک قسم کے جراثیم وہ ہیں جو آپ کی شخصیت کو مسلسل کھائے جا رہے ہیں اور دوسرے جراثیم کی قسم وہ ہے جس کے باعث آپ کی شخصیت ترقی نہیں کر سکتی۔

دو قسم کے جراثیم

شخصیت کے ان دونوں قسم کے جراثیم کو ہم سستی و کاہلی اور احساس کمتری کا نام دیتے ہیں۔ آپ اس بات کا تہیہ کر لیجئے کہ آج کے دن ہم ان دونوں قسم کے جراثیم کو اپنی شخصیت سے نکالنے کی کوشش کریں گے۔

سستی اور کاہلی

طبیعت میں سستی اور کاہلی اور "کل کر لیں گے" والا مزاج بہت نقصان دہ ہے۔ اس مزاج کے باعث ہم ہر کام کو ملتوی اور مؤخر کرتے رہتے ہیں۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ہم اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ جو چیز آج پڑھنی ہوتی ہے اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ کل پڑھ لیں گے۔ یہ کل کا لفظ ایک

دھوکا ہے۔ داناؤں کے رجسٹروں میں کبھی کل کا لفظ نہیں ملتا۔ البتہ بے وقوفوں کی جنتریوں میں یہ کثرت سے ملتا ہے۔ عقلمندی اس لفظ کو قبول نہیں کرتی اور نہ سوسائٹی اسے منظور کرتی ہے۔ یہ خیالی پلاؤ پکانے والوں کا سہارا ہے۔ کامیابی کی شاہراہ پر بے شمار اپاہج سسکتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اپنی عمر "کل" کے انتظار میں کھو دی اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی ہے۔ ہم اس دھوکے میں ہاتھ پیر دھرے بیٹھے رہے کہ "کل" ہمارے لئے بھی اچھی اچھی نعمتیں اور فائدہ منداشیاء لائے گا مگر وہ "کل" ابھی تک آیا ہی نہیں۔

ہم اس سستی اور کاہلی کو چھپانے کے لئے بہانے بھی تلاش کرتے ہیں۔ ضروری کاموں کو چھوڑ کر غیر ضروری کاموں میں مصروف رہنے میں لذت ملتی ہے۔ جیسے پڑھائی کے اوقات میں اخبار پڑھنے اور رسالے پڑھنے میں لذت ملتی ہے۔ ان بہانوں سے بھی آپ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس بیماری کے باعث مالیاتی نقصان بھی ہوتا ہے۔ پڑھائی بھی متاثر ہوتی ہے۔ اور مستقبل کی منصوبہ بندی بھی متاثر ہوتی ہے۔ وعدہ خلافی کی عادت پیدا ہوتی ہے جس کے باعث ناراضگیاں بڑھتی ہیں۔ شرمندگی اور پشیمانی اٹھانی پڑتی ہے۔ انسان کی یکسوئی ختم ہو جاتی ہے وہ پریشان ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کو ملامت کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ آپ (۱) اپنے مقصدِ زندگی کا شعور حاصل کریں (۲) زندگی میں کامیابی کے لئے ہدف متعین کریں۔ (۳) ان اہداف کو حاصل کرنے کے لئے منصوبہ بندی کریں (۴) اس منصوبہ بندی کے مطابق عمل کرنے کے لئے ایکشن پلان بنائیں۔ (۵) اس ایکشن پلان اور اہداف اور مقصد زندگی کے درمیان ربط کا آپ وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہیں۔ (۶) ان تمام معاملات میں آپ اپنا شیڈول بنائیں اور ٹائم ٹیبل بنائیں۔ (۷) اس کے مطابق اپنی یومیہ ترجیحات متعین کریں (۸) اپنی شخصیت کو اتنا منظم کریں کہ آپ اپنی یومیہ ترجیحات اور ٹائم ٹیبل پر موڈ کو حاوی نہ ہونے دیں "ابھی ورنہ کبھی نہیں" والی عادت ڈالیں (۹) اپنے یومیہ ٹارگٹ کو پورا کریں۔ (۱۰) روزانہ رات کو سونے سے قبل جائزہ لیں اور صبح گھر سے نکلنے سے قبل آج کی منصوبہ بندی کریں۔

احساس کمتری

یہ احساس، جو شخصیت کو اندر ہی اندر دبائے رکھتا ہے اور انسان کو آگے بڑھنے نہیں دیتا، ایک

نفسیاتی بیماری ہے۔ مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر مارڈن ایک ایسے فرد کا ذکر کرتے ہیں جو اس مرض میں مبتلا تھا۔ وہ کہتے ہیں "میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو نہایت شاندار کام سرانجام دے سکتا تھا مگر اس کی زندگی محض اس وجہ سے تباہ ہوگئی کہ جب وہ بچہ تھا تو بار بار اس کے کانوں میں یہی آواز پڑتی تھی کہ تم بے وقوف ہو، جاہل ہو، احمق ہو۔ اس کا بیان ہے کہ بعد میں جب کبھی اسے کوئی عہدہ یا ذمہ داری پیش کی جاتی تو اس کی کمزوری کی تصویر جو اس کے دماغ میں تھی سامنے آجاتی اور وہ محسوس کرتا کہ اس میں قابلیت نہیں جو اس کے ساتھیوں میں ہے۔ اس طرح میدان عمل میں وہ کبھی جوانمرد بن کر سامنے نہیں آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ احساس ہمارے اکثر نوجوانوں میں ہوتا ہے جس کے باعث وہ شاہراہ ترقی پر گامزن نہیں ہوسکتے اور اگر کسی وجہ سے آبھی جاتے ہیں تو بہت سست رفتاری سے اپنا سفر طے کرتے ہیں۔

مشہور عیسائی مبلغ اور ماہر نفسیات ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل اس کا یہ علاج بتاتے ہیں۔

(۱) یہ احساس ایک جذباتی معاملہ ہے بہتر ہے اس سلسلے میں قابل اعتماد افراد سے مشورہ کریں (۲) اپنے مرض کو پہچاننے کی کوشش کیجئے (۳) اپنے خوف کو بھول جائیے اور جو کام سامنے ہے اسے کرنے کی کوشش کیجئے (۴) دنیا کے کامیاب لوگوں کا مطالعہ کیجئے اور ان کی زندگی کے اہم واقعات اور چیلنجوں کو ذہن نشین کیجئے (۵) اپنے ذہن میں اپنے متعلق ایک قابل اہل اور بااعتماد شخص کی تصویر بنائیے (۶) اللہ کی عبادت کیجئے اور اس پر قائم رہیئے۔

اب مقابلہ کے میدان میں آجائیے

آپ ابھی تک اپنی ان دو اہم بیماریوں کے علاج کے لئے آپریشن تھیٹر میں تھے اب آپ ذرا باہر آجائیے۔ آپ کی شخصیت کا روگ ختم ہوچکا ہے اب آپ شاہراہ کامیابی پر ایک اہم مقابلے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ زندگی ایک ختم نہ ہونے والے مقابلے کا نام ہے۔ اس مقابلے میں کروڑوں انسان ہم سے بہتر ہوتے ہیں اور ہم کروڑوں انسانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ مگر مقابلہ لازمی چیز ہے۔ اس مقابلے اور گیم کے اپنے قواعد و ضوابط ہیں لیکن انسان کو اس میدان میں مقابلہ کا حق حاصل ہے۔ آپ چاہے جیسے بھی ہوں، اپنے میں قوت پیدا کیجئے کہ آپ کو کوشش کرنی ہے۔ عربی کے مقولہ کا ترجمہ ہے جو شخص دروازہ

کھٹکھٹاتا ہے اور کوشش بھی کرتا ہے وہ داخل ہو ہی جاتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور تمثیل بیان کرتے ہیں کہ شام کا وقت تھا اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ ڈوبتا ہوا سورج پوچھ رہا تھا کہ ہے کوئی جو میری جگہ لے۔ ساحل پر کسی مکان میں ایک دیا ٹمٹمار ہا تھا اس نے سورج کو جواب دیا۔ ہاں میں کوشش کروں گا۔ زندگی کی اندھیری راتوں میں ماچس کی تیلی بھی روشنی پیدا کر دیتی ہے شرط یہ ہے کہ وہ رگڑ کھائے۔ بس اسی طرح انسان محنت کرے، کوشش کرے۔زندگی میں چمکنے کے لئے کوشش اور محنت کی ضرورت ہے۔ ایک بس کے پیچھے لکھا ہوا تھا "محنت تیری جاگیر ہے" اور یقیناً اسی محنت کو استعمال کر کے ہم پھل حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی کٹ

ہر مقابلے کے اپنے قواعد و ضوابط ہوتے ہیں اور ہر مقابلے کے لئے ایک کٹ ہوتی ہے زندگی کے اس مقابلے کے لئے بھی کٹ کی ضرورت ہے اور اس میں مندرجہ ذیل اجزاء شامل ہیں۔

۱.......... اپنی زندگی کا مقصد سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ آپ کس لئے پیدا کئے گئے ہیں اور آپ کو اس زندگی میں بعد والی زندگی کے لئے کیا کچھ کام انجام دینے ہیں۔

۲.......... اپنی زندگی کے معاملات کا جائزہ لیجئے۔ اپنی خوبیوں کو تحریر کیجئے، اپنی خامیوں کی فہرست بنائیے اور خوبیوں کو بڑھانے اور خامیوں کو گھٹانے کی منصوبہ بندی کیجئے۔

۳.......... اپنی زندگی میں مقصد حیات سے مطابقت رکھتے ہوئے ہدف بنائیے کہ آپ کو کیا کچھ بننا ہے۔ اس ہدف کے مطابق کیرئیر پلاننگ کیجئے اور اسی کے مطابق منصوبہ بندی کیجئے۔

۴.......... اپنی یومیہ شیڈولنگ کیجئے۔ صبح سویرے منصوبہ بندی کیجئے۔ اس منصوبہ بندی میں عقل اور سمجھ کے مطابق ترتیب بنائیے، اور اس کے مطابق مستعدی کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کیجئے۔ رات کے وقت جائزہ لیجئے۔

۵.......... اپنی شخصیت کی تعمیر کیجئے۔ مطالعہ، عمل اور اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔

۶.......... غوروفکر، شجاعت، بردباری، مثبت اندازِ فکر اور ہم آہنگی کی صلاحیت پیدا کیجئے۔

۷.......... معاملات کو نبھانے کی کوشش کیجئے۔ انہیں بکھیرنے اور بگاڑنے کی کوشش مت کیجئے۔

۸........... اپنی شخصیت کا تصور بنائیے اور یہ تصور حقیقت پسند اور قابل حصول ہو۔ اس کے مطابق کام کرنے کی کوشش کیجئے۔

۹........... اپنے ہر لمحے کی قدر کیجئے اور اسے بہتر سے بہتر طریقہ پر استعمال کرنے کی کوشش کیجئے۔

۱۰........... جن مصروفیات سے آپ کو زندگی کے اصراف پورے کرنے میں فائدہ نہیں ہو گا ان مصروفیات کو ترک کر دیجئے۔

۱۱........... اخبارات، ریڈیو، ٹی وی، دوستوں، تعلقات اور زندگی کے دیگر معاملات میں جو جو آپ کا مقصد اور نصب العین میں مدد دے سکتے ہیں ان میں توازن کے ساتھ وقت دیجئے باقی کے بارے میں بچنے کی کوشش کیجئے۔

۱۲........... اپنی شخصیت اور معاملات میں توازن پیدا کیجئے۔ کھیل کود میں اتنے بھی نہ لگیئے کہ پڑھائی ضائع ہو جائے۔ پڑھائی میں اتنے بھی مت کھو جائیے کہ آپ کو زندگی کے بارے میں پتہ ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔

۱۳........... اچھے دوستوں، اچھے رسالوں اور اچھے لوگوں سے رابطہ رکھیئے۔

۱۴........... اپنے گمان اور سوچ کو مثبت رکھیئے۔ پر امید رہیئے۔ زندگی سے مایوس مت ہوئیے۔

۱۵........... چہرے پر اعتماد اور مسکراہٹ کو طاری رکھیئے۔

۱۶........... جیب میں چھوٹی سی نوٹ بک یا چھوٹے سے کارڈ رکھیئے اور اس میں اپنی ذات کے معللات کے اشارات جب بھی یاد آئیں نوٹ کرتے رہیئے۔

۱۷........... آئندہ سال کی منصوبہ بندی کیجئے۔ ایک نوٹ بک لیجئے۔ اس میں تحریر کیجئے کہ آپ میں کون کون سی صلاحیتیں ہیں۔ کون کون سی خوبیاں ہیں اور کون کون سی خامیاں ہیں۔ پھر خوبیوں کو بڑھانے اور خامیوں کو مٹانے کی کوشش کیجئے تحریری منصوبہ بندی کیجئے۔ ہم ڈرائی کلینگ پر کپڑے دے کر رسید لیتے ہیں مگر زندگی کے معاملے میں کوئی کاغذی کارروائی نہیں کرتے۔

۱۸........... مستقبل کو پیش نظر رکھیئے اور اس کی ضروریات کا جائزہ لیجئے۔ اور ان ضروریات کے حصول کے لئے اہل دوست اور رشتہ داروں سے مشورہ کیجئے۔

۱۹........... اپنی گفتگو، تقریر، تحریر، اور انتظامی صلاحیت کو بڑھانے کی کوشش کیجئے۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اگر یہ صلاحیتیں موجود نہ ہوں تو انسان کو آئندہ زندگی میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر

کے پیکیجز کا علم اور انگریزی بولنے اور لکھنے کا فن بھی ہونا چاہئے۔

۲۰............ اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے لئے انسانی تعلقات کا علم اور فن آنا ضروری ہے۔ انسانی تعلقات کیسے پیدا کئے جائیں۔ لوگوں کو کیسے منظّم اور مربوط کیا جائے، لوگوں کی ٹیم کیسے بنائی جائے، کام کیسے تفویض کئے جائیں، صلاحیتوں کا علم کیسے حاصل کیا جائے، یہ ایک فن ہے اور اس میں کامیابی آپ کو عروج تک پہنچا دے گی۔

آگے بڑھیئے

اب آپ کی کٹ تیار ہے۔ آجایئے مقابلے کے لئے۔ مستقبل آپ کو تلاش کر رہا ہے آپ محنت کیجئے۔ آپ کا پسینہ شانِ کریمی سے موتی بن جائے گا۔ اٹھیئے ہمت باندھیئے زندگی کے راستے آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں منزل بھی دور نہیں۔ جرأت کیجئے۔

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

دیکھئے کامیابی آپ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے اٹھیئے اور دروازہ کھول لیجئے۔

ڈر

ایک پانچ سال کا چھوٹا بچہ اپنی ننھیال میں رہتا تھا۔ ایک روز وہ گم ہو گیا۔ ہر جگہ اس کو ڈھونڈا گیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ نانی اماں کو بہت فکر ہوئی۔ جب بہت تلاش کیا گیا تو وہ ایک گہرے اور بہت تیز بہنے والے دریا کے کنارے بڑی بے فکری سے کھڑا ہوا ملا۔ جب وہ گھر واپس لایا گیا تو نانی نے اسے ڈانٹا اور کہا،

"تم بغیر بتائے گھر سے کیوں نکلے۔ اور اتنی دور اور خطرناک دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ کیا تمہیں ڈر نہیں لگا تھا؟" بچے نے معصومیت سے نانی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا،

"ڈر!............ نانی اماں میں نے تو ڈر کو کبھی نہیں دیکھا۔" پھر ضد کرتے ہوئے بولا،

"اچھی نانی اماں! بتاؤ ڈر کی صورت کیسی ہوتی ہے؟"

یہی بچہ بڑا ہو کر انگلستان کی بحری فوج کا سپہ سالار بنا اس کا نام ہوریشیو نیلسن تھا۔

ننّھا لارڈ میئر

مرسلہ: غلام عباس طاہر

ایک یورپین لڑکے کا نام ویٹنگٹن تھا اور وہ اسکاٹ لینڈ کے یتیم خانہ میں پرورش پاتا تھا۔ بچوں کی طرح وہ بھی بے حد شریر تھا ایک دن یتیم خانہ سے بھاگ نکلا اور بھیک مانگتا ہوا لندن آپہنچا اور لارڈ میئر (جو شہر کا حاکم تھا) کے باغ میں پھرنے لگا یہ غریب لڑکا باغ میں ٹہل رہا تھا کہ ایک بلی کو دیکھا اور اس کے کھیلنے لگا۔ اتنے میں گرجا کا گھنٹہ بجا تو لڑکے نے بلی سے پوچھا کہ یہ بتاؤ............ یہ پاگل گھنٹہ کیا کہتا ہے، بلی بے چاری کیا جواب دیتی، لڑکے نے آپ ہی جواب دیا کہ یہ کہتا ہے ٹن............ ٹن............ ٹن، ویٹنگٹن، ویٹنگٹن لارڈ میئر آف لنڈن۔ خیال کرنے کی بات ہے ایک یتیم بچہ کہاں تک پہنچ رہا ہے۔ اتنے میں لارڈ میئر آف لندن بھی ہوا خوری کرتے ہوئے باغ میں آنکلے اور لڑکے سے پوچھا تم کون ہو۔

اس نے بے باکی سے جواب دیا، لارڈ میئر آف لندن، لڑکے کی اس بات پر غصہ آنے کی بجائے لارڈ میئر کے دل میں یہ بات کھب گئی اور لڑکے سے پوچھا تم اسکول میں پڑھنا چاہتے ہو! لڑکے نے جواب دیا، ہاں اگر استاد نہ مارے، پھر وہ لڑکا اسکول پڑھنے لگا اور ترقی کرتے کرتے ایک باعزت گریجویٹ بن گیا۔ اسی دوران لارڈ میئر فوت ہو گیا چوں کہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اس نے اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ اس لڑکے کے نام لکھ دیا۔ اس نوجوان نے اپنی طاقت اور اس روپیہ کی مدد سے جو اسے ملا تھا اس قدر ترقی حاصل کی کہ ایک دن خود لارڈ میئر آف لندن بن گیا۔ اس لڑکے کا نام آپ لندن کے لارڈ میئروں کی فہرست میں دیکھ سکتے ہیں۔

بلند ہمتی ہے راز کامیابی کا

اسی طرح چین کے ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ وہ بے حد غریب تھا رات کو پڑھنے کے لئے اسے چراغ جلانے کے لئے دام بھی میسر نہ تھے۔ مگر وہ جگنوؤں کو جمع کر کے ململ کے باریک کپڑے میں باندھ لیا کرتا تھا اور ان کی روشنی کتاب پر ڈال کر راتوں کو محنت کرتا تھا۔ ایک دن اس سے کسی نے کہا کہ اتنی محنت کیوں کرتے ہو؟ تم چین کے وزیر تو بننے سے رہے۔ اس نے کہا اگر میرا ارادہ پورا ہوا تو وزیر بننا کیا بڑی بات ہے۔ چین کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہی لڑکا ایک دن چین کا وزیر بن گیا۔

خلیفہ مامون الرشید، جس کی سلطنت دریائے سندھ سے لے کر ہسپانیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے دو بیٹے ایک مشہور عالم سے تعلیم حاصل کرتے تھے ایک بار وہ پڑھانے کے بعد مسند سے اٹھے تو دونوں شہزادے ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لئے دوڑے۔ مگر وہاں پہنچ کر دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا ہر ایک استاد کی جوتیاں سیدھی کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں شہزادے ایک ایک جوتی سیدھی کریں۔ بادشاہ کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے استاد صاحب کو بلایا اور پوچھا کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ معزز شخص کون ہے۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین سے زیادہ معزز کون ہو گا۔ مامون الرشید نے کہا" اور اس شخص کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ جس کی جوتیاں اٹھانے کے لئے امیر المومنین کے لخت جگر میں آپس میں جھگڑا ہو؟" پھر لڑکوں کی سعادت مندی اور استاد کو اچھی تعلیم دینے کے صلے میں دس ہزار روپے انعام دیئے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا آج ہم بھی اپنے استادوں کی ایسی عزت کرتے ہیں۔

نتیجہ

کلیم چغتائی

"راشد بیٹا، دو روز بعد آپ کا ششماہی امتحان شروع ہونے والا ہے اور آپ نے پڑھائی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔" امی نے راشد کو دیکھتے ہی کہا جو باہر گلی میں دو گھنٹے تک کرکٹ کھیلنے کے بعد ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا۔

"اوں! امی کر لوں گا۔" راشد نے بے نیازی سے جواب دیا اور وضو کرنے کے لئے بیسن کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ راشد میں ایک بہت اچھی عادت یہ تھی کہ وہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا تھا۔ راشد نماز پڑھ کر لوٹا تو حسب عادت اس نے ٹی وی کا بٹن دبا دیا۔ اتفاق سے اس وقت بہت اچھی کارٹون فلم آ رہی تھی۔ راشد نے روز کی طرح ٹوپی ایک طرف اچھالی اور ٹی وی کی آواز بلند کر کے اس کے سامنے ڈٹ گیا۔ راشد کی امی نماز پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے سلام پھیرنے کے بعد راشد کو ڈانٹا۔ "دیکھتے نہیں میں نماز پڑھ رہی ہوں۔ اور سنو۔ امتحان کی تیاری کون کرے گا؟" "امی میں کر لوں گا، بس آپ دیکھئے گا میں فرسٹ آؤں گا۔" راشد نے یہ کہہ کر برا سا منہ بنایا اور ٹی وی کی آواز دھیمی کر دی۔ تھوڑی دیر بعد امی نے کھانا لگا دیا۔ راشد نے کھانا کھایا ابو ابھی گھر نہیں لوٹے تھے۔ راشد نے بچوں کا ایک رسالہ اٹھا لیا۔ امی نے ٹوکا۔ "بیٹا، امتحان کی تیاری کر لو۔" ابھی کرتا ہوں امی، ذرا یہ کہانی ختم کر لوں۔" اور کہانی ختم بھی ہو گئی۔ پھر راشد نے لطیفوں کا صفحہ "ڈنڈا ڈولی" پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک زور دار لطیفے پر وہ

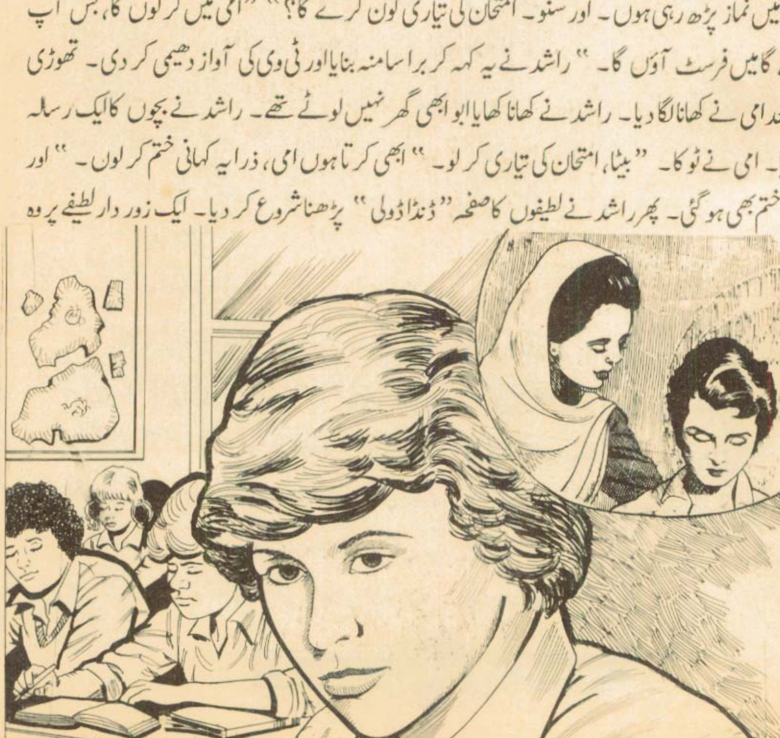

کھلکھلا کر ہنسا تو دوسرے کمرے میں کپڑے تہ کرتی ہوئی امی چونک کر اس کمرے میں آگئیں۔

"خوب! تو یہ تیاری ہو رہی ہے امتحان کی۔"

"امی۔ بس ابھی کرتا ہوں، ذرا عشا کی نماز پڑھ آؤں۔" یہ کہہ کر راشد نے رسالہ ایک طرف پھینکا اور وضو کرنے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔

نماز سے واپس آنے کے بعد راشد نے ٹوپی اتار کر ایک طرف ڈال دی اور سونے کے لئے بستر پر لیٹ گیا۔ امی نے کہا "بیٹا پڑھائی کب ہوگی؟ کچھ ہوش بھی ہے؟ آپ چھٹی جماعت میں پہنچ گئے ہیں ابھی محنت کر لو گے تو سالانہ امتحان میں بھی اچھے نمبر لا سکو گے۔"

"امی اب سونے دیجئے۔ کل پڑھ لوں گا۔ آج بہت نیند آ رہی ہے۔" راشد نے یہ کہہ کر آنکھیں موند لیں۔ اگلا دن بھی یوں ہی گزر گیا۔ پھر امتحان بھی شروع ہو گئے۔ راشد صاحب مشکل سے ایک آدھ گھنٹہ پڑھ لیا کرتے تھے اور جب بھی امی ان سے کہتیں کہ پڑھائی کر لو تو وہ بے نیازی سے جواب دیتے۔ "امی دیکھ لیجئے گا میں فرسٹ آؤں گا۔" اور امی بڑی حیرانی سے انھیں دیکھتی رہ جاتیں۔ امتحان ختم ہو گئے۔ دس دن بعد امتحان کا نتیجہ سنایا جانے والا تھا۔ راشد خوش خوش اسکول جانے کے لئے تیار ہوا۔ "امی!" اس نے امی کو مخاطب کیا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا نا کہ میں فرسٹ آؤں گا تو آپ مجھے کمانڈو سوٹ دلوائیں گی۔" راشد نے دو ماہ قبل بازار میں کمانڈو طرز کی وردی دیکھی تھی جو راشد کے سائز کی تھی۔ اس دن سے راشد صاب اٹھتے بیٹھتے کمانڈو سوٹ کے گن گاتے رہتے تھے۔

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے، مگر تم پہلے فرسٹ تو آکر دکھاؤ۔" امی نے کہا۔

"خدا حافظ امی۔"

"خدا حافظ بیٹا!"

دوپہر ایک بجے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ امی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ راشد نے روز کی طرح امی کو سلام بھی نہیں کیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے کچھ کہے بغیر اپنا بستہ ایک طرف پھینکا اور منہ چھپا کر بستر پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ "کیا ہوا بیٹا؟" امی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کسی سے لڑائی ہوئی؟ کس نے مارا؟" راشد نے کوئی جواب نہ دیا۔ امی نے راشد کا بستہ کھولا تو اس میں ششماہی امتحان کا رزلٹ کارڈ رکھا ہوا تھا۔ راشد کے بہت خراب نمبر آئے تھے۔ دو پرچوں میں تو سرخ روشنائی سے فیل لکھا ہوا تھا، ایک پرچے میں اسے رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیا گیا تھا اور

باقی مضامین میں بھی یوں ہی سے نمبر تھے۔

"تو یہ ہے فرسٹ آنے والے کا نتیجہ۔ !" امی نے غصہ سے کہا۔ "تم سے میں کہتے کہتے تھک گئی کہ بابا محنت کر لو، محنت کر لو۔ لیکن تم کبھی سنتے ہو؟"

"میں اب نماز نہیں پڑھوں گا۔" ۔ راشد نے اچانک سر اٹھا کر روتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" امی حیران رہ گئیں۔ "مگر کیوں؟"

"اللہ میاں جب میری بات نہیں سنتے تو میں بھی کیوں نماز پڑھوں؟"

"مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ میاں آپ کی بات نہیں سنتے۔ ؟"

"میں نے ہر نماز کے بعد دعا مانگی تھی کہ اللہ میاں میں اس امتحان میں فرسٹ آجاؤں مگر اللہ میاں نے مجھے فیل کروا دیا۔" راشد نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"اف۔ فوہ۔ تو یہ بات تھی۔" امی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "جب ہی تو میں کہوں کہ صاحب زادے کا دل پڑھنے میں کیوں نہیں لگ رہا۔ ارے بیٹا، تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے صرف دعا مانگنے سے تم فرسٹ آجاؤ گے۔

"تو پھر۔ آپ نے نہیں کہا تھا کہ اللہ میاں دعا قبول کرتے ہیں، مسجد میں امام صاحب بھی یہی کہتے ہیں۔"

"بالکل صحیح کہتے ہیں۔ مگر بیٹا اس سے یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ آدمی محنت ہی نہ کرے اور صرف دعا مانگ کر امید لگالے کہ اس کے سارے کام خود بخود ہو جائیں گے۔"

"سارے کاموں کی بات کون کر رہا ہے، میں نے تو صرف ایک کام کے لئے دعا کی تھی۔"

"وہی بات ہے بیٹا۔ اگر ہر آدمی اپنے اپنے ایک کام کے لئے صرف دعا کرنے لگے اور کوشش کرنا چھوڑ دے تو کیا وہ کام ہو سکے گا؟ اگر آپ بیٹھ کر صرف دعا کرتے رہیں کہ بریانی پک جائے اور آپ کے منہ میں پہنچ جائے تو کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا نا۔ بس یہی بات ہے۔"

"مگر امی، اللہ میاں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔"

"بے شک، اللہ میاں سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن ان کا فیصلہ یہی ہے کہ انسان دنیا میں رہ کر کوشش کرے۔ جو کوشش کرے گا اور اپنے رب پر بھروسا کرے گا، اپنے رب سے مانگے گا، اسے اپنی کوشش کا بدلہ ملے گا۔"

"مگر امی، میں تو زم زم کا پانی جو تایا حج سے واپسی پر لائے تھے نا، پی کر کہا تھا۔"

"یہ بھی دل کو بہلانے والی بات ہے، زم زم کا پانی بے شک بہت برکت والا پانی ہے اور فائدہ پہنچاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آدمی زم زم کا پانی پی کر بیٹھ جائے اور اس کے سارے کام خود بخود ہوتے چلے جائیں۔ اس طرح تو کوئی بھی آدمی کام نہیں کرے گا۔ نہ دکانیں کھلیں گی، نہ کارخانے چلیں گے نہ دفتروں میں کام ہو گا۔ آپ ہی سوچئے اگر آپ کی کلاس کا ہر بچہ زم زم کا پانی پی کر صرف یہی دعا مانگتا رہے کہ وہ اس سال فرسٹ آجائے۔ اور محنت بالکل نہ کرے تو کیا ہر بچہ فرسٹ آجائے گا؟"

"نہیں خیر ایسا تو نہیں ہو سکتا۔" راشد نے اتفاق کیا۔

"بس بیٹے یہی بات ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے کہ وہ ان ہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو نیک نیتی کے ساتھ کوشش کرتے ہیں۔ دعا مانگنا بہت ضروری ہے، کیونکہ اس سے کام میں برکت ہوتی ہے، اللہ کی مدد اس میں شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں، اپنے مال و دولت یا اپنی طاقت پر بھروسا نہیں کرتا بلکہ یہ سب کچھ جس ذات نے دیا ہے، اسی پر بھروسا کرتا ہے۔ سن رہے ہونا بیٹے۔

"جی امی۔"

"آپ محنت کیجئے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ سے دعا مانگئے کہ وہ آپ کی صلاحیتوں میں اضافہ کرے، آپ کو علم عطا فرمائے اور آپ کو کامیاب کرے، پھر دیکھئے آپ کی محنت کا کتنا فائدہ ہوتا ہے۔"

"جی۔"

"اور بیٹے ایک بات اور ہے۔"

"وہ کیا امی۔؟"

"وہ یہ ہے بیٹے کہ اللہ میاں اپنے بندوں کی دعائیں تین طرح قبول کرتے ہیں۔"

"تین طرح؟"

"ہاں بیٹے، تین طرح...... ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ نے دعا مانگی کہ اللہ میاں مجھے ایک سو روپے مل جائیں اور آپ کو کسی طریقے سے لیک سو روپے مل گئے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ کو ایک سو روپے تو نہیں ملے، مگر آپ کی دعا کے بدلے اللہ نے آپ کو کسی مصیبت سے بچا لیا۔"

"وہ کیسے امی؟"

"بیٹا۔ دنیا میں ہزاروں مصیبتیں ہیں۔ کوئی حادثہ ہو جاتا ہے، کوئی بیماری لگ جاتی ہے، کبھی کوئی زہریلا کیڑا کاٹ لیتا ہے، کبھی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ تو کبھی اللہ تعالیٰ، بندے کی دعا اس طرح قبول کرتا ہے کہ اسے اس مصیبت سے بچالیتا ہے جو اس پر آنے والی ہوتی ہے۔"

"اور تیسری صورت امی۔؟"

"ہاں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ آپ کی دعا کے بدلے اللہ میاں آپ کے حساب میں نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔ وہ نیکیاں قیامت تک کے لئے محفوظ کر دی جاتی ہیں۔ جب قیامت آئے گی اور ہر انسان کی نیکیوں اور گناہوں کا حساب ہو گا کہ کس نے دنیا میں کتنے گناہ کئے اور کتنے اچھے کام کئے تو اس کے اچھے کاموں میں ان نیکیوں کو بھی شامل کر لیا جائے گا اور اس وقت مسلمان یہ کہہ اٹھیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کوئی دعا قبول نہ ہوئی ہوتی۔

"وہ کیوں امی؟"

"وہ اس لئے بیٹے کہ قیامت کا دن بڑا سخت ہو گا۔ اس دن صرف وہی انسان دوزخ کی آگ سے بچ سکے گا جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی۔ اس لئے اس دن نیکیوں کی بڑی اہمیت ہوگی، یوں سمجھو کہ جیسے آج کل روپے پیسے کی اہمیت ہے کہ یہ چیز خریدنے کے لئے پیسوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے، اسی طرح قیامت کے دن جنت میں جانے کے لئے نیکیوں کا انتظام پہلے سے کر کے رکھنا ہو گا۔ تو بیٹا، انسان کی جو دعائیں دنیا میں قبول نہیں ہوں گی وہ قیامت کے روز نیکیاں بن کر اس کے کام آئیں گے، اسی لئے دعا ہمیشہ کرتے رہنا چاہئے۔"

"امی میں سمجھ گیا۔ اب میں دل لگا کر پڑھوں گا اور دعا بھی کروں گا اور شکایت بھی نہیں کروں گا کہ اللہ میاں نے میری دعا قبول کیوں نہیں کی۔"

"شاباش۔" امی نے جھک کر راشد کو پیار کیا اور اس کے لئے کھانا نکالنے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

تین ماہ بعد راشد کے سالانہ امتحانات ختم ہوئے۔ امتحانات کے پندرہ دن بعد راشد صاحب اچھلتے کودتے اسکول سے لوٹے امی بیٹھی سلائی کر رہی تھیں، راشد نے سبز رنگ کا رزلٹ کارڈ امی کی گود میں ڈال دیا اور امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر جوش سے بولا۔

"امی۔ میں فرسٹ آیا ہوں۔ ابو سے کہہ کر کمانڈو سوٹ ضرور منگوا لیجئے گا۔!!"

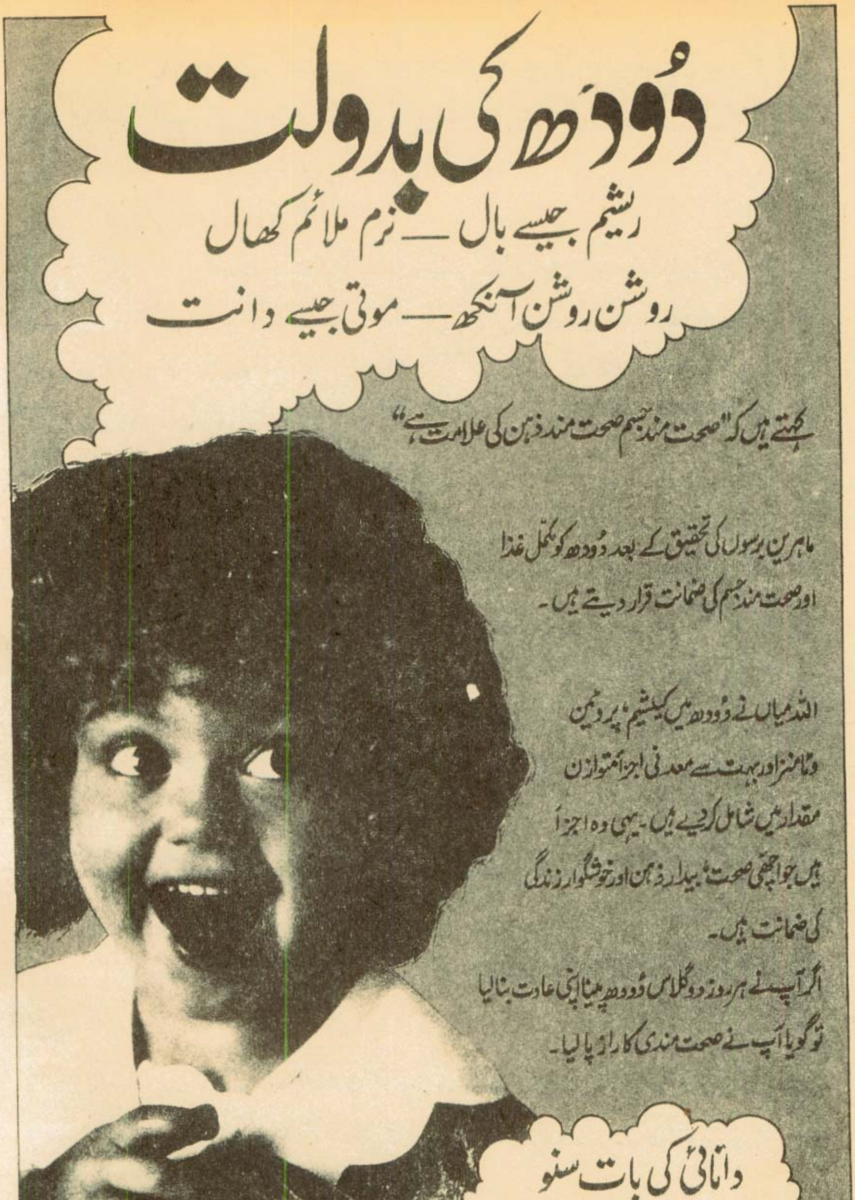

دُودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔
اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔
دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

MASS

باکمال بچے بے مثال بچے

ساجد سعید

اس دفعہ جب ہم نے یہ اعلان سنا کہ نئے سال کی ابتداء پر آنکھ مچولی بچوں کو بچوں ہی کے موضوع پر خاص نمبر پیش کر رہا ہے تو ہم کچھ پریشان سے ہوگئے کہ اس دفعہ ہم اپنے پیارے ساتھیوں کے لئے اس خاص نمبر میں کیا لکھیں۔ اسی سوچ میں دو دن گزر گئے۔ انہی دنوں ہمارا بازار جانا ہوا اچانک ہماری نظر ایک اسکول کے بچے پر پڑی جو صاف ستھرا یونیفارم پہنے لنگڑاتے ہوئے اسکول جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ عزم و حوصلے سے روشن تھا۔ اور اس کی نگاہ اسکول جانے والے راستے پر جمی ہوئی تھی۔ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ میں نے سوچا کیوں نہ ایسے بچوں سے بات کی جائے معذور ہونے کے باوجود بڑی بہادری سے زندگی کے مسائل کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جو تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ، عام مشاغل میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ جن کی ہمت بلند ہے اور جن کے مستقبل میں امیدیں اور خوشیاں ہیں۔

بدقسمتی سے، ہمارے ہاں بعض گھروں میں ایسے بچوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی جو کسی جسمانی اور ذہنی معذوری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یا تو ان کو گھر کے ایک کونے میں ڈال دیا جاتا ہے یا معذوروں کے

اسکول میں داخل کرا کے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کی ذمہ داری پوری ہو گئی حالانکہ ایسے بچے تو زیادہ توجہ اور محبت کے مستحق ہوتے ہیں تاکہ ان کو اپنی معذوری کا احساس زیادہ نہ ہو اور وہ نارمل بچوں کی طرح زندگی گزار سکیں۔ ہم نے ایسے بچوں سے ملاقات کا ارادہ کر لیا جو سے مستقبل میں بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمارا جانا پرانی نمائش میں واقع ایڈا اسکول میں ہوا جو ٦٧ سال سے نابینا، گونگے اور بہرے بچوں اور مفلس و محتاج افراد کی خدمات بلا معاوضہ انجام دے رہا ہے۔ دو دن تک تو ہم اس اسکول میں محض معلومات کے لئے چکر کاٹتے رہے اور آخر کار ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہوئی اور اسکول کے سینئر استاد جناب شفیع صاحب کے تعاون سے ہماری پہلی ملاقات ایک نابینا بچے سے ہوئی جس نے پر اعتماد لہجے میں ہمیں اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

یہ دنیا اب بھی روشن ہے

"میرا نام شاہد صدیق ہے اور میری عمر اس وقت سولہ سال ہے میں یہاں (ایڈا اسکول) میں نویں جماعت کا طالب علم ہوں جبکہ ناظم آباد میں میری رہائش ہے۔ ۱۹۸۴ء میں میرے والد صاحب کا انتقال کینسر کی وجہ سے ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ہمیں وقتی طور پر بڑی پریشانی اٹھانی پڑی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ بعد میں ہمارے اپنوں نے حالات سنبھال لئے۔

یہ تقریباً ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ میں بھاگتے ہوئے گر گیا تھا جس کی وجہ سے میری دائیں طرف والی

ساجد سعید اور شاہد صدیق ۔ سوالاً جواباً ۔

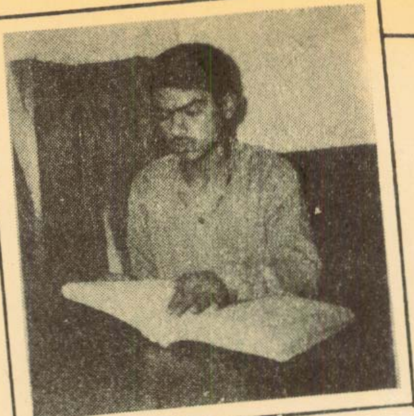

جب اُنگلیاں آنکھیں بن گئیں۔
شاہد صدیق، بریل سسٹم کے تحت انگلیوں کی مدد سے ابھرے ہوئے حروف پڑھ رہے ہیں۔

آنکھ ضائع ہو گئی اس کے کچھ عرصے بعد میری بائیں آنکھ بھی اپنی بینائی کھوتی رہی اور اس طرح میں اپنی دونوں آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گیا۔ لیکن میں اس کو اللہ کی طرف سے امتحان سمجھ کر صبر کر لیتا ہوں اور دیگر مشاغل میں بڑے شوق سے حصہ لیتا ہوں میں ریڈیو میں معلوماتی پروگرام بڑے توجہ سے سنتا ہوں اور انگلش کتابیں پڑھنا (بریل نظام کے تحت) بھی میرے مشاغل میں شامل ہیں۔ کبھی کبھی کرکٹ بھی کھیل لیتا ہوں کھیلنے میں کوئی خاص دشواری تو نہیں ہوتی کیونکہ یہاں ہمیں تربیت اس انداز ے سے دی جاتی ہے کہ جیسے ہم نارمل بچے ہوں۔ میرے محلے وغیرہ کے دوست میری معذوری کی وجہ سے مجھ کو گھومنے پھرنے کی حد تک اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد امی ، میری چار بہنیں اور اساتذہ ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اساتذہ ہماری ہر طرح سے رہنمائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہمارے پاس کتابیں نہیں ہوتیں تو وہ ہمیں لاکر دیتے ہیں۔ اسکول کا کام نہ کرنے پر یا کوئی غلطی سرزد ہونے پر ہمیں مارا بھی جاتا ہے، کبھی مرغا بنا دیا جاتا ہے اور کبھی معاف کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے سینئر شفیع سر انسانی نفسیات سے بہت اچھی طرح واقف ہیں اور اسی وجہ سے ان کا رویہ ہمارے ساتھ بہت اچھا ہے۔

معذور ہونے کی وجہ سے ہمیں دوسرے بچوں سے کچھ زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات جب ہم کسی دوسرے معذور ساتھی کے بارے میں سنتے ہیں تو دل میں خیال آتا ہے کہ اللہ کے معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا کبھی کبھار کسی خاص موقع پر ہمیں اپنی معذوری کا احساس ہوتا ہے جیسے کھیل پوری طرح کھیلا نہیں جا رہا تو یہ پریشانی ہمیں افسردہ سی کر دیتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تمہاری یہ

معذوری اللہ کی طرف سے سزا ہے تو ایسی کوئی بات نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تو اپنے بندوں سے مختلف طریقوں سے امتحان لیتا ہے۔

میری والدہ نے ہمیشہ مجھے آگے بڑھنے میں حوصلہ دیا ہے جب میں بارہ سال کا تھا تو میری والدہ مجھے اس اسکول میں لائیں تھیں اس سے پہلے میں گھر میں ہی کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا تھا۔

اپنی خواہش کے مطابق میں بڑے ہو کر بیرسٹر بننا چاہتا ہوں ضروری نہیں کہ میرے مقصد میں میری آنکھیں رکاوٹ بنیں کیونکہ لوئی چرچل اور ہیلن کیلر وغیرہ نے معذور ہونے کے باوجود معذور لوگوں کے لئے بہت سے کام کئے۔ اور یہ کام ہم معذور لوگ بھی کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں ہم بہتر تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اسی اسکول میں زیرِ تعلیم سماعت اور بصارت سے محروم ایک بچی سے اسی سلسلے ہماری ملاقات ہوئی۔ بچی کی استانی مس نورجہاں نے اس بات چیت میں ہماری مدد کی۔ بچی نے اشاروں اشاروں میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے:

امینہ [illegible] آنکھیں سنتی اور
انگلیاں [illegible] اپنی [illegible]
نورجہاں کے ساتھ۔

"میرا نام امینہ نور علی ہے اور اس وقت میری عمر سولہ سال ہے۔ میں اس اسکول میں دسویں میں جنرل گروپ کی طالبہ ہوں۔ میری رہائش لسبیلہ میں ہے جہاں والد صاحب کی تھوک کی چاول کی دکان ہے۔ میرے علاوہ میری تین بہنیں بھی میری طرح گونگی ہیں اور یہ معذوری ہمیں پیدائشی ہے۔ میں فٹ بال بڑے شوق سے کھیلتی ہوں۔ جبکہ دوڑ بھی لیتی ہوں۔ محلے اور اسکول میں ہماری بہت سی ایسی دوست ہیں جو مجھے اپنے ساتھ کھیل میں شریک کر لیتی ہیں جس کی وجہ سے مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔

میرا سب سے زیادہ خیال ابو رکھتے ہیں جبکہ اسکول میں مس نورجہاں (امینہ نے مس نورجہاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا) جو کہ مجھے چھوٹی ہی عمر سے پڑھا رہی ہیں انہی کی تربیت کی وجہ سے میں ہر بات با آسانی سمجھ لیتی ہوں۔

آنکھوں سے سن رہی ہوں اشاروں کو دیکھ کر۔

امینہ کی استاد مس نورجہاں نے ہمیں بتاتے ہوئے کہا کہ ہماری بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے بچوں کو زیادہ سے زیادہ پڑھائیں تاکہ یہ مصروف رہ سکیں اور ان کے اندر یہ احساس بھی پیدا نہ ہو کہ یہ دوسرے نارمل بچوں سے کم تر ہیں۔ ہمارے ہاں اکثر گھروں میں والدین کا رویہ غیر ذمہ دارانہ رہا ہے بعض والدین یہ شکایت اسکول لے کر آتے ہیں کہ ہمارا بچہ اسکول سے آتے ہی بستہ پھینک کر آوارہ گردی کو نکل جاتا ہے اور رات دیر سے گھر میں داخل ہوتا ہے حالانکہ اسکول کی حد تک تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایسے بچوں کو ڈسپلن اور نظم و ضبط سکھائیں لیکن دوسری طرف والدین کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اساتذہ پر الزام دھرنے کے بجائے خود اپنی کوتاہیوں پر نگاہ ڈالیں کہ آخر کیوں بچہ گھر اور اسکول سے دور بھاگتا ہے۔ حالانکہ ایسے بچوں سے بھی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ آگے جاکر کوئی نہ کوئی بڑا کام سرانجام دیں۔ چنانچہ والدین کو چاہئے کہ وہ ایسے بچوں کے سرپرست ہونے کے ناطے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں کیونکہ ایسے بچوں کو اپنے بڑوں سے سخت تعاون کی ضرورت ہوتی ہے ان کے ساتھ زیادہ سختی اور ڈانٹ ڈپٹ ان کو بہت زیادہ حساس اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔

امینہ نے ہمیں اشاروں سے بتاتے ہوئے کہا کہ اسکول کے اساتذہ کسی بھی غلطی پر نارمل سزا دیتے ہیں عام نارمل بچوں سے تو ہم مختلف زندگی گزار رہے ہیں لیکن جب ہم ایسے ساتھیوں کو دیکھتے ہیں جو چل نہیں سکتے یا جن کے بازو وغیرہ نہیں ہیں تو ہماری یہی دعا ہوتی کہ "اے اللہ، ان کی تکلیف کو کم کر۔"

مس نورجہاں نے ہمیں بتایا کہ یہاں کا ماحول پرسکون نہیں ہے جب یہ بچیاں چھٹی کے بعد

اسکول سے باہر آتی ہیں تو ان کا بس اسٹاپ پر مختلف طریقوں سے مذاق اڑایا جاتا ہے پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بچیاں جو ہمارے ہاں سے میٹرک کر لیتی ہیں تو اس کے بعد وہ اپنے آپ کو بیکار محسوس کرتی ہیں کیونکہ ان کے لئے آگے کوئی کالج وغیرہ نہیں ہے۔

امینہ نے اپنے آگے کا پروگرام بتاتے ہوئے کہا کہ میرے ذہن میں کوئی واضح تو نہیں ہے کہ میں آگے کیا کروں گی البتہ کمپیوٹر سیکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ یہی حوصلہ اور ارادہ گیارہ سالہ نیلسن کا بھی تھا جو کراچی میں واقع سینٹ پول اسکول میں دوسری جماعت میں زیر تعلیم ہے۔ یہ بچہ دونوں بازوؤں سے محروم ہے اس چھوٹے اور باحوصلہ بچے سے جب ہماری بات ہوئی تو بغیر کسی پریشانی اور جھجک کے اس نے ہمارے سوالوں کے جواب دیئے۔

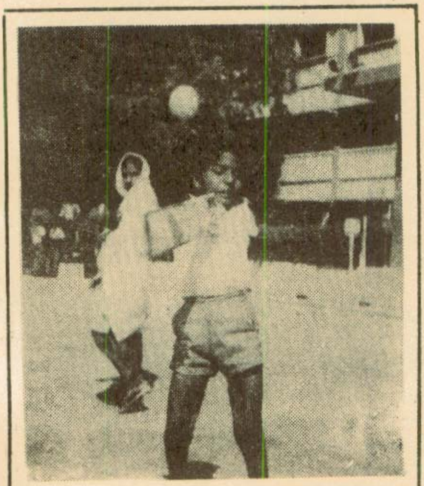

ہاتھ سے محروم ہوں تو کیا ہوا
کھیلتا ہوں عقل کی بنیاد پہ

میں کالا پل میں رہتا ہوں۔ والد صاحب کباڑیئے کا کام کرتے ہیں۔ میرے دو بھائی اور چار بہنیں ہیں میری یہ معذوری پیدائشی ہے۔ دونوں بازوؤں سے معذور ہونے کے باوجود گیارہ سالہ نیلسن نے ہمیں اپنے کٹے ہوئے بازوؤں کے اوپر کے حصے سے کرکٹ کھیل کر حیرت میں ڈال دیا وہ بڑی مہارت سے پاؤں سے بال گراتا اور کٹے ہوئے بازوؤں کے اوپر کے حصے سے کھیلتا ہے۔ ننھے نیلسن نے ہمیں بتاتے ہوئے کہا کہ میری قریبی دوست مجھے اپنے ساتھ کھیل میں شریک کر لیتے ہیں۔ میں لکھتا اور کھاتا بھی پاؤں اور منہ سے ہوں۔ امی، ابو دونوں ہی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں ہر وقت مصروف رہنے کی کوشش کرتا ہوں

نیلسن اپنے شفیق استاد اور مہربان دوستوں کے ساتھ ۔

جس کی وجہ سے میں اپنی معذوری کو بھول جاتا ہوں ۔ اسکول میں ہمارے اساتذہ ہم سے بہت تعاون کرتے ہیں ۔ وہ لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں جو مجھے یہ احساس ہونے نہیں دیتے کہ میں معذور ہوں ۔ میں اسکول کا کام نہ بھی کروں جب بھی مجھے معاف کر دیا جاتا ہے حالانکہ میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ میں ہر کام وقت پر کر کے دوں ۔

میں نہ صرف آرام سے پڑھ لیتا ہوں بلکہ لکھ بھی اچھا لیتا ہوں ۔ اپنے جیسے کسی معذور ساتھی کو دیکھ کر برا لگتا ہے ۔ ایک دفعہ جناح اسپتال کے ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تم ذرا بڑے ہو جاؤ گے تو ہم تمہیں نقلی بازو لگوا دیں گے ۔ میرے امی، ابو میرا بڑا خیال رکھتے ہیں اور میری ہر خوشی میں شریک ہوتے ہیں ۔

میں بڑے ہو کر نیوی آفیسر بننا چاہتا ہوں اور اسی وجہ سے میں اپنا زیادہ تر وقت پڑھائی میں دیتا ہوں
ننھے نیلسن کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے ایک حوصلہ اور اعتماد تھا جو اس کی باتوں میں جھلک رہا تھا ۔

اسی انٹرویو کے سلسلے میں ہماری آخری ملاقات ایسے بچے سے ہوئی جو ایک ٹانگ سے معذور تھا ۔ ہماری اس بچے سے ملاقات اچانک ہوئی جب وہ ٹیوشن پڑھنے کے لئے اسکول کی چھٹی کے بعد جیکب لائن کی طرف جا رہا تھا ۔ سلام دعا کے بعد اس نے ہمیں اپنے بارے میں بتایا ۔

منیر احمد جس نے ٹانگ کی معذوری کو
بھی مجبوری نہ بننے دیا۔

"میرا نام منیر احمد ہے اور میری عمر اس وقت تیرہ سال ہے۔ میں میری کلاکو اسکول میں آٹھویں جماعت کا طالبعلم ہوں۔ لیاقت آباد میں میری رہائش ہے اور یہاں میں روزانہ اسکول کی چھٹی کے بعد ٹیوشن پڑھنے کے لئے آتا ہوں۔ والد صاحب صدر میں گھڑیوں کی ایک دکان میں نوکری کرتے ہیں۔ جب میں چھ مہینے کا تھا تو اس وقت مجھے ٹائیفائڈ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میں ایک ٹانگ سے معذور ہو گیا۔ میرے چار بھائی اور دو بہنیں ہیں اور میں ان میں سب سے بڑا ہوں۔ اخبار و رسائل اور کہانیاں وغیرہ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ کرکٹ بھی کھیل لیتا ہوں۔ جب کرکٹ میں رن لیتا ہوں تو تب مجھے دشواری سی ہوتی ہے میرے قریبی دوست تو مجھے کھیل میں شریک کر لیتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ میری ٹانگ کی وجہ سے مجھے کھیلنے سے منع کرتے ہیں۔ میرے گھر والے میری ہمیشہ ہر اچھے کام میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر صبر کر لیتا ہوں کہ اللہ نے جو کرنا تھا وہ تو کر لیا اب میں پڑھائی میں دل لگاتا ہوں۔ ہمارے اسکول کے اساتذہ ہمیشہ ہمیں پڑھائی میں دل لگا کر پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جو لوگ میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں وہ لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔

اسکول میں میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اساتذہ کو شکایت کا موقع نہ دوں اگر مجھ سے کوئی غلطی بھی ہو جاتی ہے تو وہ مجھے ڈانٹ وغیرہ دیتے ہیں۔ جب میں کسی اپنے جیسے معذور ساتھی کو دیکھتا ہوں تو میری یہی دعا ہوتی ہے کہ اللہ اس کی معذوری کو دور کر دے اور میری بھی۔

میرے امی ابو میری تعلیم پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ تاکہ میں جو کہ معذوروں کا ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں اور ان کا علاج کرنا چاہتا ہوں کامیاب ہو سکوں۔ ابھی تو میں چھوٹا ہوں اس لئے ابھی میں نے کوئی خاص تیاری نہیں کی ڈاکٹر بننے کے لئے کیونکہ ابھی تو ہم اپنے کورس پڑھ رہے ہیں۔

ان حوصلہ مند اور پر امید بچوں سے بات کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ انسان اگر چاہے تو انتہائی مشکلات میں بھی وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر سکتا ہے۔

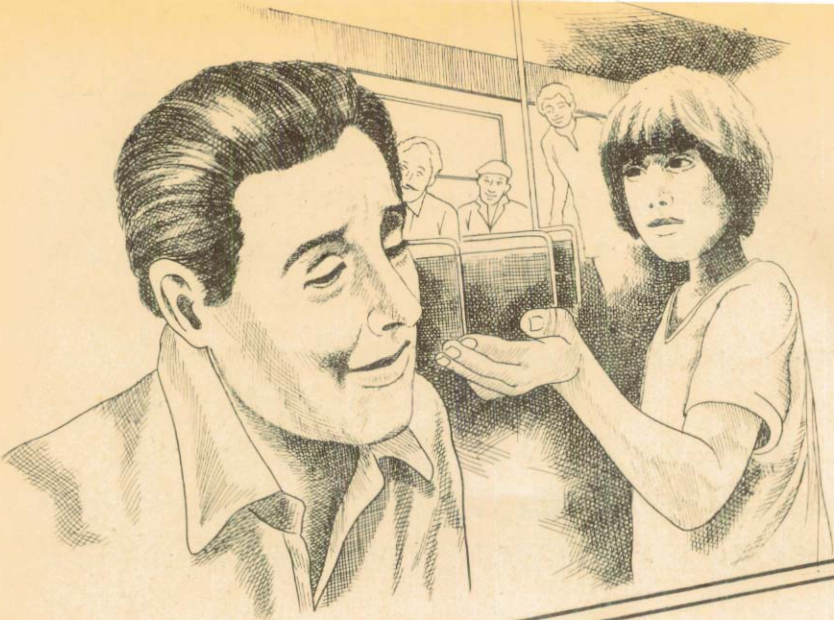

قرض

سیّدعبدالودُود شاہ

اس روز رات بھر اور پھر دن بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ لہٰذا دفتر میں حاضری برائے نام تھی۔ میرے علاوہ چند ہی افراد اوز آئے تھے۔ جو ساتھی آ چکے تھے وہ اپنی اپنی نشست پر سر جھکائے بڑے "خشوع و خضوع" سے اپنا کام کر رہے تھے۔ اور پھر شام ہو گئی ٹھنڈ، بارش، سرد ہوا کے جھونکے، سڑکوں پر سیلاب اور گاڑیاں حسبِ معمول اور حسبِ توقع غائب! میں نے آفس کی بلڈنگ کی سیڑھیاں اتر کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر بس اسٹاپ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ سامنے سے دو برقعہ پوش عورتیں آ گئیں ایک تو لڑکی تھی۔ دوسری اس کی ماں معلوم ہوتی تھی، اس کی گود میں ایک چھوٹا بچہ بھی تھا، انہوں نے برقعے تو پہن رکھے تھے، لیکن چہرے کھلے ہوئے تھے۔ میں ان کے نزدیک سے گزرنے کو تھا کہ دونوں نے بیک

وقت ہاتھ پھیلا کر کچھ دینے کا مطالبہ کر دیا۔

میں چلتے چلتے رک گیا۔ دونوں کی صحت اچھی تھی۔ اور دونوں کوئی کام کر سکتی تھیں۔ ایسے لوگوں کا بھیک مانگنا میرے لئے قطعی ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ میں نے زور سے دونوں کو جھڑک دیا۔ اب لڑکی سامنے آئی اس نے اپنے دانت نکالتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس پر ترس کھانے کے لئے کہا۔

"بھاگ جاؤ...... "! میں نے تقریباً غصّے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ ہٹی کٹی ہو کر بھیک مانتے شرم نہیں آتی۔ دونوں عملاً میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

میں ایک طرف ہو کر نکلنے لگا، نیچے فٹ پاتھ پر پانی ہی پانی تھا۔ اتر کر سڑک سے گزرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ دوسری جانب مجھے خدشہ تھا کہ کہیں تماشاہی نہ بن جائے۔ اتفاق سے دوسری طرف سے چند غیر ملکی آنکلے، جن کو دیکھ کر دونوں نے میری تو جان بخشی کی اور ان پر جھپٹ پڑیں، آگے کیا ہوا اس کا اندازہ آپ کو ہو گا!

جب میں گاڑی پر بیٹھ رہا تھا تو غصے کے مارے اپنے آپ میں نہیں تھا۔ سوزوکی میں بیٹھے ساتھیوں سے سلام دعا بھی نہیں کی اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ گاڑی حرکت میں آئی اور ایک خوشگوار دن اپنی بدمزہ یاد کے ساتھ پیچھے رہ گیا۔ اور کیا آپ کو معلوم ہے بارش کا موسم مجھے سب سے اچھا لگتا ہے۔

.... ○ ....

بس کو اسٹاپ پر کھڑے بہت دیر ہو چکی تھی خدا جانے کیوں چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ انتظار کرتے کرتے بور ہو کر میں نے نشست کے پیچھے سر ٹکالیا۔ میری نشست سب سے آخری قطار میں گیٹ کے ساتھ تھی۔ بس میں لوگ بھی کم تھے۔ شاید ڈرائیور اور کنڈیکٹر صاحبان مزید مسافروں کے انتظار میں موجودہ مسافروں کو بھی "شریک ثواب" کرنا چاہتے تھے۔

ایک ہلکی سی کھڑبڑ سے میری آنکھ کھل گئی۔

نیلی قمیص، سفید شلوار اور شانے پر سیاہ ریشمی بستہ۔ وہ آٹھ دس برس کی بچی اندر آرہی تھی۔ بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اسکول سے چھٹی کے بعد گھر جا رہی ہو۔ لیکن جیسے ہی اس کے پیروں پر نظر پڑی، مجھے زور سے جھٹکا سا لگا۔

اس نے پیروں میں سیاہ چمڑے کے جوتوں یا سفید پی ٹی شوز کے بجائے چپلیں پہن رکھی تھیں، نہ صرف یہ بلکہ چپلیں بھی مختلف رنگ اور ڈیزائن کی تھیں۔

بھلا اسکول جانے والے بچے چپل کپ پہنتے ہیں؟ وہ بھی ایسی تو...... تو؟؟؟ تو پھر؟؟؟

بچی عین میرے سامنے آکر رک گئی۔ میں نے غور سے اس کو دیکھا چہرے میں بچپن کا بھولپن اور معصومیت تھی، چہرے پر ایک خاص قسم کی سنجیدگی۔ رنگ بھی شفاف سفید اور بے داغ رہا ہو گا اب کچھ کچھ میلا میلا سا تھا۔ بال البتہ احتیاط سے سنوارے ہوں گے اس کی امی نے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے کچھ پوچھوں اس نے شانے پر لٹکے ہوئے بیگ کو کھولنا شروع کیا۔ یہ ایک اور حیرت تھی!

پھر اس نے اپنی مٹھی میری طرف بڑھائی۔

اس کی ننھی سی گرفت میں جو کچھ تھا اسے دیکھ کر میرا دماغ چکرا گیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں تین چار چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے پیکٹ تھے، جن میں چاکلیٹ تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اس کو کبھی اس کو اس کے ہاتھ میں چاکلیٹوں کو دیکھتا جارہا تھا۔ اسے تو مجھ سے ٹافیوں، بسکٹوں کی فرمائش کرنا چاہئے تھی۔ اور یہ مجھے چاکلیٹ بیچنے آئی تھی۔ میں نے تو اسے کسی اسکول کی بے فکری، شریر بچی سمجھا تھا اور یہ اس کے چہرے پر جو سنجیدگی تھی، وہ اس عمر کے بچوں کے چہروں پر کہاں ہوتی ہے۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ اور اس کے ہاتھ کے چاروں پیکٹ لے لئے، حالانکہ مجھے ان کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ ایک روپیہ اسے مجھے واپس کرنا تھا۔

اس نے اپنا بیگ ٹٹولا۔ اور پھر پریشان سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس بقیہ ایک روپیہ نہیں ہے۔ آخر کہیں نہ کہیں سے اس نے ایک روپیہ بر آمد کر ہی لیا۔ لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "تم رکھ لو۔" میں نے بہت نرمی اور شفقت سے کہا۔

اس نے یقیناً میرا مطلب سمجھ لیا تھا۔ نفی میں سر ہلایا اصرار کے ساتھ نوٹ مجھے دینے کی کوشش کی۔ میں نے پھر انکار کیا اور اسے اپنے پاس رکھنے کو کہا۔

اس کے معصوم چہرے پر غصے کی سرخی ابھری، اس نے پیکٹ میرے ہاتھ سے واپس لے لئے میرا پانچ کا نوٹ مجھے واپس کیا اور بس میں اندر کی طرف چل پڑی۔ میں نے اسے منانے کی کوشش کی چلو بھئی

لاؤ- میرا روپیہ دو اور پیکٹ مجھے دے دو۔ وہ چلتے چلتے رک گئی، ناراض ناراض سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ وہی پیکٹ دوبارہ میرے پاس مع ایک روپے کے بقیہ کے واپس آ گئے تھے۔ پانچ کا نوٹ اس نے احتیاط سے بیگ کی اندر کی جیب میں رکھا۔ اور آگے چلی گئی مجھے معلوم ہے کہ اس کے ننھے کمر اور شانوں پر کتنی بہن بھائیوں کی معذوریاں اور مجبوریاں کا بوجھ ہوگا اس عمر میں تو وہ بڑے بہن، بھائی ماں باپ سے لڑ جھگڑ کر اور فرمائش کر کے ٹافیاں کھانا چاہتی ہوگی اور وہ اپنے خوابوں کو اس بیگ میں بند کر کے ٹافیاں بیچنے نکل آئی تھی۔ ایک روپیہ کی آخر کیا قدر و قیمت ہے؟ شاید ایک پیسہ بھی نہیں۔

لیکن اس چھوٹی سی لڑکی نے ایک روپیہ بھی زائد لینے سے انکار کر کے اپنے سودے کا۔ ایک چھوٹے سے سودے کا۔ نقصان گوارا کر لیا۔ جو اس کے لئے بہت بڑا اور آپ کے لئے بہت چھوٹا ہوگا۔ لیکن کیا وہ لڑکی واقعی اسی دنیا کی مخلوق تھی؟

.... ○ ....

اس شام اپنے بھتیجے خرم کو پرام میں بٹھائے گھر کے قریب گلیوں میں سیر کرا رہا تھا اور خرم چلا چلا کر "آہاہا۔ آہاہا!" کر رہا تھا۔ اور لوگ چلتے چلتے مڑ کر اسے دیکھتے اور ہنستے، چلے جاتے۔ گھر آتے ہوئے اپنی گلی سے چند قدم پر ایک لمبے تڑنگے ہٹے کٹے فقیر نے روک لیا۔ حلیہ وہی تھا جو عام طور پر فقیروں کا ہوتا ہے۔ ننھا خرم اسے دیکھ کر کچھ ڈر سا گیا۔ اور اس نے "آہاہا۔ آہاہا" بند کر دی۔

اس قسم کے لوگ فقیر نہیں زیادہ تر جرائم پیشہ قسم کے ہوتے ہیں بعض غیر ملکی جاسوس بھی اور آپ کو شاید بتا چکا ہوں کہ ہٹے کٹے بھکاریوں سے شدید قسم کی نفرت ہے اس قدر کہ ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے سے نگن! والدہ صاحبہ تو ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتی ہیں، لیکن میں اس معاملے میں ان سے متفق نہیں ہوں! ہاں تو خرم تو ڈر کر چپ ہو گیا میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے جیب سے کچھ نکال کر فقیر کو چلتا کیا۔

اور ابھی گلی کے موڑ پر مڑے ہی تھے کہ سامنے ایک دس بارہ سال ہی کا بچہ آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بیلے کے پھولوں کے ہار تھے۔ میں اسے پہلے بھی کئی بار گلیوں میں بس اسٹاپ پر بڑی مارکیٹ کے آس پاس یہی ہار بیچتے دیکھ چکا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ہمارے ہی علاقے میں رہتا ہے، لیکن نام اس کا مجھے ابھی تک معلوم نہیں...... ! اس نے ہار مجھے دکھائے۔ "ہاں بھئی کیا لو گے؟"

اس نے خاموشی سے ایک انگلی اٹھا دی۔ یعنی ایک ہار ایک روپے کا۔

میں نے دو ہار خرید لئے۔ ایک خرم کو پہنا دیا۔ دوسرا اس کی آپی کے لئے اپنے ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ اور جیب سے پیسے نکالے۔ یہ بھی پانچ کا نوٹ تھا۔

اور آپ کیا یقین کریں گے میں نے اسے باقی تین روپے رکھنے کو کہا تو اس نے بہت شکریہ کے ساتھ لینے سے انکار کر دیا۔ بڑی احتیاط سے اس نے تین روپے گن کر نکالے اور زبردستی میری جیب میں ٹھوس دیئے۔ میں نے ایک ہاتھ سے پرام پکڑ رکھی تھی دوسرے پر دوسرا ہار لپٹا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ رات کو والدہ نے بتایا کہ ہار بیچنے والا لڑکا آیا تھا۔ کہہ گیا ہے کہ میں اب وردود بھائی کو ہار نہیں بیچوں گا۔ مجھے جو کچھ کمانا ہے اپنی محنت سے کمانا ہے کسی سے کچھ نہیں لے سکتا! والدہ نے یہ قصہ سنانے کے بعد مجھے باقاعدہ ڈانٹا۔ جب وہ محنت کی حلال کھانا چاہتا ہے تو تم نے اس سے غلط ہمدردی کیوں کی؟ تمہیں اس کی ہمت افزائی کرنا چاہئے تھی!! جاؤ اس سے معافی مانگو۔

اور پھر وہ لڑکا مجھے دوبارہ نظر نہیں آیا۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ شاید آئے روز کے ہنگاموں اور کرفیو نے اس کی روزی ختم کر دی تھی۔ اور وہ یہ علاقہ چھوڑ کر اپنا رزق تلاش کرنے کہیں اور جا چکا ہے۔ اور خرم بیٹا ہزاروں میل دور کینیڈا میں ہے۔ اور میں آج بھی اس ہار والے کی تلاش میں ہوں وہ کہیں مل جائے تو اس سے معافی مانگوں!!

یہ میرے اوپر اس کا قرض ہے۔

اور مجھے وہ بچے یاد آجاتے ہیں جو محل نما گھروں میں رہتے ہیں ایئر کنڈیشنڈ اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور ان کے دن کرکٹ میچ میں اور راتیں وی سی آر اور ورائٹی پروگراموں میں گزرتی ہیں اور ان کو سخت شکایت ہے کہ پاکستان نے تو ہمیں کچھ نہیں دیا۔

اور پھر مجھے وہ ٹافیاں بیچنے والی بچی اور ہار بیچنے والا بچہ بھی یاد آجاتے ہیں اور وہ ہٹی کٹی فقیرنیاں اور مسٹنڈے فقیر بھی اور یہ مہذب اونچے طبقے کے بچے بھی، اور پھر میں کچھ سوچنے لگتا ہوں اب آپ ہی بتایئے بھلا میں کیا سوچتا ہوں؟ چلئے آپ ہی کچھ سوچئے۔ کیا یہ دونوں بچے اسی ملک کے باشندے اور اسی دنیا کے مخلوق تھے۔

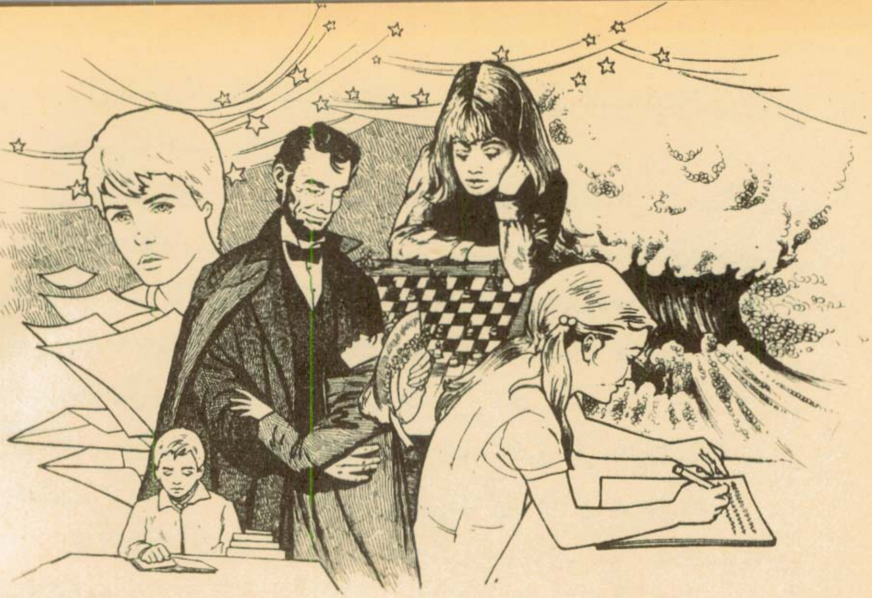

تاریخ ساز بچے

شین فاروقی

بچوں کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ بنانے سے زیادہ توڑنے کے کام کرتے ہیں اور اگر کبھی کچھ بناتے بھی ہیں تو کڑوا کسیلا منہ بناتے ہیں یا پھر نئے نئے دوست بناتے ہیں۔ لیکن آج ہم آپ کی ملاقات چند ایسے بچوں سے کروا رہے ہیں جنھوں نے تاریخ بنائی ہے۔ اور وہ بھی کسی کے ساتھ مل کر نہیں بلکہ تن تنہا، آیئے ہم آپ کو ان عظیم بچوں سے ملوائیں۔

گریس بیڈل

ابراہم لنکن امریکہ کے پہلے ڈاڑھی رکھنے والے صدر تھے۔ آپ کو یہ جان کر شاید تعجب ہو گا کہ انھوں نے یہ ڈاڑھی نیویارک کی ایک گیارہ سالہ بچی گریس بیڈل کے کہنے پر رکھی تھی۔ گریس نے ایک بار لنکن کو خط تحریر کیا تھا جس میں لکھا تھا۔

"اگر آپ ڈاڑھی رکھ لیں تو آپ پہلے سے زیادہ اچھے لگنے لگیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا چہرہ بہت پتلا ہے۔ خواتین ڈاھی مونچھوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے شوہروں کو مجبور کر دیں گی کہ وہ آپ کو ووٹ دیں۔ اس طرح آپ صدر بن جائیں گے۔"

خط ملتے ہی لنکن نے بچّی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ڈاڑھی رکھ لی۔ بعد میں جب ایک بار ان کی ملاقات گریس سے ہوئی تو انہوں نے اسے پیار کیا اور کہا۔ "دیکھو میں نے تمہارے کہنے پر ڈاڑھی مونچھیں رکھ لی ہیں۔"

بنی بینسن

الاسکا کی بنی بینسن نے الاسکا کا قومی جھنڈا ڈیزائین کر کے تاریخ بنائی۔ اس وقت اس کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب الاسکا ملک کے بجائے محض ایک علاقہ تھا۔ اس وقت سات سے بارہ گریڈ تک کے بچوں کے درمیان جھنڈا ڈیزائین کرنے کا ایک مقابلہ منعقد کرایا گیا۔ بنی بینسن نے سادہ، اوریجنل اور علامتی جھنڈا ڈیزائین کر کے مقابلہ جیت لیا۔ ۱۹۲۷ء میں بنی کا جھنڈا سرکاری اور قومی جھنڈا بن گیا۔

لنڈا براؤن

یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ اس وقت امریکہ میں سفید فاموں اور سیاہ فاموں کے درمیان بڑا سخت تعصب پایا جاتا تھا۔ اتنا سخت کہ سیاہ فاموں کے بچے گورے لوگوں کے بچوں کے اسکولوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تعصب کے باعث کم عمر لنڈا براؤن کو جو امریکی ریاست کیسن ساس کی شہری تھی کالے بچوں کے ابتدائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہر روز دو میل کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ لنڈا کے گھر سے چند قدموں کے فاصلے پر گورے بچوں کا اسکول تھا مگر وہ اس میں داخلہ نہیں لے سکتی تھی۔ اس صورتحال سے تنگ آکر لنڈا کے والدین نے بچوں کے ضلعی محکمہ تعلیم کے خلاف گورے اور کالے کی تفریق برتنے پر مقدمہ دائر کر دیا۔ ۱۹۵۴ء میں امریکی سپریم کورٹ نے اس مقدمے پر فیصلہ دیتے ہوئے محکمہ تعلیم کو ہدایت دی کہ وہ ہر رنگ و نسل کے بچوں کے لئے اپنے اسکولوں کے دروازے کھول دے۔ اس طرح لنڈا براؤن امریکہ کے نظام تعلیم میں ایک انقلابی تبدیلی کا سبب بن گئی۔

بوبی فشر

بوبی فشر امریکہ کے شہر شکاگو میں پیدا ہوئی تھی لیکن اس کا ابتدائی بچپن نیویارک میں گزرا۔

نیویارک میں جب اس کی عمر صرف چھ برس تھی تو اس کی بڑی بہن نے اسے شطرنج سکھانی شروع کی۔ ۱۹۸۵ء میں جب اس کی عمر صرف پندرہ برس تھی اس نے بین الاقوامی گرانڈ ماسٹر کا اعزاز حاصل کر لیا اور یوں وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والی کم عمر ترین کھلاڑی بن گئی۔ بعد میں بوبی شطرنج کی اولمپک چیمپئن بنی۔ وہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک شطرنج کی عالمی چیمپئن شپ جیتتی رہی۔

رسبل لوڈنگٹن

یہ ۱۷۷۷ء کی بات ہے۔ برطانیہ نے امریکہ پر حملہ کیا ہوا تھا اور دونوں فوجوں کے درمیان زبردست جنگ جاری تھی۔ اس زمانے کی بات ہے کہ امریکی فوج کا ایک تھکا ہوا پیغامبر لوڈنگٹن کے گھر آیا۔ وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اس کے لئے مزید سفر کرنا ناممکن تھا۔ دوسری طرف مسئلہ یہ تھا کہ اسے امریکی فوجوں کے لئے مزید کمک حاصل کرنے کا پیغام دے کر بھیجا گیا تھا اور ابھی اسے اور سفر کرنا تھا۔ ایسے میں سبل لوڈنگٹن نے رات کی تاریکی میں گھوڑے پر سوار ہو کر تنہا چالیس میل کا فاصلہ طے کیا اور پیغام منزل تک پہنچا دیا۔ اس کے نتیجے میں امریکی فوج کو بروقت مزید فوجی کمک مل گئی۔ جس کے باعث برطانوی فوج کو پسپا ہو کر اپنے بحری جہازوں پر واپس لوٹنا پڑا۔ سبل لوڈنگٹن کے اس کارنامے کی یاد میں اُس کا ایک مجسمہ نیویارک میں آج بھی نصب ہے۔ اس مجسمے میں لوڈنگٹن گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہے۔

سماتھا اسمتھ

سماتھا اسمتھ کا تعلق امریکہ سے تھا۔ جب سماتھا کی عمر صرف گیارہ سال تھی تو اس نے اس وقت کے روسی لیڈر یوری آندروپوف کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط میں سماتھا نے روسی لیڈر سے ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کو ختم کرنے کی اپیل کی تھی۔ آندروپوف نے سماتھا کے خط کے جواب میں اسے روس آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۹۸۳ء میں سماتھا نے روسی لیڈر کی دعوت پر اپنے والدین کے ساتھ روس کا دورہ کر کے تاریخ بنائی۔ اس دورے میں اس نے روس کی سیر کرنے کے علاوہ روسی لیڈر آندروپوف کے ساتھ ملاقات بھی کی۔ افسوس کہ ۱۹۸۵ء میں ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں سماتھا کا انتقال ہو گیا۔ سماتھا کی موت پر دنیا بھر میں افسوس کا اظہار کیا گیا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ بچوں نے کس طرح اپنی ذہانت اور بہادری سے تاریخ بنائی۔ بھئی ہمیں تو آپ کے اندر بھی ایسی ہی صلاحیتیں نظر آرہی ہیں کیا کبھی آپ نے اس پر غور کیا؟

کھیلوں کے کمسن ہیرو

ضیاء الرحمٰن ضیاء

جنہوں نے کھیلوں کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے

بچے اور نوجوانوں نے کھیل کی دنیا میں بھی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ دنیا، مقابلے کی دنیا ہے۔ آج ایک کھلاڑی کوئی ریکارڈ قائم کرتا ہے تو کل کوئی اور اسے توڑ دے گا لیکن بہت سے ریکارڈ ایسے ہیں جنہیں توڑنا بہت مشکل ہے۔ ذیل میں ایسے بچے اور نوجوانوں کے متعلق بتایا جائے گا، جو بہت کم عمری میں بہت بلندیوں تک پہنچے۔

اولمپک کھیلوں کو، کھیلوں کے سب سے اجتماع کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کھیلوں میں حصہ لینے کی تمنا، دنیا کا ہر کھلاڑی کرتا ہے۔ اور اس میں شریک کھلاڑی تمغوں کو اپنے اپنے سینوں پر آویزاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اولمپک کھیلوں کے انعقاد سے پہلے ہر ملک میں کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں اور ان میں اچھے

کھیل کا مظاہرہ کرنے والوں کو اولمپک کھیلوں میں بھیجا جاتا ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ایک بار بہت ہی چھوٹے بچے نے اولمپک کھیلوں میں حصہ لیا۔ اور انعام جیتا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۰ء میں فرانس کے دارالحکومت پیرس میں ہونے والے دوسرے اولمپک کھیلوں میں پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہالینڈ کے ایک ایتھیلیٹ ڈاکٹر ہرمانس بروک مین (DR.HERMANRSBROCKMAN) اپنے بھاری تن و توش کے سبب ابتدائی مقابلوں میں زیادہ بہتر کارکردگی پیش نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کی جگہ فرانس سے تعلق رکھنے والے ایک بچے نے حصہ لیا اور وہ سونے کا تمغہ جیتنے میں کامیاب ہوگیا۔ اولمپک کی تاریخ میں اس بچے کا ذکر تو موجود ہے لیکن اس کا نام کسی بھی ریکارڈ میں تحریر نہیں کیا گیا۔ اس بچے کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی عمر سات سے دس سال کے درمیان تھی۔ اس گمنام بچے کا شمار اولمپک کی تاریخ میں سونے کا تمغہ جیتنے والے سب سے کم سن کھلاڑیوں میں کیا جاتا ہے۔

سب سے کم عمری میں جس بچی نے اولمپک کھیلوں میں سونے کا تمغہ حاصل کیا ان کا تعلق امریکہ سے ہے، ان کا نام اس وقت مارجوری گیسٹرنگ (MARGORIEGESTRING) تھا جو شادی کے بعد (MRS.BOWMAN) کہلاتی ہیں۔ مارجوری نے ۱۹۳۶ء میں جرمنی کے شہر برلن میں منعقد کئے جانے والے اولمپک کھیلوں کے اسپرنگ بورڈ مقابلے میں شرکت کی اور سونے کا تمغہ جیتا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۳ برس ۲۶۸ دن تھی۔ دوڑ کی دنیا میں سب سے کم عمری میں عالمی ریکارڈ توڑنے کا اعزاز ایک چینی لڑکی وانگ یان کو حاصل ہوا۔ ۹ مارچ ۱۹۸۶ء کو عوامی جمہوریہ چین کے مقام ژیان میں انہوں نے خواتین کی پانچ ہزار میٹرز چہل قدمی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ انہوں نے وہ فاصلہ صرف ۲۱ منٹ ۸ء ۳۳ سیکنڈ میں طے کیا۔ اس وقت وہ صرف ۱۴ برس ۳۳۴ دن کی تھیں۔ نوجوان لڑکوں میں یہ کارنامہ برطانیہ کے ٹامس ربے سے منسوب ہے۔ جب انہوں نے پول الٹ میں ۱۱ فٹ ۷۵ء ۲ انچ چھلانگ لگائی تو ان کی عمر ۱۷ برس ۱۹۸ دن تھی۔

شطرنج کا شمار دنیا کے مشکل ترین کھیلوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ کھیل سوویت یونین میں بہت مقبول ہے۔ وہاں بہت چھوٹی عمر سے شطرنج کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شطرنج کے سب سے کم عمر چیمپئن خاتون اور مرد کھلاڑیوں کا تعلق سوویت یونین ہی سے ہے۔ ۱۹۷۸ء میں مایا گری گوری افنا چی برداندزے (MAYA RIGORYEVNA CHIBURADA NIDZE) نے صرف سترہ برس کی عمر میں عالمی چیمپئن شپ جیتی۔ شطرنج کے مشہور زمانہ کھلاڑی گیری کاسپاروف (GARY

(KASPAROV۹ نومبر ۱۹۸۵ء کو صرف ۲۲ سال ۲۱۰ دن میں شطرنج کے عالمی چیمپئن بنے۔

جمناسٹک ...... تو شاید ہے ہی بچے اور بچیوں کا کھیل۔ اس کھیل میں کھلاڑی کم عمری ہی میں کارنامے انجام دیتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے عمر گزرتی جاتی ہے، کھلاڑی، میدانوں سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ بچپن میں جسم میں جو لچک ہوتی ہے اس کا مظاہرہ بڑی عمر میں نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بیس سال کی عمر کے نوجوان جمناسٹک کے لئے بوڑھے سمجھے جاتے ہیں۔

جمناسٹک کی ملکہ نادیا کومینیسی سے کون واقف نہیں۔ ان ہی کے دیس رومانیہ سے تعلق رکھنے والی ڈینیلا سلیواس (DANIELA SILIVAS) نے ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ء کو جب "بیلنس بیم" کی عالمی چیمپئن شپ میں سونے کا تمغہ جیتا تو ان کی عمر صرف ۱۴ برس ۱۸۵ دن تھی۔ مردوں میں سب سے کم عمر جمناسٹک کی عالمی چیمپئن شپ جیتنے والے سوویت یونین کے ڈیمیٹری بلوزر چیف (DMITRIY BILOZERCHEV) ہیں۔ انہوں وہ جب ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ہنگری کے دارالحکومت بڈاپسٹ میں عالمی چیمپئن قرار دیئے گئے تو وہ صرف ۱۶ برس ۳۱۵ دن کے تھے۔

رگبی ...... فٹ بال سے کچھ ملتا جلتا کھیل ہے۔ یہ کھیل یورپی ممالک فرانس، آئرلینڈ، ویلز، اسکاٹ لینڈ کے ساتھ ساتھ آسٹریلیا نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ میں بھی بہت مقبول ہے۔ انگلینڈ کے دو کھلاڑی ایسے ہیں جنہیں رگبی کے سب سے کم عمر عالمی چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کھلاڑیوں کے نام نینین جیمیسن فنلے (NINIAN JAMIESON FINLAY) اور چارلس ریڈ (CHARLES REID) تھے۔ انہوں نے جب ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۱ء میں اسکاٹ لینڈ کے خلاف میچ کھیلے تو ان کی عمر ۱۷ برس ۳۶ دن تھی۔

ومبلڈن ...... ٹینس کا ایک بہت اہم ٹورنامنٹ جو انگلینڈ میں منعقد کیا جاتا ہے۔ سب سے کم سن خاتون ومبلڈن چیمپئن امریکہ کی شارلٹ ڈوڈ (CHARLORREDOD) تھیں۔ ان کی عمر ۱۵ برس ۲۸۵ دن تھی، جب انہوں نے ۱۸۸۷ء ومبلڈن ٹینس چیمپئن شپ جیتی۔ مردوں میں یہ اعزاز جرمنی کے بورس بیکر سے منسوب ہے انہوں نے ۱۹۸۵ء میں جب یہ ٹائیٹل حاصل کیا تو وہ ۱۷ برس ۲۲۷ دن کے تھے۔

بھاری وزن اٹھانے وزن اٹھانے کا سلسلہ قدیم زمانے سے جاری ہے۔ وزن اٹھانا، طاقت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ جو جتنا زیادہ وزن اٹھاتا ہے اسے اتنا ہی زیادہ طاقتور سمجھا جاتا ہے۔ دنیا ویٹ لفٹنگ کے کم

سن ترین عالمی چیمپئن کا نام نعیم سلیمانوگلو ہے۔ اس وقت وہ ترکی کے شہری ہیں۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو جب ۵۶ کلو گرام اسنیچ میں عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا تو وہ بغاریہ کے باشندے تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۵ برس ۳۳۴ دن تھی۔

اب ہم آپ کو ایک ایسی بچی کے متعلق بتائیں گے جس نے سب سے کم سنی میں ایک عالمی ریکارڈ توڑ کر، نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ وہ بچی امریکہ کی گرٹرڈ کیرولن ایڈرلے (GERTRUEDCARO-LINE EDERLE) تھیں۔ انہوں نے وہ ریکارڈ ۱۷ اگست ۱۹۱۹ء کو امریکہ کے شہر انڈیانا پولس میں ہونے والے ۸۸۰ گز فری اسٹائل تیراکی کے مقابلے میں قائم کیا تھا۔ جب انہوں نے وہ عالمی ریکارڈ قائم کیا تو وہ ۱۶ برس کی تھیں۔ اتنی کم عمر میں کسی اور کھلاڑی کو عالمی ریکارڈ توڑنے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا۔

یہ ریکارڈ بچے اور نوجوانوں ہی نے قائم کئے ہیں۔ انہوں نے بلندی تک پہنچنے کے لئے دن رات جدوجہد کی۔ آپ چاہیں تو آپ کا نام بھی دنیا کے ان عظیم افراد میں شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ بھی محنت کریں۔ یاد رکھئے ہر ریکارڈ، ٹوٹنے ہی کے لئے قائم ہوتا ہے۔

دنیا کی اور اقوام کی طرح پاکستان کی قومیت رکھنے والے افراد نے بھی کھیل کی دنیا میں کم عمری میں بڑے کارنامے انجام دیئے۔ خصوصاً کرکٹ کے میدان میں تو پاکستان کے بچوں اور نوجوانوں نے ایسے عالمی ریکارڈ قائم کئے جن تک دنیا کی کوئی قوم نہیں پہنچ سکتی۔

کرکٹ کے سب سے معیاری اور معتبر ریکارڈ بک "وزڈن" ہے۔ اس لئے اسے کرکٹ کی نجیل کہا جاتا ہے۔ وزڈن کے مطابق جنوری ۱۹۷۱ء میں بھاولپور کے اسپنر قاسم فیروز صرف ۱۲ برس ۳۶۳ ن کی عمر میں میچ کھیل کر، فرسٹ کلاس کرکٹ کی تاریخ کے سب سے کم سن کھلاڑی بن گئے تھے۔ جدید حقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ فرسٹ کلاس کرکٹ میں ان سے بھی کم عمر میں دو اور کھلاڑی میچ یل چکے ہیں۔ اور وہ دونوں بھی پاکستانی ہیں۔ دنیا کے تین سب سے کم سن کھلاڑیوں کی تفصیل یہ ہے

ر	نام کھلاڑی	پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلتے وقت عمر	ٹیم	حریف ٹیم	مقام	مقابلہ	سیزن / تاریخ
	یم الدین	۱۲ برس ۷۳ دن	راجپوتانہ	بڑودہ	بڑودہ	رانجی ٹرافی	۲۶ فروری ۱۹۴۳ء
	قب جاوید	۱۲ برس ۷۶ دن	لاہور ڈویژن	فیصل آباد	سیالکوٹ	پیٹرز ٹرافی	اکتوبر ۱۹۸۴ء
	قاسم فیروز	۱۲ برس ۳۶۳ دن	بھاولپور				جنوری ۱۹۷۱ء

پاکستانی کھلاڑیوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں اہم کارنامہ انجام دیئے۔ دنیا کے ابتدائی سات کم سن ٹیسٹ کرکٹرز میں سے چھ کا تعلق پاکستان سے ہے۔

نمبر	نام کھلاڑی	پہلا ٹیسٹ میچ کھیلتے وقت عمر	ملک	حریف ملک	مقام	سیریز
۱	مشتاق محمد	۱۵ برس ۱۲۴ دن	پاکستان	ویسٹ انڈیز	لاہور	۱۹۵۸-۵۹ء
۲	عاقب جاوید	۱۶ برس ۱۸۹ دن	پاکستان	نیوزی لینڈ	ویلنگٹن	۱۹۸۸-۸۹ء
۳	آفتاب بلوچ	۱۶ برس ۱۹۰ دن	پاکستان	نیوزی لینڈ	ڈھاکہ	۱۹۶۹-۷۰
۴	سچن ٹینڈولکر	۱۶ برس ۲۰۵	پاکستان	نیوزی لینڈ	کراچی	۱۹۸۹-۹۰ء
۵	نسیم الغنی	۱۶ برس ۲۴۸	بھارت	پاکستان	برج ٹاؤن	۱۹۵۷-۵۸ء
۶	خالد حسن	۱۶ برس ۳۵۲ دن	پاکستان	ویسٹ انڈیز	ٹانگھم	۱۹۵۴ء
۷	زاہد فضل	۱۷ برس ۵ دن	پاکستان	انگلینڈ	کراچی	۱۹۹-۹۱ء

بچوں کے سوداگر

مرسلہ : سلیمان احمد

امریکہ اور یورپ میں بچوں کے خرید و فروخت ے واقعات بڑھتے جارہے ہیں۔ متمول بے اولاد جوڑے دھڑا دھڑ غریب ملکوں کے بچے گود لے رہے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق گزشتہ برس امریکہ کے دس ہزار سے زائد جوڑوں نے مختلف ملکوں کے بچوں کو گود لیا۔ فرانس میں بھی دن بہ دن یہ رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں دو ہزار دو سو بچوں کو قانونی طور پر گود لیا گیا۔ برطانیہ اور مغربی جرمنی میں بھی غیر ملکی بچوں کو متبنّیٰ بنانے کی شرح حیرت انگیز رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ امیر عورتیں غریب ملکوں کی مفلس ماؤں کی گودیں اجاڑ کر اپنی گودیں آباد کر رہی ہیں۔ چونکہ قانونی طور پر بچوں کو گود لینے کا مرحلہ خاصا

طویل اور تکلیف دہ ہے لہٰذا جھنجٹ سے بچنے کے لئے یورپ اور امریکہ کے مالدار جوڑے بڑی تعداد میں لاطینی امریکہ اور ایشیاء سے شیر خوار بچے خرید رہے ہیں۔ چلّی، ارجنٹائن اور سری لنکا میں کئی طاقتور گروہ بچوں کو فروخت کرنے کا مذموم کاروبار کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں ایک شیر خوار بچے کی قیمت دس سے بیس ہزار امریکی ڈالر ہوتی ہے۔ یہ خبیث لوگ نوٹوں کی گڈیاں لے کر تحقیق اور تسلی کئے بغیر بچے بے اولاد جوڑوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ شمالی کوریا کی حکومت ہر سال ہزاروں غیر قانونی بچوں کو سڑکوں سے اٹھا کر ایک مرکز میں جمع کرتی ہے جہاں یہ بچے امریکہ اور یورپ کے بے اولاد جوڑوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں ایسے بچوں کو ہنسی خوشی گود لیا جاتا ہے۔ یہ بچے پانچ ہزار امریکی ڈالر کے عوض بے اولاد جوڑوں کے حوالے کئے جا رہے ہیں۔

آپ نے پولٹری فارم، کیٹل فارم اور فش فارم وغیرہ کے بارے میں ضرور سنا اور پڑھا ہوگا..... اور اب یہ بھی سن لیں کہ سری لنکا میں دور دراز کے مقامات پر "بچہ فارم" بھی قائم ہیں۔ "بچہ فارم" کے مالک ماؤں کو بہترین غذا، قیمتی ملبوسات کے علاوہ دو ہزار روپے ماہانہ وظیفہ دیتے ہیں اور ان سے ان کے شیر خوار بچے لے جاتے ہیں۔ یہ بچے پچّیس ہزار سے تیس ہزار روپے تک بیلجیئم اور سوئیڈن کی ایجنسیوں کو دے دیئے جاتے ہیں۔ جو آگے ان بچوں کو ڈیڑھ دو لاکھ روپے میں فروخت کر دیتی ہیں۔ بچوں کی فروخت کا یہ گھناؤنا کاروبار چلّی، ارجنٹائن اور پیراگوئے میں بہت وسعت اختیار کر گیا ہے۔ ارجنٹائن میں نوے فیصد آبادی سفید فاموں کی ہے۔ وہاں کے بچے یورپین بچوں کی طرح خوبصورت ہوتے ہیں اور ان بچوں کے بڑے اچھے دام ملتے ہیں۔ اس مذموم کاروبار میں جج، وکلا اور امیگریشن کے حکام ملوث ہیں۔ صحیح اعداد و شمار تو کسی طور بھی حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ البتہ لاطینی امریکہ کے حکام کا اندازہ ہے کہ ان ممالک سے سالانہ پانچ سو سے دو ہزار شیر خوار بچے غیر قانونی طور پر ایکسپورٹ کر دیئے جاتے ہیں۔ بیلجیئم اور سوئیڈن شیر خوار بچوں کی سب سے بڑی منڈیاں ہیں۔ ان ملکوں میں دنیا بھر سے بچے لا کر فروخت کئے جاتے ہیں۔ ہر رنگ اور ہر نسل کا بچہ یہاں معقول قیمت پر مل جاتا ہے۔

ایشیا میں سب سے زیادہ سری لنکا میں بچوں کی غیر قانونی تجارت ہوتی ہے۔ سری لنکا کے اعلیٰ حکام نے اندازہ لگایا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں چھ سو سے زائد بچے سری لنکا سے مغربی ممالک فروخت کئے گئے۔ حالانکہ حکومت ۱۹۸۵ء سے اس ضمن میں سخت انتظامات کر رہی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں پورے ملک میں پچاس سے زائد "بچہ فارم" تھے۔ حکومت کی مہم کے نتیجہ میں اب "بچہ فارم" ایک درجن سے بھی کم رہ

گئے۔

پاکستان سے بھی چھ سے آٹھ سال تک کے بچے فروخت کئے جاتے ہیں۔ یہاں سے بچوں کو خلیج کی ریاستوں میں فروخت کیا جاتا ہے۔ وہاں کے امیر شیخ ان بچوں کے خریدار ہوتے ہیں۔ ان بچوں کو اونٹوں کی پیٹھوں سے رسیوں کے ذریعہ باندھ دیا جاتا ہے۔ جب اونٹ بھاگتا ہے تو بچوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں اور اونٹ ان چیخوں سے اور تیز دوڑنے لگتا ہے اونٹوں کے دائیں بائیں ایمبولینس ہوتی ہیں۔ تاکہ اگر کوئی بچہ اونٹ سے گر جائے تو اس کو طبی امداد دی جائے۔ کئی مرتبہ ان دوڑوں میں بچے مر جاتے ہیں۔ یہ دوڑیں وہاں کے شیخ بھی دیکھتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں کی شرطیں بھی لگاتے ہیں۔

ہماری حکومت کو چاہئے کہ سخت انتظامات کرے اور اس گھناؤنے کاروبار کو بند کرنے کے سلسلے میں جلد اور موثر اقدامات کرے اور بے گناہ جانوں کو ضائع ہونے سے بچائے۔

نتائج مقابلہ غزل پزل

گزشتہ ماہ غزل پزل کے آخری مقابلے میں درج ذیل ساتھیوں نے قرعہ اندازی کے ذریعہ انعامات حاصل کیے۔ انعامات پہلے ہی روانہ کیے جا چکے ہیں۔ کامیابی کی مبارک باد ان سطور کے ساتھ قبول کیجیے! (ادارہ)

گزشتہ ماہ کے درست جوابات۔

(۱) باب ابراہیم (۲) اسکاٹ لینڈ (۳) آنسو ہائی (۴) یالٹا (۵) منجنیق (۶) شیخ سعدی شیرازیؒ (۷) مراصلاتی سیارہ (۸) کیکڑا (۹) خطرے کا نشان (۱۰) رنجیت سنگھ۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی۔

(۱) ذوالفقار حیدر، ضلع سانگھڑ (۲) تسمیہ حیدر، گلشن اقبال، کراچی (۳) محمد عمران قادر، ٹنڈو آدم۔

صحیح جوابات بھجوانے والے ساتھیوں کے نام

(۱) سلمان حفیظ، لاہور۔ (۲) عمران یونس، ضلع دادو۔ (۳) اسلام نبی، کراچی۔ (۴) عارف انیس، کراچی۔ (۵) مصطفیٰ خان، کراچی۔ (۶) شکیل اللہ دتہ، کراچی۔ (۷) شارق شمیم، کراچی (۸) [illegible]۔

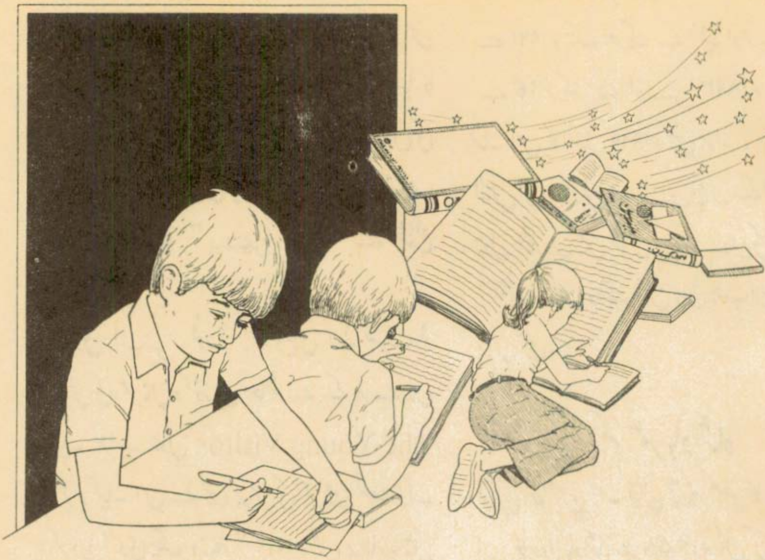

بچے
جنہوں نے کتابیں لکھیں
جنہوں نے بادشاہت کی

شید [illegible]

عام لوگوں کا خیال ہے کہ ذہنی پختگی کا تعلق عمر کے ساتھ ہوتا ہے۔ آدمی جتنی زیادہ عمر کا ہوگا اس میں ذہنی پختگی بھی اتنی زیادہ ہوگی۔ تاہم یہ خیال بظاہر جتنا درست نظر آتا ہے بعض صورتوں میں اتنا درست نہیں ہوتا۔ پختگی کا تعلق ذہن اور ذہانت سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض بچوں کو اتنی ذہنی صلاحیتیں دے دیتا ہے کہ وہ بے حد کم عمر میں اتنی ذہنی پختگی حاصل کر لیتے ہیں کہ بہت سے بڑی عمر کے لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ذیل میں ہم آپ کو ایسے ہی بچوں سے متعارف کروا رہے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جنہوں نے کم عمری میں حیرت انگیز ذہنی پختگی حاصل کی اور کتابوں کے مصنف بن گئے۔ ان میں وہ بچے بھی شامل ہیں جو کم عمری میں بادشاہ بنے۔

ڈوتھی اسٹریٹ :۔ ڈوتھی دنیا کی کم عمر ترین

مصنّفہ ہے۔ اس کا تعلق واشنگٹن ڈی سی سے تھا۔ جب اس کی عمر صرف چار برس تھی تو اس نے ایک کتاب لکھی جس کا عنوان تھا "دنیا کا آغاز کس طرح ہوا؟" ۱۹۶۴ء میں جب اس کی عمر چھ برس تھی اس کی یہ کتاب نیویارک کے ایک اشاعتی ادارے "پینتھن بُکس" نے شائع کی۔

ڈیزی الیش فورڈ :۔ ڈیزی نے صرف نو برس کی عمر میں وکٹورین معاشرے کے بارے میں ایک مزاحیہ ناول The Young Visitor تحریر کیا۔ اس نے تیرہ برس کی عمر میں لکھنا ترک کر دیا "دی ینگ وزیٹر" ۱۹۱۹ء میں برطانیہ میں شائع ہوئی اور سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کا اعزاز حاصل کیا۔ ڈیزی جس کا اصل نام مارگریٹ میری تھا ۱۸۱۸ء میں برطانیہ میں پیدا ہوئی۔اس کا انتقال ۱۹۷۲ء میں ہوا۔

بنجامن فریڈ مین :۔ بنجامین نے نو برس کی عمر میں ایک با تصویر کتاب لکھی جس کا نام "نا معقول کتاب" تھا۔ یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں سان فرانسسکو میں پی وی پریس سے شائع ہوئی۔

ایلسن ڈیوس :۔ ایلسن نے آٹھ برس کی عمر میں "بواد کی جنگ:ایک تاریخ" نامی کتاب تحریر کی۔ یہ کتاب آج بھی لائبریری آف کانگریس امریکہ میں نایاب کتابوں کے ذخیرے کے ساتھ محفوظ ہے۔ بڑا ہو کر ایلسن ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۱ء تک امریکہ کے خفیہ ادارے سی آئی اے کا ڈائریکٹر بنا۔ ایلسن ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا انتقال ۱۹۶۹ء میں ہوا۔

ایس ای ہنٹن :۔ ہنٹن بچوں کے مقبول ترین ناول نگاروں میں شامل ہیں۔ ہنٹن کی پہلی کتاب "اجنبی" اس وقت شائع ہوئی جب ان کی عمر تیرہ برس تھی۔

کم عمر بادشاہ

توتن خامن :۔ توتن قدیم مصر کا بادشاہ تھا۔ اس کا دورِ بادشاہت ۱۳۵۸ء قبل مسیح کا بتایا جاتا ہے۔ توتن نو برس کی عمر میں مصر کا بادشاہ بن گیا تھا۔ اس نے بادشاہ بننے کے بعد مزید نو سال تک حکومت کی۔ تاہم اس کی شہرت کا اصل سبب اس کی بادشاہت سے زیادہ اس کا مقبرہ ہے جو ۱۹۲۲ء میں کھدائی کے دوران دریافت ہوا۔ اس مقبرے میں چار کمرے ایسے تھے جن میں اس کا خزانہ موجود تھا۔ توتن کے اس خزانے کی دنیا کے تمام بڑے عجائب گھروں میں نمائش کی گئی تھی۔

ایڈورڈ چہارم :۔ ایڈورڈ چہارم ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا۔ وہ نو برس کی عمر میں برطانیہ کے تخت پر بیٹھا۔ تاہم کچھ ہی وقت کے بعد اس کے چچا رچرڈ

نے اسے اور اس کے چھوٹے بھائی کو لندن ٹاور میں قید کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

اس دن کے بعد سے آج تک کسی کو نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے۔ عام خیال یہ ہے کہ دونوں بھائیوں کو ان کے چچا نے سوتے میں ہلاک کروادیا تھا۔ البتہ یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ ایڈورڈ کے بعد برطانیہ کے تخت پر بیٹھنے والے بادشاہ ہینری ششم نے ان بچوں کو ہلاک کروایا تھا۔

ایڈورڈ پنجم :۔ ایڈورڈ پنجم ، ہینری ہشتم اور اس کی تیسری بیوی جین سیمر کا بیٹا تھا۔ ایڈورڈ اپنے والد کی وفات کے بعد دس برس کی عمر میں برطانیہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے چچا ایڈورڈ سیم کی نگرانی میں ۱۵۴۷ء سے ۱۵۵۳ء تک حکومت کی۔ ایڈورڈ کو انگلش گرامر اسکولوں کا سلسلہ قائم کرنے کے حوالے سے خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ایڈورڈ پنجم کا سولہ برس کی عمر میں ٹی بی کی بیماری میں انتقال ہوا۔

فرانسس دوئم :۔ فرانسس دوئم ، فرانس کا بادشاہ تھا اس کا دور حکومت ۱۵۵۹ء سے ۱۵۶۰ء تک رہا۔ فرانسس اپنے والد کی موت کے بعد اس وقت فرانس کا بادشاہ بنا جب اس کی عمر پندرہ سال تھی ایک نجومی نے اس کے والد کے انتقال سے چار برس قبل ہی ان کی موت کی پیشن گوئی کر دی تھی۔ فرانسس سولہ برس کی عمر میں صرف آٹھ ماہ حکومت کرنے کے بعد دنیا سے کوچ کر گیا۔

پیٹر اوّل :۔ پیٹر اول نے ۱۹۶۲ء سے ۱۷۲۵ء تک روس پر حکومت کی۔ پیٹر دس برس کی عمر میں بادشاہ بن گیا تھا۔ تاہم اس وقت اس کا ایک بھائی ایوان بھی اس کے ساتھ اقتدار میں شریک تھا۔ البتہ جب اس کی عمر پندرہ برس ہوئی تو وہ مکمل بادشاہ بن گیا۔ وہ روس کو مغربی طرز زندگی کے قریب لانے کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ "پیٹرِ اعظم" کے نام سے مشہور ہوا۔

ان بچوں کے حالات زندگی پڑھنے کے بعد بھی اگر کوئی عمر کو پختگی کے لئے ضروری سمجھے تو اس پر ہنسنے کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے ٹھیک کہا نا............؟

☆ ایک آدمی اپنے چھ سالہ معصوم بیٹے سے مخاطب تھا اور اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔

باپ نے کہا، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔

بیٹے نے حیرانی سے کہا، تو کیا میں بھی بندر کی اولاد ہوں"۔

(شیراز حسن بھٹہ ...... مظفر گڑھ)

بچوں کا بڑا ادب

جاوید اقبال اثری

دنیا کی ہر زبان اور ادب میں جہاں ادیبوں نے بڑوں کے لئے کہانیاں، افسانے اور ناول تخلیق کئے ہیں وہیں بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ بچوں کے لئے اتنی عمدہ اور دلچسپ کہانیاں لکھی ہیں کہ بڑے بھی انہیں بے حد شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ہم مغربی ادب میں بچوں کے لئے لکھے جانے والے چند ایسے ناولوں کا یہاں ذکر کریں گے جنہیں شاہکار کہا جاتا ہے۔ اور جو آج بھی بے انتہا مقبول ہیں۔

تو اس سلسلے میں ہمارا پہلا انتخاب انگریزی ادب کا مشہور ناول (GULLIVER'STRAVELS) یعنی ''گلیور کے سفر نامے'' ہے۔ اس کے مصنف جو ناتھن سوئفٹ تھے جو ایک انگلستان نژاد آئرش باشندے تھے۔ یہ ایک مذہبی ادارے کے فارغ التحصیل تھے۔ یہ کہانی چار حصوں میں بیان کی گئی ہے۔ جس کے ہر حصے میں کسی ایک جگہ کے سفر کا ذکر ہے جہاں ''گلیور'' کو جانے کا اتفاق ہوا اور پھر جہاں اس کے ساتھ حیرت انگیز واقعات پیش آئے۔ ناول میں گلیور ہی کی زبانی تمام کہانی بیان کی گئی ہے۔ جس کے مطابق گلیور ایک تجارتی بحری جہاز پر ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہے۔ ناول کے پہلے حصے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ جہاز جس پر گلیور سفر کر رہا تھا وہ ناگہانی طور پر ''للی پٹ'' (LILIPUT) کے جزیرے کے قریب الٹ جاتا ہے۔ اس جزیرے کے تمام باشندے بونے ہیں اور ان کی ہر چیز کا تناسب ہمارے ہاں کی چیز کے

بارہویں حصے کے برابر ہے۔ یہ لوگ پہلے توگلیور کو ننھی ننھی کیلوں اور خود گلیور کے بالوں کی مدد سے قید کر لیتے ہیں۔ پھر اسے بادشاہ کے سامنے حاضر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گلیور ان تمام لوگوں کے لئے انتہائی تعجب کا سبب ہوتا ہے۔ بہرحال گلیور وہاں پر اسی قسم کے ہنگاموں، اختلافات اور رقابتوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جیسا کہ اس زمانے میں انگلستان کے شاہی دربار میں ہوتے تھے۔ ناول کا مصنف بونوں کی ان باہمی لڑائیوں کی منظر کشی کے ذریعے خود اپنے سماج پر طنز کرنا چاہتا ہے جو وہ اپنے ہاں یعنی برطانیہ میں بڑی شدت اور کثرت سے ہوتا ہوا دیکھتا تھا۔ بہرحال گلیور یہاں سے کسی طرح بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر پھر ایک بار اس کا جہاز الٹ جاتا ہے۔ اس مرتبہ یہ حادثہ (BROBDINGNAG) کے جزیرے کے قریب پیش آتا ہے۔ یہاں کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر چیز نہایت لمبی چوڑی اور طویل القامت ہے حتیٰ کہ یہاں باشندوں کے قد بھی چرچ کے میناروں کے برابر ہیں اور تمام دوسری چیزیں اسی تناسب سے بڑھی ہوئی ہیں۔ اس کتاب کے تیسرے حصے میں اڑتے ہوئے جزیرے لاپٹا (LAPUTA) کا اور اس جزیرے کے پڑوس میں واقع براعظم لگاڈو کا بیان ہے۔ یہاں ساحروں (جادوگروں) کے جزیرے میں گلیور کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ گزرے ہوئے لوگوں سے ملیں اور ان سے تاریخ اور تاریخی واقعات کی حقیقت کا پتا لگائیں۔ ان ملاقاتوں میں سے گلیور پر یہ بات کھلتی ہے کہ وہ بہت کچھ جو اس نے ان تاریخی واقعات کے متعلق سن رکھا ہے وہ محض ایک فریب ہے۔ دراصل کتاب کے اس حصے میں ناول کے مصنف جوناتھن سوئفٹ نے بہت سے دانشوروں مثلاً فلسفیوں، مورخوں اور سائنس دانوں کو اپنے طنز کا ہدف بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے اس بات کو پالیا تھا کہ بہت سی باتیں اور واقعات جو ہمیں تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتے ہیں وہ محض بنا سنوار کر پیش کی گئی باتیں ہیں اور تاریخ میں وہ سچائی نہیں ہے جو ہم اس سے منسوب کرتے ہیں۔ اس حصے کا ایک اور دلچسپ واقعہ گلیور کی اسٹرلڈ برگز (SIRULDBURL) سے ملاقات ہے۔ یہ انسانوں کی ایک ایسی نسل ہے جنہیں حیات جاودانی عطا کی گئی ہے۔ مگر اس ملاقات سے گلیور پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ کی زندگی بجائے رحمت کے اس نسل کے لئے زحمت و عذاب ہے۔ کتاب کا چوتھا حصہ اس ملک کے سفر کے متعلق ہے جہاں "ہوئی ہمز" اور تیاہوز" آباد ہیں۔ یہ جوناتھن سوئفٹ کے تمام تلخ تجربات کا نچوڑ ہے۔ "ہوئی ہمز" عقل مند اور باشعور گھوڑوں کی نسل ہے۔ ان گھوڑوں کی . . . .سادگی اور اچھائیوں کا مقابلہ "یاہوز" کے وحشیانہ طرز عمل سے کیا گیا ہے گو کہ یاہوز انسانی شکل کے حامل ہیں۔ مگر یہ نسل اپنے رہن سہن اور کردار میں نہایت وحشی اور خونخوار ہے۔

یہ کتاب دراصل انسان سماج اور ان دونوں کے غیر معقول اور ظالمانہ طرز عمل پر ایک زبردست طنز

ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب بچوں میں بلکہ بڑوں میں بھی بے حد مقبول ہے۔

دنیا بھر کے بچوں کی دوسری مقبول ترین کتاب ایک سفر نامہ ہے۔ اس کے مصنف ڈینیل ڈیفو ہیں اور کتاب کا نام "رابن سن کرسو" ہے۔ اس سفر نامے کی بنیاد ایک انگریز سپاہی ایلیکزانڈر سیلکرک کا وہ سفر ہے جس میں اسے وان فرنانڈیز (JUAN, FERNANDEZ) کے غیر آباد جزیرے میں پناہ لینی پڑی ڈیفو نے اس سفر کے فرضی واقعات لکھے ہیں۔ لیکن پڑھتے ہوئے یہ فرضی واقعات بھی سچے لگتے ہیں۔

کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ کروسو کا جہاز ایک حادثے میں کسی غیر آباد جزیرے کے کنارے تباہ ہو جاتا ہے۔ کروسو بمشکل ساحل پر پہنچتا ہے۔ اس وقت اس کے پاس فقط ایک عدد چھری، ایک پائپ اور ایک ڈبیہ میں کچھ تمباکو ہوتا ہے۔ بظاہر یہ حالت نہایت مایوس کن نظر آتی ہے۔ مگر کروسو ہمت نہیں ہارتا ہے بلکہ کچھ ہی مدت بعد تیر کر جہاز کے ملبے تک پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے اپنی ضرورت کی یہ چند چیزیں نکال لاتا ہے۔ روٹی چاول، پنیر، کچھ بکری کا گوشت اور کچھ مکئی، کچھ کپڑے اور اوزار اور ان تمام چیزوں کو یکجا کرتے وقت اس کا یہ تبصرہ ہمیں اس کے ذہن کی صحیح عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ بڑھئی کے اوزاروں والا ڈبہ میرے لئے سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو وہ تختوں پر لاد کر ساحل پر لے آتا ہے۔ اور یہاں اپنے رہن سہن کا انتظام کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

مگر اس سے پہلے وہ ایک زیرک انسان کی طرح ایک نہایت ضروری کام کرتا ہے۔ جزیرے کے ایک اونچے مقام پر جاکر وہ وہاں کے تمام علاقوں کے محل وقوع کا جائزہ لیتا ہے۔ اس جائزے سے اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ جزیرہ غیر آباد ہے۔

نیچے آکر پہلے تو وہ اپنے لئے ایک کچی پکی جھونپڑی کی تعمیر کرتا ہے۔ پھر وقتاً فوقتاً وہ جہاز کے ملبے تک جاکر وہاں سے ضرورت اور اپنے کام کی مزید چیزیں نکال لاتا ہے۔ یوں وہ اپنے استعمال کے لئے اچھا خاصا سامان جمع کرلیتا ہے۔

اپنے رہنے کے لئے اسے ایک غار مل جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اندر سے اس غار کی گنجائش میں اضافہ کرنے لگتا ہے اور دوسری طرف باہر سے اس کی حفاظت کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دو کٹہرے بناتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ جہاز کے ملبے سے بچے ہوئے سامان کو غار کے اندر پہنچا دیتا ہے۔

جب اس کام سے اسے کچھ فراغت ملتی ہے تو وہ اپنی ڈائری (روزنامچہ) لکھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ مشق شروع کرنے کے کچھ ہی عرصے بعد اس کے اندر دو نہایت اہم احساسات جاگتے ہیں۔ ایک تو

یہ احساس جو اس میں اپنی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے کہ زندگی میں اچھائی اور برائی علیحدہ علیحدہ حالتوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔ بلکہ ہر برائی اور ہر مصیبت اپنے ساتھ ایک رحمت اور ایک نہ ایک نعمت ضرور لاتی ہے۔ اور اسی سے دعا کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اب وہ باقاعدگی سے انہیں پڑھنے لگتا ہے اور باقاعدگی سے دعا کرنے لگتا ہے۔

یوں وقت گزرنے کے ساتھ اس کی زندگی میں استحکام آنے لگتا ہے اور اپنے قیام کے تقریباً دس ماہ بعد وہ جزیرے کے دوسرے حصے کے دورے پر نکل پڑتا ہے۔ اس حصے کو وہ بہت زیادہ زرخیز پاتا ہے جہاں میٹھے پانی کا ایک چشمہ بھی دریافت ہوتا ہے۔ ان دریافتوں سے اسے بہت مسرت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنا خاصا وقت یہاں پر گزارنے لگتا ہے۔

ایک اور دورے کے دوران جس میں وہ تمام ساحل کا معائنہ کرتا ہے اسے کچھ فاصلے پر خشکی کا کچھ اور حصہ بھی نظر آتا ہے مگر اس خوف سے کہ وہاں وحشی نہ ہوں وہ اپنے ہی جزیرے تک اپنے دورے کو محدود رکھتا ہے۔

یوں اس کا وقت گزرتا رہتا ہے۔ اس دوران وہ ایک مرتبہ اپنی کشتی کی مرمت کی کوشش بھی کرتا ہے مگر کشتی بڑی ہونے کی وجہ سے اس کی کوشش ناکام رہتی ہے اسی طرح برسوں گزر جاتے ہیں اور اس تمام عرصے کے دوران کروسو کسی نہ کسی کام میں اپنے آپ کو ضرور مصروف رکھتا ہے۔

کافی عرصہ گزرنے کے بعد ایک واقعہ میں وہ ایک مقامی شخص کو وحشیوں کے جنگل سے بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ شخص جسے کروسو "مین فرائیڈے" کا نام دیتا ہے۔ اس کا خادم بن جاتا ہے۔ کروسو اسے رفتہ رفتہ مہذب بناتا ہے۔ اسی طرح کے کچھ اور واقعات پیش آتے ہیں۔ بالآخر ۲۸ برس گزرنے کے بعد ایک مرتبہ کروسو ایک برطانوی جہاز کو باغیوں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کے صلے میں اسے ۲۸ سال کے بعد اپنے خادم کے ہمراہ انگلستان واپسی کے سفر پر روانہ ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایک طویل مسافت کے بعد وہ بالآخر انگلستان پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اب اس کے لئے ہر چیز نئی اور اجنبی ہوتی ہے۔

اس کتاب سے ڈینیل ڈیفو کی انسان دوستی کا پتا چلتا ہے کیوں کہ اس میں انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کے علاوہ انسان اور حیوان، انسان اور نباتات غرض انسان اور اس کے اپنے ماحول کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا درس ملتا ہے۔

مغربی بچوں کی تیسری پسندیدہ ترین کتاب وہ ہے جو ایک ایسے شخص نے لکھی جو پادری ہونے کے

ساتھ ساتھ بچوں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ یہ شخص تھا چارلز لٹوتج ڈاجسن جس کا قلمی نام لولیس کیرل تھا۔ اور اس کی مشہور کتاب کا نام تھا "ایلس ان ونڈر لینڈ" یا "ایلس عالم عجائب میں"

یہ قصہ ایک ننھی سی پیاری سی لڑکی ایلس کے خواب کا ہے۔ جو ایک فرضی کردار ہے۔ جس میں وہ ایک ناقابل یقین دنیا کا سفر کرتی ہے اور انوکھے اور عجیب و غریب کرداروں سے ملتی ہے۔ ابتدا میں ایلس کو دریا کے کنارے اپنی بہن کے کاندھوں پر ایسی حالت میں نیند کے میٹھے میٹھے جھونکے لیتے ہوئے بتایا گیا ہے جس میں اس نے ایک خرگوش کو اپنے بل میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایلس نے خواب میں یہ منظر دیکھا ہے کہ بل میں جانے سے پہلے خرگوش صاحب جلدی جلدی اپنی گھڑی کی طرف نگاہ کرتے ہیں اور پھر جلدی جلدی بل میں اتر جاتے ہیں۔ ایلس بھی خواب میں خرگوش کے ساتھ اس زیر زمین دنیا کی سیر کو نکل پڑتی ہے۔

خرگوش کے تعاقب میں وہ ایک نہایت طویل کنویں کے ذریعے ایک بڑے سے کمرے میں جا گرتی ہیں جس کے آس پاس بند دروازے ہوتے ہیں۔ کمرے کے بیچ ایک میز پر ایک سنہری جالی ہے۔ جس سے یہ دروازے کھلتے ہیں۔ جالی کے قریب ہی ایک بوتل ہے جس پر لکھا ہے "مجھے پی لیجئے" ایلس اس بوتل کو پی لیتی ہے جس کے نتیجہ وہ بہت زیادہ سکڑ جاتی ہے اور نتیجتاً اسے چابی تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ میز کے نیچے ایک کیک رکھا ہوا ہوتا ہے جس پر لکھا ہوا ہوتا ہے "مجھے کھائیے" اس کو کھانے کے بعد ایلس بہت بڑی ہو جاتی ہے۔ یہ سکڑنے اور بڑھنے کے عمل کہانی میں باری باری ہوتے رہتے ہیں کہیں وہ چیشائیر بلی کے ساتھ گفتگو میں مصروف بتائی جاتی ہے۔ کہیں خرگوش کے گھر کا دورہ کرتے ہوئے کہیں نہایت معصومیت کے ساتھ اپنے آپ سے زور زور سے باتیں کرتے ہوئے اور کہیں اس چائے کی "دیوانی پارٹی" میں جہاں مختلف حیوانوں سے اس کی ملاقات اور بات چیت ہوتی ہے۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ بڑے والے کمرے کے باہر کی طرف ایک نہایت خوبصورت باغ میں وہ تاش کے پتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی گپیں لڑا رہی ہے۔ یہاں طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں اور عجیب و غریب کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ آخری منظر میں تاش کے بادشاہ پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور ایلس یہ کہہ کر محفل کو چھوڑ دیتی ہے کہ تم سب تاش کے پتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ بس یہیں پر اس کی آنکھ بھی کھل جاتی ہے اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

جیسی معصومیت اس کہانی میں ہے وہ شاید ہی کسی اور میں ہوگی۔ اس کے کردار آج بھی بہت مقبول ہیں جن میں ہمپٹی ڈمپٹی، ٹویڈلڈی، ٹویڈلڈم، وائٹ نائٹ وغیرہ شامل ہیں۔

نئے لکھنے والوں کی مختصر تحریروں کا مستقل سلسلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

ننھی نگارشات کی جگہ اب کم سن قلم کار نے لی ہے۔ آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔ (ادارہ)

دیکھ ہمیں اے پاک زمیں

ثانی اختر

عزم کریں ہم ایسا پکا پتھر بھی شرمائے
بول ہمارے ایسے میٹھے کان میں رس گھل جائے
علم ہمارا زیور ہے اسلاف یہ کہتے آئے
زر کو ہم نے ٹھوکر ماری علم سے ہاتھ ملائے
دھن کے پکے دل کے اچھے قول کے سچے ہیں

دیکھ ہمیں اے پاک زمیں ہم تیرے بچے ہیں
نفرت سے ہے نفرت ہم کو الفت عام کریں گے
دنیا ہم کو یاد کرے گی ایسا کام کریں گے
دشمن کی ساری چالوں کو ہم ناکام کریں گے
وقت پڑا تو لہو بھی اپنا تیرے نام کریں گے
دھن کے پکے، دل کے اچھے، قول کے سچے ہیں
دیکھ ہمیں اے پاک زمیں ہم تیرے بچے ہیں

دوزخ کی آگ بجھ گئی

صائمہ ناصر

"تمہیں معلوم ہے کہ عمر کے ابو رشوت لیتے ہیں؟" عمران نے تفریح کے وقفے کے بعد جماعت میں داخل ہوتے ہوئے احسن سے کہا۔

"ارے! نہیں! تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" احسن نے پوچھا۔

"یار! کل میرے ابو امی کو بتا رہے تھے، میں پاس ہی بیٹھا تھا" عمران نے جواب دیا۔

"اچھا مجھے تو معلوم نہیں تھا۔ ویسے مجھے تو بڑی حیرت ہوئی ہے۔ عمر تو نیک لڑکا ہی لگتا ہے۔" احسن نے کہا۔

"ارے چھوڑو۔ کیا عمر اور کیا اس کے ابو۔ کل کو دیکھنا وہ بھی اپنے باپ جیسا ہی ہو گا۔" عمران نے کہا۔

عمر نے اور احسن کی یہ تمام باتیں سن لیں۔ اسے بہت افسوس ہوا کہ اس کے ابو ایسا کرتے ہیں۔ ساتھ میں لوگوں کے سامنے اپنی ساکھ خراب ہو جانے کا دکھ بھی ہوا۔

اس روز عمر گھر واپس آیا تو بہت دکھی تھا۔ اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ اور جا کر بستر پر لیٹ گیا اور اسی بارے میں سوچتا رہا۔ رات کو وہ ٹھیک سے نہ سو سکا۔

عمر نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور اس کے والد سول انجینئر تھے۔

اس دن کے بعد وہ اپنے ابو سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ ابھی دو روز ہی گزرے تھے کہ اس نے

اسلامیات کی کتاب میں ایک حدیث پڑھی جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ "رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں دوزخی ہیں۔" اس حدیث کی تشریح ہمیشہ کی طرح اس کے استاد نے نہایت وضاحت سے کی اور راشی اور مرتشی دونوں کی اس قدر مذمت کہ اسے اپنے ابو سے نفرت سی ہونے لگی۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ وہ اپنے ابو کو اس بری حرکت سے روک کر رہے گا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا وہ کس طرح اپنے ابو کو منع کرے۔ کیونکہ آخر کو وہ اس کے والد تھے اور ان کا احترام کرنا اس کا اولین فرض تھا۔

وہ کافی دن تک اس بارے میں غور کرتا رہا۔ مگر اسے کوئی مناسب طریقہ نہ سوجھا۔ آخر ایک دن وہ اپنے اسلامیات کے استاد کے پاس گیا۔ اور دریافت کرنے لگا کہ "اگر کسی بچے کے والد راشی ہوں تو اسے کیا کرنا چاہئے؟"

"بیٹے! اسے چاہئے کہ وہ اس بات کی فکر چھوڑ دے اور خود بڑا ہو کر ایسے راستے سے دور رہے یا اگر اسے یہ بات سخت بری لگتی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اشاروں کنائیوں میں سے یہ بات واضح کر دے تاکہ اس کے والد پر واضح ہو جائے کہ یہ سخت بری عادت ہے"۔

آخر عمر نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ کافی سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔

عمر نے تقریباً ایک ہفتے کی محنت کے بعد ایک مضمون لکھا۔ جس میں رشوت لینے والے اور دینے والے کی خوب مذمت کی گئی تھی۔ اس نے مضمون میں اچھی طرح واضح کر دیا کہ رشوت لینا کیوں بُرا ہے۔ ؟اس سے معاشرے میں کیا غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اور اس سے رشوت لینے والے کی اپنی زندگی کس طرح متاثر ہوتی ہے۔

اس نے ان تمام باتوں کو نہایت عمدہ طریقے سے بیان کیا۔ اور اپنے ابو کے پاس لے گیا۔

"ابو! سر نے ایک مضمون لکھنے کو دیا تھا۔ میں نے لکھا ہے آپ بتائیں اس میں کوئی غلطی تو نہیں ہے؟"

اس کے ابو نے مضمون پڑھنا شروع کیا۔ عمر دل ہی دل میں یہ دعا مانگتا جارہا تھا کہ "اے خدا! میری محنت رائیگاں نہ جائے یااللہ! میرے ابو صراطِ مستقیم پر آجائیں"۔

اللہ تعالیٰ کو اس ننھے سے پریشان دل پر ترس آگیا اور عمر کی دعا عرش بریں پر پہنچی۔ عمر کے ابو مضمون پڑھتے گئے اور ان کے دل کی دنیا بدلتی گئی۔ عمر کے ابو عمر کا اشارہ سمجھ گئے۔ کیونکہ وہ پہلے کبھی کوئی مضمون ان کو دکھانے نہ لایا تھا۔ انہوں نے مضمون ختم کیا تو ان کا جسم لرز رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ان کا ہاتھ اپنی قمیص کی جیب میں رینگ گیا۔ ان کی جیب میں رشوت کے دو ہزار روپے موجود تھے۔

انہوں نے تیزی کے ساتھ وہ روپے باہر نکالے اور پھاڑ کر پھینک دیئے۔ اور اس سے بھی زیادہ تیزی سے عمر کو گلے لگالیا۔

اگلے روز عمر اسکول پہنچا تو عمران اور احسن کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک کھلی کھلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ عمران اور احسن اس کی مسکراہٹ کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے گزر گئے۔

بچے کیا ہیں؟

مرسلہ:فاخرہ خانم

یہ سوال بڑا ٹیڑھا ہے کہ۔بچے کیا ہیں؟ آیئے دیکھتے ہیں کہ مختلف لوگوں کے پاس اس سوال کے کیا کیا جواب موجود ہیں۔

ماں نے کہا:۔

"بچے پھول ہیں جو طرح طرح کی خوشبوؤں اور دیدہ زیب رنگوں میں دنیا کے ہر باغ میں موجود ہیں۔"

ادیب نے کہا:۔

"بچے ایک کتاب کی مانند ہیں جس کو جتنا پڑھو اتنا ہی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔"

شاعر نے کہا:۔

"بچے پیار، محبت، معصومیت اور پاکیزگی کا حسین امتزاج ہیں۔"

طبیب نے کہا:۔

"بچے ایک ایسی دوا کی حیثیت رکھتے ہیں جو دل و دماغ کو سکون اور خوشی پہنچاتے ہیں، جو صحت کے لئے ضروری ہے۔"

درزی نے کہا :۔

"بچے ایک بغیر سلے کپڑے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تراش خراش میں جتنی زیادہ محنت کی جائے گی وہ اتنے ہی زیادہ دیدہ زیب بنیں گے۔"

کمہار نے کہا :۔

"بچہ چکنی مٹی کی مانند ہے جس کو جس سانچے میں ڈھالنا چاہو نرمی اور محبت سے ڈھال لو اور سچائی کی دھیمی دھیمی آنچ پر پکاؤ تاکہ وہ ایک مضبوط انسان بنے اور کوئی طاقت اسے توڑ نہ سکے۔"

مصوّر نے کہا :۔

"بچے ایک ایسی تصویر کی طرح ہیں جس میں جتنا زیادہ اور خوبصورت، دیدہ زیب رنگوں کا ملاپ کیا جائے وہ اتنی ہی خوبصورت نظر آئے گی۔"

لوہار نے کہا :۔

"لوہے کی سخت سے سخت چیز تو پگھل کر دوسری شے میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ لیکن بچوں کی بچپن کی تربیت آگے چل کر لوہے سے بھی زیادہ سخت ہوجاتی ہے۔ چنانچہ بچے کو اس انداز سے تربیت دینی چاہئے کہ وہ دنیا کی کسی بھی طاقت سے نہ پگھل سکے، اگر پگھلے تو مصیبت میں گرفتار کسی شخص کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر۔"

بڑھئی نے کہا :۔

"کسی بھی درخت کو مختلف پہلوؤں سے کاٹ کر میز بنانا اتنا مشکل نہیں جتنا کسی بچے کو مختلف پہلوؤں سے ترتیب دے کر مکمل انسان بنانا مشکل ہے۔"

کسی بزرگ نے بچے کی معصومیت دیکھ کر کہا :۔

"ایک دفعہ میں نے کسی بچے سے کہا اگر میں تمہیں ایک لاکھ روپے دوں تو تم کیا خریدو گے بچّے نے معصومیت سے جواب دیا "غبارہ"۔"

تعریف کے قابل

(۱) تعریف کے قابل وہ ہے، جس کا شیوہ خدمتِ خلق ہے۔

(۲) تعریف کے قابل ہے وہ، جو دوست کے مشکل وقت میں اس کی مدد کرتا ہے۔

(۳) تعریف کے قابل ہے وہ، جو والدین کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

(۴) تعریف کے قابل ہے وہ، جو اپنے مسلمان بھائی کی برائیوں پر پردہ ڈالتا ہے۔

(۵) تعریف کے قابل ہے وہ، جو مسافر کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

(۶) تعریف کے قابل ہے وہ، جو اپنی پریشانیوں پر صبر کر کے اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

(۷) تعریف کے قابل ہے وہ، جس کو آخرت کی فکر ہے۔

مرسلہ...... ذیشان یوسفانی
میرپور خاص

تبدیلی

طاہر لیل

شیخ سعدی شیراز میں پیدا ہوئے۔ ابھی بچے تھے اور نیک کام کیا کرتے تھے۔ بڑے ادب سے بولتے بڑوں کی عزت کرتے اپنے سے چھوٹے بچوں سے محبت اور پیار سے پیش آتے۔ ماں نے انہیں عقل مند دیکھ کر ایک مسجد میں قرآن شریف پڑھنے کو بھیجا لیکن ان کا دل نہ لگا اور تنگ آکر گھر سے بھاگ نکلے۔ ایک دن ایک کنویں پر سے پانی پینے لگے۔ وہاں دیکھا کہ پتھر کے ٹکڑوں میں گڑھے پڑ گئے ہیں عورتوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ پانی بھرنے والے گھڑے رکھنے اور اٹھانے سے پتھر گھس گیا ہے۔ دل میں سوچا کہ میرا دل گوشت کا بنا ہے۔ یہ اتنا سخت پتھر گھس گیا ہے اگر میں ایک ایک لفظ یاد کرتا رہتا تو میرے دل پر بھی علم بہت اثر کر چکا ہوتا اور میں عالم کہلاتا۔ آخر شیخ سعدی کو شوق پیدا ہوا۔ اور بغداد میں علم حاصل کیا۔ بڑے عالم، فاضل، عابد بن گئے۔ جب وطن کو لوٹے تو دوست دشمن انہیں حضرت شیخ سعدیؒ کہنے لگے۔

دوسری کوشش

صبا زہرا...... کراچی

سب لوگ ہماری باجی کی تعریف اکثر کیا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بہت اچھے کھانے پکاتی تھیں۔ جب وہ باجی کی تعریف کرتے تھے تو ہمارا دل خون کے آٹھ، آٹھ آنسوں روتا۔ ہم سب سے کہتے کہ اس میں باجی کا کیا کمال، وہ تو ترکیبیں دیکھ کر پکاتی ہیں۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز بھلا کون سنتا۔

ایک دن امی اور باجی بازار گئیں ہم نے سوچا کیوں نہ کچھ بنائیں باجی کی کتابیں نکال کر گلاب جامن بنانے کا فیصلہ کیا اور سامان نکالے بغیر گلاب جامن بنانے لگے۔ جلدی جلدی پڑھتے اور بناتے جاتے اچانک کال بیل بجی۔ ہم نے سوچا امی آگئیں۔ مگر دودھ والا آیا تھا ہم نے دودھ لیا اور دوبارہ بنانے لگے۔ امی آگئیں رات کے کھانے کے بعد ہم نے سب کے سامنے وہ گلاب جامنیں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور گلاب جامنیں چھپا کر رکھ دیں۔ رات کو جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو ہم نے اپنی گلاب جامنیں سب کے سامنے رکھیں۔ سب شکل دیکھ کر ہی تعریف کر رہے تھے اور ہم تعریفوں کے سحر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ امی کی آواز سنائی دی۔ وہ بیسن کی طرف دوڑیں اور دوسروں نے بھی گلاب جامن چکھ کر بیسن کا رخ کیا۔ ہم نے چکھیں تو ہم نے بھی یہی عمل اختیار کیا۔ بعد میں

معلوم ہوا کہ گلاب جامنوں میں ہم نے نمک اور گرم مصالحہ ڈال دیا تھا کیونکہ جب ہم گلاب جامن بنا رہے تھے تو کال بیل بجی تھی اور ہم دودھ لے کر واپس آئے تو گلاب جامن بنانے کی ترکیب والا کتاب کے صفحے پلٹ گئے تھے اور ہم نے قورمے کی ترکیب آزمائی تھی ہمیں یہ تک پتہ نہ تھا کہ نمک اور گرم مصالحہ گلاب جامنوں میں نہیں ڈلتا۔ سب سے ڈانٹ پڑی اور ہم روتے ہوئے اپنے کمرے میں دوڑے۔ باجی نے ہمیں چپ کرایا اور کہا کہ تم کسی دن میرے ساتھ مل کر گلاب جامن بنا لینا۔

ایک دن ہم نے باجی کے ساتھ گلاب جامن بنائی جب سب کے سامنے رکھی تو پہلے سب نے کہا کہ تم نے جو پہلی "گرم مصالحہ گلاب جامن" بنائی تھی اس کا ذائقہ ابھی تک نہیں بھولا۔ بڑی مشکل سے سب نے چکی تو واقعی ہماری تعریف کی۔

اگر انسان کسی کام میں پہلی مرتبہ کامیاب نہ ہو تو دل نہ ہارے۔ کیونکہ ناکامی، کامیابی کا زینہ ہے۔ کوشش اور دوبارہ کوشش سے ہم یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں۔

بال دار لڑکا

مرسلہ: حسن رشید صدیقی

یوی چن ہوان نامی بچہ چین کے صوبے لیاؤ نینگ کی شیویان کاونٹی میں پیدا ہوا تھا۔ پیدائش کے وقت اس کا سارا جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ بچے کے جسم پر بالوں کا زیادہ ہونا پرکھوں کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے اب اس لڑکے کی عمر ۹ سال ہے۔ یوی چن نے حال ہی میں نان ہائی سینماٹک کارپوریشن کی تیار کردہ فیچر فلم خانہ بدوش اور بال دار لڑکا میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

پیٹو خان

مرسلہ:۔ محمد علی خان بہاولپور

حلوا، پوری، چھولے، نان
مرغ پراٹھے اور پکوان
پل میں صاف ہے دستر خوان
کھانا ہے بس ان کی جان
یہ ہیں بھیا پیٹو خان

دہی بڑے، آلو کی چاٹ
کھا جاتے ہیں لاٹ کے لاٹ
پیٹ ہے یا چکی کا پاٹ
معدہ ہے یا کوئی دکان
یہ ہیں بھیا پیٹو خان

کھانے کے فن میں چالاک
چندیا پر ہے ڈھیروں خاک
آنکھیں چھوٹی پچکی ناک
بالکل ہیں میڈ ان جاپان
یہ ہیں بھیا پیٹو خان

مسلمان بچے

مرسلہ : محمد ظفر اللہ ضیاء

(۱) ..... بچوں میں سب سے پہلے کس نے اسلام قبول کیا۔ ؟

(۲) ..... ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں پیدا ہونے والے پہلے بچے کا نام کیا تھا۔ ؟

(۳) ..... آنحضرتؐ نے کس صحابی بچے کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔ ؟

(۴) ..... غزوہ بدر کے سب سے کمسن شہید کا نام بتایئے ؟

(۵) ..... آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کن دو بچوں کے متعلق فرمایا تھا کہ "یہ دونوں بچے دنیا میں میری خوشبو ہیں ؟"

(۶) ..... ابوجہل کو کن دو بچوں نے قتل کیا تھا۔ ؟

جوابات

(۱) ..... حضرت علیؓ (۲) ..... حضرت نعمان بن بشیرؓ (۳) ..... حضرت زیدؓ بن حارث (۴) ..... حضرت عمرؓ بن ابی دقاص

(۵) ..... حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ

(۶) ..... معوذؓ اور معاذؓ۔

حضورؐ اور بچے

امجد حسین ثانی

حضورؐ بچوں پر بہت زیادہ شفقت فرمایا کرتے تھے۔ آپ انکے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ اور ان کے حق میں دعائے خیر فرمایا کرتے۔ بچے قریب آتے تو آپ انہیں گود میں اُٹھا لیتے بڑی محبت سے آپ انہیں کھلاتے۔ کسی بچے کے سامنے آپؐ اپنی زبان مبارک نکال دیتے۔ بچہ خوش ہوتا اور بہلتا۔ کبھی آپ آرام فرما رہے ہوتے اور کوئی بچہ آنکلتا تو آپ لیٹے لیٹے اپنے قدموں کے اندر کے تلوؤں پر بچوں کو بٹھالیا کرتے۔ اور اسے جھلا جھلا کر خوش کرتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بچہ کو اپنے سینہ اطہر پر بٹھا لیتے اور محفوظ کرتے جب آپؐ بچوں کے قریب سے گزرتے تو اپنی عادت کے تحت ان کو خود السلام علیکم کہتے بچوں کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے۔ اگر آپؐ کسی سواری پر تشریف فرما ہوتے اور راستے میں بچے مل جاتے تو ان کو نہایت شفقت کے ساتھ سواری پر آگے یا پیچھے بٹھا لیتے۔ بچوں کو خوش کرنے کی خاطر کبھی کھانے کی چیزیں بھی پیش کرتے کبھی کھجوریں اور کبھی تازہ پھل اور کبھی کوئی اور کھانے یا کھیلنے کی چیز۔

آپؐ کسی کی ماں کو دیکھتے کہ اپنے بچے سے پیار کر رہی ہے۔ تو بہت متاثر ہوتے۔ کبھی ماؤں کی بچوں سے محبت کا ذکر آتا تو فرماتے۔ اللہ تعالیٰ جس شخص کو اولاد دے۔ اور وہ اس سے محبت کرے۔ اور ان کا حق بجالائے۔ تو وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

نماز کے اوقات میں کسی مقتدی عورت کے بچے کے رونے کی آواز آپ کے مبارک کانوں تک پہنچ جاتی تو آپ نماز ہی مختصر کر دیتے۔ تاکہ بچے کی ماں بے چین نہ ہو۔

آنحضرتؐ نے بچوں پر زیادہ سے زیادہ شفقت برتنے اور ان سے محبت کرنے کے لئے بھی تلقین فرمائی کہ حق تعالیٰ چھوٹے چھوٹے معصوموں اور گھر کے مزدوروں کی وجہ سے زیادہ رحمت فرماتے ہیں آپؐ کا

ارشاد ہے۔

"جس گھر میں بچے نہیں اس گھر میں برکت نہیں۔"

ایک اور ارشاد نبویؐ کا مفہوم ہے تمہیں تمہارے معصوموں اور کمزوروں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے۔ آپؐ کا ایک اور بہت سبق آموز ارشاد ہے۔ کہ۔

"جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔"

اغوا

محمود طاہر...... گوجرانوالہ

گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ تھی۔ سڑکیں آگ کی طرح گرم تھیں۔ ان دنوں ہمارے علاقے میں اغوا بہت ہو رہے تھے اس لئے امی نے مجھے باہر نکلنے سے منع کیا تھا مگر میں گھر والوں کی نظروں سے بچتا ہوا باہر نکل آیا اور سڑک پر کریانے کی دکان سے بوتل پی اور پھر واپس گھر جانے لگا گھر سے کچھ دور گلی میں میں نے دیکھا کہ دو آدمی چلے آرہے ہیں ان میں سے ایک کے کاندھے پر بوری تھی میری جاسوسی کی رگ بیدار ہوگئی۔ میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں نے بوری کو دیکھا اس میں تھوڑی تھوڑی حرکت ہو رہی تھی۔ میرا شک یقین میں بدل گیا بیس منٹ بعد وہ ایک دروازے کے سامنے رک گئے جس میں تالا لگا ہوا تھا انہوں نے ادھر ادھر دیکھا میں جلدی سے ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گیا گلی سنسان

تھی ان میں سے ایک نے دروزاہ کھولا اور پھر دونوں اندر چلے گئے۔

میں نے کچھ دیر سوچا کہ مجھے اندر جانا چاہئے کہ نہیں۔ ؟ آخر میں نے اللہ کا نام لیا اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگیا۔

ایک کمرے سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی میں نے دروازے کے سوراخ سے دیکھا دونوں ایک چارپائی پر بیٹھے تھے اور بوری دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھی جس کا منہ بند تھا ایک آدمی بولا "یار مال اچھا اور سستا مل گیا ہے۔ کل سے یہ ہمارے لئے کمائے گا اور ہم عیش کریں گے ہا ہا ہا"...................... دونوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا - میرا دل کانپ گیا! یہ لوگ تو بچوں کو اغوا کر کے ان سے بھیک منگواتے ہیں! میں نے سوچا!

میں وہاں سے بھاگا اور پولیس اسٹیشن گیا۔ وہاں کا انسپکٹر میرے ابو کا دوست تھا میں نے تمام حالات انسپکٹر کو سنا دیئے انہوں نے چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور ہم جیپ میں بیٹھ کر مطلوبہ ٹھکانے پر پہنچ گئے جب ہم اندر داخل ہوئے تو پولیس کو دیکھ کر دونوں کا رنگ اڑ گیا ان میں سے ایک نے جرأت کرتے ہوئے پوچھا "انسپکٹر صاحب! ہم نے کیا جرم کیا ہے، ہم تو غریب آدمی ہیں۔"

"وہ تو تم شکل سے ہی دکھائی دیتے ہو۔" انسپکٹر نے کہا۔" بولو بچہ کہاں ہے۔"؟ "کونسا بچہ۔ ؟" دوسرے نے جواب دیا واہ چوری اور اوپر سے سینہ زوری انسپکٹر نے کہا میں نے بوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا انکل! وہ اس میں ہے۔" انسپکٹر نے بوری کی طرف دیکھا جس میں اب بھی حرکت ہو رہی تھی انسپکٹر نے آگے بڑھ کر بوری الٹ دی مگر یہ کیا بوری سے بچے کی بجائے بندر نکلا سپاہیوں نے ہنسنا شروع کر دیا "انسپکٹر نے میری طرف گھور کر دیکھا میں نے ہکلاتے ہوئے کہا م.......... مگر.......... یہ.......... تت.......... تو کہہ رہے تھے کہ مال اچھا ہے اور اب ہم عیش کریں گے ان دونوں میں سے ایک آدمی نے کہا ہم نے یہ بندر سستا خریدا ہے اور اب یہ ہمارے لئے کمائے گا اور ہم عیش کریں گے اس لئے میں نے ایسا کہا تھا انسپکٹر صاحب نے دونوں سے معذرت کی اور ہم واپس آگئے۔

شام کو جب انسپکٹر میرے ابو سے ملنے آئے تو انہوں نے یہ قصہ سنایا۔
جسے سن کر سب بہت ہنسے اور میں بہت شرمندہ ہوا اور آئندہ بغیر ٹھوس ثبوت کے رائے قائم کرنے سے توبہ کرلی۔

انمول موتی

ایم فاروق اعوان۔ بکرا پیڑی، کراچی

۱۔ دنیا میں سچا پیار اور سچی محبت صرف خدا سے کرو یقیناً تمہیں راحت اور سکون ملے گا۔
۲۔ زیادہ قسمیں کھانے والا جھوٹا ہوتا ہے۔
۳۔ اگر آنکھیں روشن ہیں تو ہر روز روزِ محشر ہے۔

پیارے پیارے بچو

عذرا ناز۔ کراچی

اے پیارے پیارے بچو!
اے اچھے اچھے بچو!
اے ننھے منے تارو
ماں باپ کے دلارو
رونق ہو تم وطن کی
خوشبو ہو تم چمن کی
تم سے وطن کی عظمت
تم سے وطن کی شوکت
تم دولتِ وطن ہو
تم زینتِ چمن ہو
تم دل لگا کے پڑھنا
محنت سے آگے بڑھنا
اے پیارے پیارے بچو!
اے اچھے اچھے بچو!

نیا سال

مرسلہ ...... رفعت جبیں قریشی

گھڑی آگئی ہے نئے سال کی
خوشی چھاگئی ہے نئے سال کی
مبارک ہو آنا نئے سال کا
الاپیں ترانہ نئے سال کا
بڑے شوق سے علم حاصل کرو
طبیعت کتابوں پہ مائل کرو
جہالت کا مٹ جائے نام و نشان
کریں مل کے یہ کام خورد و کلاں
بڑھو نیک کاموں کی جانب سدا
کرے گا خدا کام یابی عطا
محبت کی شمعیں جلاتے رہو
کدورت دلوں سے مٹاتے رہو
ہمیشہ پڑوسی کا رکھو خیال
نہ پہنچے کوئی تم سے اس کو ملال
برائی کا دامن نہ پکڑو کبھی
خدا کی زمین پر نہ اکڑو کبھی
وطن کی محبت دلوں میں رہے
سرور اور کیا اس سے بڑھ کر کہے

کون کیا تھا؟

محمد زبیر ربانی

۱...... محمد علی جناح : - پاکستان کے بانی، عام تاجر کے فرزند تھے۔

۲...... ابرہام لنکن : - امریکہ کے صدر، غریب کسان کے بیٹے تھے۔

۳...... جانسن : - امریکہ کے سابق صدر، بچپن میں بوٹ پالش کرتے تھے۔

۴...... آئزن ہاور : - امریکہ کے صدر، اخبار فروش تھے۔

۵...... کولمبس : - امریکہ کو دریافت کرنے والا، ایک جولاہے کا بیٹا تھا۔

۶...... اتاترک کمال پاشا : - بابائے ترک، ایک معمولی کلرک تھا۔

۷...... سقراط : - ایک عظیم فلسفی، معمار کا بیٹا تھا۔

۸...... ہٹلر : - جرمن کا ڈکٹیٹر، ایک موچی کا لڑکا تھا۔

۹...... ایڈیسن : - گراموفون کا موجد، ایک اخبار فروش تھا۔

۱۰...... نپولین : - فرانس کا حکمران، ایک معمولی سپاہی تھا۔

۱۱...... نادر شاہ : - مشہور ایرانی بادشاہ، ایک غریب گڈریئے کا بیٹا تھا۔

روشن مثال

The Pick of The month

ان ساتھیوں کا تعارف

جنھوں نے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو

شازیہ غفار

پہلی تا ساتویں اوّل پوزیشن۔

۱۴ سال، ہشتم، رسالے پڑھنا
اچھی فلمیں دیکھ[illegible]ش، حساب،
۲۲[illegible] واٹر ماڈل کالونی
پن نمبر ۲۷۔

امیر عبداللہ ملک

چھٹی تا آٹھویں اوّل، میٹرک میں اے گریڈ۔

۱۶ سال، سی کام، انگلش۔
بچّوں کے رسائل کا مطالعہ، قلمی
دوستی کرنا۔ ضلع میانوالی گاؤں
ولہ خیل محلّہ دریا خیل۔

محمد ارشد الہدیٰ

میٹرک میں اے گریڈ، مقابلہ کوئز میں [illegible]

۱۸ سال، مطالعہ کرنا، کوئز
حساب۔
کوارٹر نمبر ۱۰۸۔ قصبہ کالونی
منگھوپیر روڈ کراچی۔

عبدالرحیم

میٹرک میں اے گریڈ۔

۱۶ رسال، گیارہویں، اسلامیات
قلمی دوستی کرنا، آنکھ مچولی پڑھنا
عبدالرحیم ولد عبدالغفار
ناگوری فلور مل جھڈو (سندھ)

احمد علی مغل

میٹرک میں اے گریڈ۔

۱۵ رسال، دسویں، ورزش کرنا
کہانی لکھنا، انگلش۔
ہاؤس نمبر ۳۶۱/سی قاسم آباد
فیز نمبر ۱ حیدرآباد (سندھ)

عبداللطیف

میٹرک میں اے گریڈ۔

۱۶ رسال، گیارہویں، مطالعہ کرنا
کرکٹ کھیلنا، فزکس۔
محمد صدیق ٹیلر ماسٹر مکان ۹۰۱
سیکٹر الیف/۷ اورنگی ٹاؤن
شاہ فیصل محلہ کراچی نمبر ۴۱۔

سید عامر رضا

میٹرک میں فرسٹ ڈویژن۔

۱۸ رسال، انٹر کامرس، اردو
اسلامیات، ٹکٹ جمع کرنا، کرکٹ
کھیلنا، ناول۔ ۶۳/۱۶ اے
ایف بی ایریا۔ بلاک نمبر ۱۶، کراچی ۳۸

صائمہ سراج

نرسری سے چہارم تک نمایاں پوزیشن۔

۱۰ رسال، پنجم، تاریخی کتب کا
مطالعہ، ڈرائنگ کرنا، اسلامیات
مکان نمبر ۹۲۳۸/۱۴ این ای گلی
نمبر ۲۲، چاہ سلطان، راولپنڈی

محمد عاطف حق

کے جی ٹو میں دوسری پوزیشن۔

۸ رسال، دوئم، حساب، کرکٹ
فٹ بال اور ہاکی کھیلنا۔
ایل ۵۲ بلاک ۱۵۔ گلشن مصطفےٰ
فیڈرل بی ایریا، کراچی نمبر ۳۸۔

آپ کی تصویر اس فریم
کے سائز میں کٹی ہوئی
ہونی چاہیئے۔ چھوٹی یا
بڑی تصویر قابلِ قبول
نہ ہوگی

عبدالعزیز بگھیو

ہاکی میں سرٹیفکیٹ۔

۱۵ رسال، گیارہویں، ہاکی کھیلنا
ڈائجسٹ پڑھنا۔
غزالی ہاؤس روم نمبر ۶، پبلک
اسکول حیدرآباد، لطیف آباد نمبر ۲۔

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ——— سبزیوں سے جی نہ چرائیے

- ★ ——— سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں
- ★ ——— سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے
- ★ ——— سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں

یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ھضم کو متاثر نہیں کرتا۔

- ★ ——— سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں
- ★ ——— سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے　　سبزیاں شوق سے کھائیے　　ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبودِ اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جابجا
کوپن پھاڑنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے
تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام ــــــــــــ کلاس ــــــــــــ عمر ــــــــــــ

ارسال کردہ کل رقم ــــــــــــ بذریعہ ــــــــــــ دستخط ــــــــــــ

پتا ــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

ــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

روشن مثال میں شرکت کا کوپن

نام ــــــــــــ عمر ــــــــــــ جماعت ــــــــــــ

مشاغل ــــــــــــ پسندیدہ مضمون ــــــــــــ

کوئی اہم کامیابی ــــــــــــ

پتہ ــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

کیاآپ نے بھی کوئی روشن مثال قائم کی ہے ؟

اس تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک ہو سکیں گے جنہوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام، کوئی اور کارنامہ ......

○ ...... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہو سکے گا۔

○ ...... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہو سکے گی۔

یاد رہے ! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو(BESTOFMONTH)کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تاکہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جاسکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء وطالبات اس میں شریک ہو سکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے جو صفحہ نمبر ۱۲۵ پر موجود ہے۔

امّی ابّو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

خالد اسماعیل

کیا آپ

- ○ .... اپنے بچے کے لئے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالتے ہیں؟
- ○ .... اس سے گپ شپ کے انداز میں یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسکول اور محلے میں اس کے دوست کیسے ہیں؟ اور اس کا زیادہ تر وقت کن مشغلوں میں گزرتا ہے؟
- ○ .... اپنے بچے کو درسی کتب کے علاوہ دیگر مفید کتابوں کے مطالعے کی ترغیب دیتے ہیں؟ مثلاً آپ نے کبھی اپنے بچے کو کوئی اچھی سی کتاب تحفے میں دی ہے؟
- ○ .... بچے میں نظم و ضبط پیدا کرنے کے لئے خود نظم و ضبط کی پابندی کرتے ہیں۔
- ○ .... اپنے بچے کی توجہ محبت اور شائستگی سے عبادات کی جانب دلاتے ہیں۔ یا خود اپنے ہمراہ اسے مسجد لے جاتے ہیں۔
- ○ .... اپنے بچے کی ذہنی اور جذباتی صحت کے لئے گھر کے ماحول کو پُرسکون رکھتے ہیں۔
- ○ .... گھر کے سب لوگوں کے ساتھ پکنک یا سیر و تفریح کے لئے جاتے ہیں؟
- ○ .... اپنے بچے کے دوستوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آتے ہیں؟
- ○ .... اپنے بچے کو جیب خرچ دیتے ہیں؟
- ○ .... اس کی باتوں کو سنجیدگی سے سنتے ہیں؟ اور اسے اہمیت دیتے ہیں؟
- ○ .... اپنے بچے کو دوسرے بچوں کے سامنے نظر انداز تو نہیں کرتے؟
- ○ .... اپنے بچے کی ناپسندیدہ عادات کے بارے میں یہ خیال تو نہیں کرتے کہ آہستہ آہستہ یہ خود دور ہو جائیں گی۔
- ○ .... جب کوئی آپ کے بچے کی شکایت کرتا ہے تو آپ شکایت کرنے والے پر بگڑنے لگتے ہیں؟
- ○ .... اپنے بچے کے لباس اور ظاہری وضع قطع پر توجہ دیتے ہیں؟

اگر ان میں سے بیشتر سوالوں کے جوابات نفی میں ہیں تو پھر آپ کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے کہ کیا آپ واقعی اپنے بچے کے خیر خواہ ہیں؟

Crystal

آیاکرسٹل زوپیک
سجائیں بھی ہم - مٹائیں بھی ہم - کھیلیں بھی ہم
آیاکرسٹل زوپیک
یہ ہاتھی میرا ساتھی - یہ بطخ ، یہ ہرن اور وہ بِلی
کرسٹل زوپیک میں مُفت ملی

کرسٹل

زُوپیک خریدیں - خوبصورت جانور مُفت حاصل کریں

کرسٹل زوپیک ۔ کرسٹل ٹوتھ پیسٹ کے گرین جل اور وائٹ (دونوں ذائقوں) کے ۸۰ گرام والے لارج سائز کے ہر پیکٹ میں ایک عدد خوبصورت جانور بند ہے ۔ ٹوتھ پیسٹ خریدیں اور خوبصورت جانور کا تحفہ مُفت حاصل کریں ۔

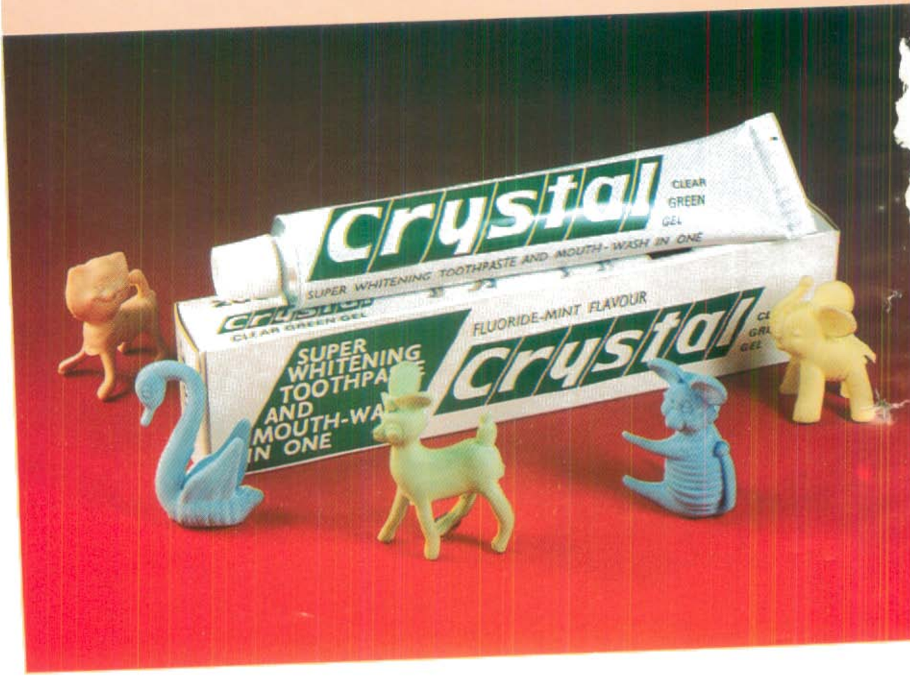

REGD. NO. M—266

JANUARY 1991

MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI